لسانیات کے بنیادی مباحث

رؤف پاریکھ

لسانیات کے بنیادی مباحث

رؤف پاریکھ

Naveed Square. Urdu Bazar. Karachi
Ph # 021-32762483
E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com
City Book Point

باذوق لوگوں کے لیے خوب صورت معیاری کتاب

بنیاد

HASSAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیش نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

کتاب : لسانیات کے بنیادی مباحث

مصنف : رؤف پاریکھ

تعداد : 500

سن اشاعت : 2021ء

قیمت : 500 روپے

انتساب

سلمیٰ کے نام

فہرستِ ابواب

☆......☆......☆

فہرستِ ابواب مع ذیلی عنوانات

☆......☆......☆

معروضات

لسانیات کے موضوع پر اس طالب علم کی یہ طالب علمانہ جسارت طالب علموں ہی کے لیے ہے۔ طالب علمانہ یوں کہ مجھ جیسے طالب علم کو اپنی محدودات کا احساس ہونا چاہیے اور دوسرے یہ کہ اس کتاب میں یہ امر مدِ نظر رہا کہ لسانیات کے موضوعات و مباحث آسان زبان میں، اردو کی مثالوں کی مدد سے اور وضاحت کے ساتھ بیان کیے جائیں تا کہ طالب علم لسانیات سے بھاگنے کی بجائے اس دل چسپ علم کی تفہیم کے ذریعے اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کو بھی سمجھیں اور ہو سکے تو ان پر تحقیقی کام بھی کریں۔

یہ لسانیات کی ابتدائی درسی کتاب ہے۔ اسی لیے اس کے مباحث بیش تر ابتدائی اور تعارفی نوعیت کے ہیں اور لسانیات کے پیچیدہ مسائل یا ماہرین کی اختلافی آرا کو حسبِ ضرورت مختصراً اور آسان انداز میں بیان کیا گیا ہے البتہ تحقیقِ مزید کے لیے حواشی میں مآخذ کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ اس کتاب کی تسوید میں یقیناً انگریزی مصادر و منابع سے بہت زیادہ مدد لی گئی ہے جن کے بار بار حوالے دیے گئے ہیں۔ اردو، دیگر پاکستانی زبانوں اور پاکستان کی مثالیں دے کر اس علم کا اطلاق ہمارے معاشرے پر کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے اور جہاں جہاں اردو یا دیگر پاکستانی زبانوں سے متعلق بات کی گئی ہے وہاں بھی متعلقہ مآخذ کے حوالے دے دیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں کچھ غلط فہمیاں بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً ہمارے بعض لکھنے والے بالخصوص قواعد نویس آواز، حرف، لفظ اور صوتیے (یعنی فونیم) (phoneme) میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اسی طرح ہماری پاکستانی زبانوں پر لکھنے والے اکثر ڈائیلکٹ (dialect) کو

لہجہ کہتے ہیں حالانکہ لہجہ تو accent کا مترادف ہے۔ بعض لوگ حروفِ تہجی (الف۔و۔ی) کو صوتیہ سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں کہ اردو میں تین ہی مصوتے یا واول (vowel) ہیں۔ ان معاملات کی درستی اور وضاحت آپ کو اس کتاب میں متعلقہ ابواب میں ملے گی۔

لسانیات کے کچھ جدید نظریات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ فہرستِ ابواب کے ساتھ عنوانات کی تفصیلی فہرست بھی الگ سے دی گئی ہے تاکہ مطلوبہ مواد تک رسائی فوری اور آسان ہو سکے۔ بنیادی مقصد اعلیٰ مدارج کے طالب علموں کے لیے لسانیات پر اردو میں ایک آسان اور جامع کتاب پیش کرنا ہے۔

علمی و تحقیقی کاموں میں حوالوں کا اندراج ناگزیر ہوتا ہے لیکن ہمارے بعض طالب علم یا تو حوالوں کی اہمیت کو سمجھتے نہیں ہیں یا کاہلی کے سبب حوالے نہیں دیتے۔ ایک کتاب سے دس جملے لیتے ہیں اور اس کا ایک بار حوالہ دے کر سمجھتے ہیں کہ یہ کافی ہے۔ اس کتاب میں بعض اوقات حوالے زیادہ نظر آئیں گے اور حواشی میں ''ایضاً'' کی تکرار بھی ملے گی جس کا سبب یہ ہے کہ یہ جدید تحقیقی طریقِ کار کے عین مطابق ہے، بصورتِ دیگر اسے سرقے (plagiarism) کا ارتکاب سمجھا جاتا۔

حوالے ہر باب کے آخر میں دیے گئے ہیں۔ کئی کتب کا اسی باب یا اگلے ابواب میں بھی بار بار حوالہ آیا ہے لیکن ہر بار اور ہر باب میں طباعتی تفصیلات (ناشر، مقامِ اشاعت و سالِ اشاعت وغیرہ) دینے کی بجائے ہر باب میں پہلی بار حوالہ آنے پر مصنف اور کتاب کے نام کے ساتھ مکمل طباعتی تفصیلات حواشی میں دی گئی ہیں لیکن بعد ازاں اسی کتاب کا حوالہ اسی باب میں آنے پر حواشی میں مصنف اور کتاب کے نام کے ساتھ ''محولہٗ بالا'' لکھا گیا ہے اور اس باب میں طباعتی تفصیلات دہرائی نہیں گئی ہیں۔ لیکن فہرستِ مآخذ میں یہ تفصیلات موجود ہیں۔

مختلف انداز میں حوالہ آنے پر حوالے کی نوعیت کے لحاظ سے مصنف یا کتاب میں سے کسی ایک کا نام حواشی میں درج کر کے صفحے/صفحات کا ہندسہ لکھا گیا۔ مثال کے طور پر اگر متن میں لکھا ہے کہ ''عبدالسلام لکھتے ہیں ـــ'' تو اب ظاہر ہے کہ حواشی میں ان کا نام بطور مصنف لکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور صرف کتاب کا نام (یعنی عمومی لسانیات) لکھا گیا ہے۔ یا اگر متن میں آیا ہے کہ ''عمومی لسانیات میں لکھا ہے ـــ'' تو حواشی میں اب کتاب کا نام لکھنا غیر ضروری ہے اور صرف

مصنف کا نام (یعنی عبدالسلام) لکھا گیا ہے۔

البتہ تمام مآخذ (بشمول کتب، جرائد و دیگر مآخذ) کی مکمل طباعتی تفصیلات کتاب کے آخر میں ''مآخِذ'' کے زیرِ عنوان یعنی فہرستِ اسنادِ محولہ (جسے بعض لوگ کتابیات کہتے ہیں) میں بھی دی گئی ہیں۔ حواشی میں مصنف کے نام کا اندراج اس طرح کیا گیا ہے کہ تخلص/ خاندانی یا آخری نام (last name) مصنف کے نام کے آخر ہی میں لکھا گیا ہے (مثلاً: غلام مصطفیٰ خاں) لیکن مآخذ میں الف بائی ترتیب سے مصنف کے نام کے اندراج کے وقت حواشی کے برعکس خاندانی یا آخری نام (last name) پہلے لکھا گیا ہے (مثلاً: خاں، غلام مصطفیٰ)۔ یہ طریقِ اندراج شکاگو/ ترابین (Chicago/Turabian) کے اصولوں کے مطابق ہے۔ انگریزی مآخذات اور دیگر مآخذات ازقبیلِ لغت و دائرۂ معارف (انسائیکلوپیڈیا) کی آخر میں الگ الگ فہرستیں دی گئی ہیں تاکہ تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

اصطلاحات کے انگریزی مترادفات بار بار قوسین (بریکٹ) میں دیے گئے ہیں تاکہ طالب علموں کو آسانی ہو۔ انگریزی اصطلاحات کے لیے رائج اردو مترادفات کو ترجیح دی گئی ہے لیکن بعض اصطلاحات خود ہی گھڑنی پڑیں جن کی طرف متن ہی میں اشارہ کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے مباحث کو علمی اور غیر ذاتی و غیر جذباتی رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کیونکہ یہ کتاب مناظراتی یا نظریاتی یا تبلیغی نہیں علمی، عملی اور افادی ہے۔ امید ہے اسے اسی نظر سے دیکھا جائے گا۔ البتہ کچھ موضوعات باوجود خواہش کے اس کتاب میں شامل نہ کیے جا سکے کیونکہ اس طرح اس کی ضخامت اور قیمت دونوں بہت بڑھ جاتے اور طالب علم ایک اور مشکل میں پڑ جاتے۔ خدا نے چاہا تو ان موضوعات پر پھر کبھی اظہارِ خیال کا موقع ملے گا۔ لیکن

کارِ دنیا کسے تمام نکرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید

اسلام آباد، ۱۶ مئی ۲۰۲۱ء

رؤف پاریکھ

drraufparekh@yahoo.com
۰۰۳۰ ۲۱۰ ۱۸۶۴

پہلا باب: پس منظر

زبان اور لسانیات

زبان کیسی نازک چیز ہے اور اس کے غلط استعمال سے کتنے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ یوں لگایئے کہ ایک خاتون نے زبان کے غلط استعمال پر طلاق لے لی تھی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ کسی عام آدمی کے ساتھ نہیں بلکہ ایک معروف عالم محمد بن یعقوب مجدالدین فیروز آبادی[1] کے ساتھ پیش آیا تھا جو عربی کی معروف اور مستند لغت ''قاموس المحیط'' کے مولف بھی تھے۔ اس واقعے کو سر رضا علی نے بھی اپنی خود نوشت ''اعمال نامہ'' میں بیان کیا ہے۔ انھی کی زبانی سنتے ہیں:

''صاحبِ قاموس مجدالدین بن یعقوب فیروز آبادی کا قصہ مشہور ہے۔ عربی کے جید عالم تھے اور عجمی ہونے کے باوجود بڑی اچھی عربی بولتے تھے۔ ایک عرب خاتون سے نکاح کیا۔ اس کے عزیز مولوی صاحب کو عرب کا سمجھ کر اس مناکحت پر راضی ہو گئے۔ رات کو جب خلوتِ صحیحہ کا وقت آیا تو مولوی صاحب نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا ''اقتلی السراج''۔ کہنا یہ مقصود تھا کہ چراغ گل کر دو۔ جو الفاظ کہے ان کا ترجمہ ہے چراغ کو قتل کر دو۔ وہ چراغ کو قتل کرنے کی بجائے تلوار لے کر مولوی صاحب کے قتل پر آمادہ ہو گئی اور آگ بگولہ ہو کر بولی 'تم ہرگز عرب نہیں ہو، خلافِ محاورہ عربی بولتے ہو۔ عرب ہوتے تو ''اطفی السراج'' (چراغ کو پھونک مار کر گل کر دو) کہتے۔ اقتلی السراج نہ کہتے۔ دھوکا دے کر مجھ

سے نکاح کرلیا۔ یا تو مجھے طلاق دو ورنہ گردن اڑا دوں گی'۔ اس غیور عرب خاتون نے کھڑے کھڑے وہیں بزورِ شمشیر طلاق حاصل کی''[2]۔

عربی کے اس جید عالم سے (جو ایران میں پیدا ہوئے تھے) غلطی یہ ہوگئی کہ فارسی محاورے کا عربی میں لفظی ترجمہ کردیا۔ زبان کی لغزش نے جان لے ہی لی تھی۔ لیکن جان بچی سو لاکھوں پائے۔

اس ضمن میں ایک اور واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق محمد شاہ تغلق نے ''کھڑا کھڑی'' کے تلفظ کو دہلی کے اصلی اور غیر اصلی باشندوں کی شناخت کے لیے معیار مقرر کیا تھا[3]۔ دراصل فیروز شاہ تغلق نے اپنے دور میں بڑی تعداد میں غلام جمع کر لیے تھے جن کی اکثریت مشرقی ہندوستان سے تعلق رکھتی تھی اور وہ سیاسی معاملات میں دخیل ہوگئے تھے۔ ناصرالدین محمد شاہ نے تنگ آ کران کو دہلی سے تین دن میں نکل جانے کا حکم دیا اور کہا کہ اگر اس کے بعد نظر آئیں تو ان کو قتل کردیا جائے۔ ان میں سے کچھ دہلی میں رہے اور پکڑے گئے تو خود کو دہلی کا اصلی باشندہ بتایا۔ محمد شاہ نے پوربی اور بنگالی کی شناخت کے لیے ان سے ''کھڑا کھڑی'' بلوایا جو مشرقی ہندوستان کے لوگ آسانی سے نہیں بول سکتے تھے لہٰذا پہچان لیے گئے اور موت کے گھاٹ اتار دیے گئے[4]۔

گویا زبان کی غلطی طلاق بھی دلوا سکتی ہے اور جان بھی لے سکتی ہے۔ یہ ہے زبان کی اہمیت۔

☆ زبان کیا ہے؟

زبان کے بارے میں اردو میں رائج گھسی پٹی باتوں (مثلاً یہ کہ زبان ہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے، زبان خیالات کی ترسیل کا ذریعہ ہے، زبان ہی سماجی رابطے کا کام انجام دیتی ہے وغیرہ) سے قطع نظر، زبان کی تعریف اگر لسانیات کے جدید مباحث کی روشنی میں دیکھی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ''زبان'' کی تعریف طے کرنا ایک مسئلہ ہے کیونکہ مختلف ماہرین نے زبان کی تعریف اس کے استعمال کے پیشِ نظر کی ہے۔ کچھ اس میں آوازوں اور

صوتیات پر زور دیتے ہیں، کچھ معنویات اور قواعد کی روشنی میں زبان کی تعریف طے کرتے ہیں، اور کچھ اس فرق پر زور دیتے ہیں جو انسانی زبانوں اور ابلاغ کی دیگر صورتوں کے درمیان (مثلاً جانوروں کا ایک دوسرے کو پیغام بھیجنا یا مشینوں کے ذریعے پیغام رسانی) پایا جاتا ہے[۵]۔ دراصل زبان کی کوئی ایسی جامع و مانع تعریف کی بھی نہیں جا سکتی جو زبان کی تمام خصوصیات اور مختلف اقسام کے استعمال پر محیط ہو۔ لسانیات کی درسی کتابوں میں بالعموم زبان کی تعریف دینے کی بجاے اس مسئلے سے بچتے ہوئے زبان کی خصوصیات بیان کرنے پر زیادہ زور ہوتا ہے[۶]۔

لیکن زبان کی ایک ممکنہ تعریف کچھ یوں ہو سکتی ہے:

> ''زبان (language): کسی انسانی معاشرے میں آوازوں، نشانات اور تحریری علامات کی مدد سے ابلاغ اور اظہار خیال کا باقاعدہ اور روایتی ذریعہ''[۷]۔

اگرچہ بعض جانور، پرندے، کیڑے مثلاً شہد کی مکھیاں بھی خیالات کی ترسیل کے لیے مخصوص ذرائع (مثلاً حرکات یا آوازیں) استعمال کرتے ہیں[۸] اور انھیں بھی لسانیات کی اصطلاح میں زبان ہی کہا جاتا ہے[۹] نیز کمپیوٹر میں استعمال ہونے والے علامات پر مبنی ''پروگراموں'' کو بھی زبان یا لینگوئج (language) کہا جاتا ہے[۱۰]۔ لیکن زبان بنیادی طور پر دراصل انسانی تکلم ہی کا نام ہے۔ اور ہم یہاں زبان سے مراد یہی مفہوم لے رہے ہیں۔

بنیادی اور تکنیکی بات یہ ہے کہ زبان دراصل آوازوں کا مجموعہ ہے[۱۱]۔

ہر زبان میں خاص آوازیں استعمال ہوتی ہیں جو ایک خاص ترتیب میں ادا کی جائیں تو کوئی خاص لفظ بن جاتا ہے۔ یہی الفاظ ملتے ہیں تو جملہ بنتا ہے۔ لیکن ہر آواز ہر زبان میں استعمال نہیں ہوتی۔ جو آواز جس زبان میں لفظ بنانے میں استعمال ہوتی ہے وہ اس زبان کی صوتِ تکلم (speech sound) کہلاتی ہے۔ مثلاً ق اور غ کے حروف سے ظاہر کی جانے والی آوازیں انگریزی میں اصواتِ تکلم (speech sounds) نہیں ہیں کیونکہ یہ انگریزی کے کسی لفظ میں نہیں آتیں۔

معروف ماہرِ لسانیات بلوم فیلڈ (Bloomfield) (۱۹۴۹ء-۱۸۸۷ء) نے بہت پہلے کہا تھا کہ تحریر زبان نہیں ہے بلکہ تحریر تو محض زبان کو مخصوص نوعیت کے نشانات [یعنی حروفِ تہجی] کے ذریعے ظاہر کرنا ہے [۱۲]۔ اس بیان کو آج بھی درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ زبان دراصل ان آوازوں کے مجموعے کا نام ہے جو بولنے والے کے منہ سے ایک خاص ترتیب میں نکلتی ہیں اور جب آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو فلاں زبان آتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص ان آوازوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے جو اس زبان میں ایک خاص ترتیب سے خاص مفہوم کے لیے ادا ہوتی ہیں [۱۳]۔ گویا زبان جاننے کے لیے اس کا لکھنا پڑھنا ضروری نہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ کو کوئی زبان لکھنی پڑھنی آتی ہو تبھی آپ وہ زبان جانتے ہوں۔ تحریر تو محض ان نشانات اور علامات (یعنی حروف) کا مجموعہ ہے جو بولی جانے والی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ یہی آوازیں دراصل زبان ہیں کیونکہ انہی کی مدد سے ہم مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔ ان آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے حروفِ تہجی اور رسم الخط بہت بعد میں وجود میں آئے۔ انسان نے پہلے بولنا سیکھا، لکھنا بہت بعد میں سیکھا اور سیکھا بھی دھیرے دھیرے، یعنی تحریر کے فن کو ارتقا پانے اور مختلف زبانوں کے حروفِ تہجی کو اپنی موجودہ شکل میں آنے میں صدیاں لگیں [۱۴]۔

☆ لسانیات (linguistics) کی تعریف

''لسان'' عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں زبان۔ ''یات'' کا لاحقہ اردو میں علوم وفنون کے لیے مستعمل ہے، جیسے معاش سے معاشیات اور نفس سے نفسیات، لہٰذا لسانیات سے مراد ہے علمِ لسان یعنی زبان کا علم۔ لسان کی عربی میں جمع ہے ''اَلسِنہ''، یہ ''اَفعِلہ'' کے وزن پر ہے (جو جمع مکسر کے اوزان میں سے ہے)۔

لسانیات کا علم یا لِنگ وِسٹِکس (linguistics) زبان کا مطالعہ کرتا ہے۔ گویا سادہ لفظوں میں لسانیات ''زبان کا مطالعہ'' (study of language) ہے۔ کبھی اسے زبان کا سائنسی مطالعہ بھی کہا جاتا ہے اور لسانیات کی مختصر تعریف بالعموم یہ کی جاتی ہے:

''زبان کا سائنسی مطالعہ لسانیات ہے''[۱۵]۔

شاید اسی لیے اسے کبھی لسانی سائنس (linguistic science) یا زبان کی سائنس (science of language) بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم لسانیات کو ''لسانی سائنس'' قرار دیتے ہیں تو اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ وسیع ترین مفہوم میں اس سے مراد یہ ہے کہ زبان کا مطالعہ (یعنی کسی ایک خاص زبان کا، یا عمومی مفہوم میں، انسانی زبانیں یعنی وہ شے جسے انسان تحریری، تقریری یا کسی اور طرح ابلاغ کے لیے استعمال کرتے ہیں)، اس امر کا مستحق ہے کہ اس پر علمی طور پر توجہ دی جائے اور اس علمی مطالعے کی بنیاد پر حقائق کی ایک منظم ساخت (systematic body of facts) اور کوئی نظریہ تشکیل دیا جا سکتا ہے[۱۶]۔

روبنز نے لسانیات کو سائنس کہنے کا دوسرا مفہوم تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ:

لسانیات اسی طرح کام کرتی ہے جس طرح سائنس کرتی ہے یعنی یہ ایک مخصوص مواد پر کام کرتی ہے (اور یہ مواد تحریری اور تقریری زبان ہے)، جو عمل اس مواد (یعنی زبان) پر کیا جاتا ہے اس کو یہ سائنسی انداز میں، یعنی خصوصیات، اسباب اور نتائج کو معروضیت کے ساتھ، بیان کرتی ہے، تجزیہ کرتی ہے اور اس سے اصول اخذ کرتی ہے جس سے نظریہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ لسانیات کے تجزیے اور عمل سائنس کے بنیادی اصولوں کے ماتحت ہوتے ہیں یعنی:

۱۔ تمام دست یاب مواد کا تسلی بخش حد تک جائزہ لینا

۲۔ تجزیوں اور بیانات کا آپس میں ایک دوسرے کی تکذیب و تردید نہ کرنا

۳۔ تجزیوں کو کم الفاظ میں عمومیت کے ساتھ بیان کرنا

گویا ماہرِ لسانیات ایک سائنس دان کی طرح کام کرتا ہے، وہ مشاہدہ کرتا ہے، معلومات جمع کر کے ان کی درجہ بندی (classification) کرتا ہے، زیرِ تہہ کارفرما اصولوں اور ضوابط کو سمجھتا ہے، فرضیہ (hypothesis) بناتا ہے، اور اس کی تصدیق مزید شواہد اور اعداد و شمار و کوائف یعنی ڈیٹا (data) سے کرتا ہے[۱۷]۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ زبان کی جامع تعریف کی طرح لسانیات کی بھی ایسی تعریف

مشکل ہے جو اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر سکے کیونکہ اس کے لیے زبان کی خصوصیات، اس کے مختلف استعمال، اس کی نوعیت، ماہیت اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کو اس پیش کردہ تعریف میں سمیٹنا ہوگا جو آسان نہیں۔ یہ اس لیے بھی مشکل ہے کہ موجودہ دور میں لسانیات نے بہت ترقی کر لی ہے، اس کی کئی شاخیں ہوگئی ہیں اور کئی علوم سے اس کی سرحدیں ملنے لگی ہیں۔ لسانیات کی معروف شاخوں کے علاوہ اب لسانیات کا موضوع یہ بھی ہے کہ انسانی نفسیات اور زبان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ طبی، دماغی اور اعصابی لحاظ سے زبان سیکھنے اور بولنے کا عملی اور تکنیکی طریق کار کیا ہے؟ انسانی دماغ زبان کو کیسے سمجھتا ہے؟ عضویاتی سطح پر آوازیں کیسے ادا ہوتی ہیں؟ بچہ زبان کس طرح سیکھتا ہے؟ جرم وسزا اور زبان کا کیا تعلق ہے؟ زبان اور اس کا ذخیرۂ الفاظ ذہنیت اور کردار کو کس طرح ظاہر کرتے ہیں؟ زبان اور الفاظ کا مفہوم ظاہری مفہوم سے ہٹ کر کیسے ادا ہوتا ہے؟ غیرفونیمیاتی خصوصیات (مثلاً کسی خاص لفظ پر زور) سے جملے کا مفہوم کیسے تبدیل ہوتا ہے؟ وغیرہ[۱۸]۔

لیکن لسانیات کی تعریف کو تھوڑی سی وضاحت سے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے:

> ''انسانی زبان کی نوعیت و ماہیت، زبان کی ساخت اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کا باقاعدہ اور سائنسی مطالعہ لسانیات ہے۔ اس کے علاوہ زبان کا ارتقا اور اسے سیکھنے کے عمل کا مطالعہ بھی لسانیات کے دائرہ کار میں شامل ہے''[۱۹]۔

لسانیات تجربی سائنس ہے۔ تجربہ گاہ میں آلات کی مدد سے انسانی آوازوں کو ریکارڈ کر کے ان کی خصوصیات کا مطالعہ اور تجزیہ اس تجربی سائنس کی ایک مثال ہے۔ لیکن یہ سماجی سائنس بھی ہے کیونکہ یہ انسانوں اور انسانی معاشروں کے مظاہر نیز ان کے باہمی تعامل کا مطالعہ بھی ہے[۲۰]۔ یہ درست ہے کہ انسان کبھی کبھی خود سے بھی بات کرتا ہے یا کسی جانور یا پرندے یا پودوں سے بھی باتیں کرنے لگتا ہے لیکن یہ زبان کا ثانوی استعمال ہے اور زبان کا بنیادی استعمال کم از کم دو انسانوں کے مابین ہوتا ہے اور اس طرح اس کے سماجی (social) ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا[۲۱]۔

☆ لسانیات کے موضوعات

موجودہ دور میں لسانیاتی مطالعات کا دائرہ خاصا وسیع ہو گیا ہے۔ اس کے کئی شعبے اور شاخیں ہو گئی ہیں اور اس کے تمام بنیادی تصورات کا یہاں ذکر کرنا بھی مشکل ہے۔ لسانیات کے تحت کیے جانے والے مطالعات کے موضوعات میں سے چند یہ ہیں[۲۲]:

۱۔ نظری (theoretical) مباحث

اس کے تحت قواعد (grammar)، علمِ اصوات (phonology)، مارفیمیات (morphology)، نحو (syntax)، ذخیرۂ الفاظ (lexis)، معنیات (semantics)، املا (orthography) وغیرہ کے مطالعات آتے ہیں۔

۲۔ تشریحی لسانیات (descriptive linguistics)

اس کے ضمن میں تاریخی (historical) اور تقابلی (comapartive) مطالعات، صوتیات (phonetics)، اشتقاقیات (etymology) اور سماجی لسانیات (sociolinguistics) وغیرہ زیرِ بحث آتے ہیں۔

۳۔ اطلاقی (applied) لسانیات

اکتسابِ زبان (language acquisition)، زبانِ دوم (second language)، قانونی لسانیات (forensic linguistics)، تعلیمِ زبان، کمپیوٹری لسانیات (computational linguistics) اور نفسیاتی لسانیات (psycholinguistics) اس کے ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں۔

☆ زبان اور لسانیات کے بارے میں چند بنیادی اور دل چسپ حقائق

زبان کے بارے میں بعض دل چسپ نکات مختلف کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان میں سے انگریزی کی ایک کتاب An introduction to language[۲۳] نیز اردو کی ایک کتاب ''عام لسانیات''[۲۴] سے کچھ بنیادی اور اہم باتیں جو دل چسپ بھی ہیں، پیشِ خدمت ہیں۔ پہلے

انگریزی کتاب سے کچھ نکات:

۱۔ جہاں انسان ہیں وہاں زبانیں ہیں۔

۲۔ کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو غیر ترقی یافتہ یا ناپختہ (primitive) ہو۔ ہر زبان مساوی طور پر ''پیچیدہ'' ہوتی ہے اور کائنات میں موجود کسی بھی تصور کو بیان کرنے کی مساوی صلاحیت رکھتی ہے۔

۳۔ ہر زبان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے۔

۴۔ بولی جانے والی زبانوں کے لفظ کی آواز اور اس کے مفہوم میں بالعموم کوئی عقلی یا منطقی ربط نہیں ہوتا (یعنی کسی لفظ کی آواز سے اس کے مفہوم کا قیاس نہیں کیا جاسکتا)، سوائے ان الفاظ کے جو نقلِ صوت کہلاتے ہیں (مثلاً میاوں یا ککڑوں کوں، جن کا مفہوم ان کی آواز سے ظاہر ہے)۔لسانیات کی اصطلاح میں لفظ اور معنی کے اس رشتے کو الل ٹپ یا خود اختیاری یا من مانا (arbitrary) کہا جاتا ہے (اس کی تفصیل علمِ علامات یعنی سیمیوٹکس (Semiotics) میں بیان کی جاتی ہے جس کا ذکر معنویات کے باب میں ''معنویات'' اور ''تداولیات'' کے زیرِ عنوان ہوگا)۔

۵۔ تمام انسانی زبانیں محدود آوازیں رکھتی ہیں لیکن ان محدود آوازوں کو جوڑ کر الفاظ اور پھر ان سے جملے بنائے جاسکتے ہیں جن کی تعداد لامحدود ہوسکتی ہے۔

۶۔ ہر زبان کی قواعد (grammar) میں لفظ یا جملہ بنانے کے قوانین موجود ہیں اور ان قوانین میں کئی باتیں یکساں رمشترک ہیں۔

۷۔ بولی جانے والی ہر زبان میں کچھ منفرد یا متمیز آوازیں ہوتی ہیں جو اپنے جیسی دوسری آوازوں سے مختلف اور نمایاں ہوتی ہیں۔ ان مخصوص آوازوں کو صوتیہ یا فونیم (phoneme) کہتے ہیں، جیسے 'ب' کی آواز یا 'پ' کی آواز۔ان آوازوں کی نمایاں اور مختلف خصوصیات ہوتی ہیں (جنھیں علمِ صوتیات میں واضح کیا جاتا ہے)۔ بولی جانے والی ہر زبان میں مصوتے یعنی واول (volwels) اور مصمتے یعنی کونسوننٹ

(consonants) ہوتے ہیں (مصوتے کو اردو میں حرفِ علت بھی کہتے ہیں، اسی طرح مصمتے کو اردو میں حرفِ صحیح بھی کہا جاتا ہے)۔

۸۔ ہر زبان میں مخصوص اجزاے کلام یا قواعدی حالتیں (مثلاً اسم، فعل وغیرہ) پائی جاتی ہیں۔

۹۔ دنیا کی ہر زبان میں کچھ آفاقی ''معنوی خاصیتیں'' (semantic properties) مثلاً مذکر، مؤنث، جاندار، بے جان وغیرہ، پائی جاتی ہیں۔

۱۰۔ ہر زبان میں انکار کرنے، سوال کرنے، حکم دینے اور ماضی و مستقبل کا ذکر کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

۱۱۔ ہر زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ اس کے بولنے والے کچھ اس قسم کے جملے بنا سکیں:

- لسانیات ایک دل چسپ مضمون ہے۔
- میں جانتا ہوں کہ لسانیات ایک دل چسپ مضمون ہے۔
- آپ جانتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ لسانیات ایک دل چسپ مضمون ہے۔
- فلاں جانتا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ لسانیات ایک دل چسپ مضمون ہے۔
- یہ حقیقت ہے کہ فلاں جانتا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ لسانیات ایک دل چسپ مضمون ہے۔

اس طرح یہ سلسلہ مزید دراز بھی ہوسکتا ہے۔

☆ زبان سے متعلق چند اہم نِکات

گیان چند کی کتاب عام لسانیات اب کچھ پرانی ہوگئی ہے لیکن اس کے کئی مباحث اب بھی درست اور مفید ہیں۔ اس سے چند نکات:

۱۔ لسانیات تحریری کی بجاے تقریری زبان کو اہمیت دیتی ہے۔ لسانی تجزیے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تحریر کی گرفت سے آزاد ہوجائیے۔

۲۔ لسانیات معروضی (obejective) ہوتی ہے، موضوعی (subjective) نہیں ہوتی۔ سائنس ہی کی طرح لسانیات میں بھی ذاتی، نفسیاتی، داخلی اور جذباتی عناصر کا دخل نہیں ہوتا۔

۳۔ لسانیات میں زبان کا کوئی استعمال غلط نہیں ہوتا۔ صحیح اور غلط کا تصور قواعد میں ہے۔ فلاں تلفظ غلط یا دیہاتی ہے، فلاں لفظ فصیح ہے، فلاں لفظ کو مونث بولنا بہتر ہے وغیرہ۔ یہ سب اخلاقی اور موضوعی قدریں ہیں۔ لسانیات میں نہ کوئی لفظ بُرا ہے، نہ گندہ، نہ اچھا۔ لسانیات اس چپقلش میں پڑتی ہی نہیں ہے کیا درست اور کیا غلط ہے۔ لسانیات میں یہ سب زبان کے استعمال کے مختلف مظہر ہیں اور بس [یاد رہے کہ یہ لسانیات کی بات ہے اور قواعد و لغت کے ذیل میں ان سب باتوں مثلاً تذکیر و تانیث اور فصیح و غیر فصیح وغیرہ کا امتیاز ضروری ہے]۔

۴۔ لسانیات میں شعوری بلکہ غیر شعوری تعصّبات سے بھی بچنا لازمی ہے۔ انسان اپنے علاقے، نسل، مذہب، رسم الخط، مادری زبان، علاقے کی زبان وغیرہ کو لاشعوری طور پر اچھا اور صحیح سمجھتا ہے یا اس کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اس لیے اس ضمن میں خاص احتیاط کرنی چاہیے۔

۵۔ کوئی زبان حقیر، گھٹیا، معمولی، خراب یا غیر ترقی یافتہ نہیں ہوتی، بلکہ حقیر، چھوٹی، معمولی یا غیر ثقہ سمجھی جانے والی زبان کا مطالعہ لسانیات میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

۶۔ اصولاً کسی زبان کی ساخت کا مطالعہ کر کے اس کے تاریخی ارتقا کو دیکھنا چاہیے (زبان کی ساخت کا مطالعہ تشریحی لسانیات یا توضیحی لسانیات کا کام ہے)۔ لیکن ہوا اس کے برعکس ہے۔ تاریخی لسانیات اور تشریحی لسانیات میں ایک طرح کی چشمک یا رقابت ہے۔ جدید دور میں تشریحی لسانیات کی زیادہ اہمیت ہے کیونکہ یہ زبان کی ساخت، آوازوں (اصوات) وغیرہ کا تجزیہ کرتی ہے جن کے بغیر اس زبان کی تاریخ اور ارتقا وغیرہ کا مطالعہ نامکمل ہی رہے گا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اردو والوں نے اردو کی ابتدا کے چند نظریات، لفظوں کی صحت، الفاظ کے درست استعمال اور املا کے مباحث ہی کو لسانیات سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ جو حضرات اردو املا یا الفاظ و تراکیب کے استعمال پر دو چار مضامین لکھ لیں وہ خود کو ماہر لسانیات لکھنے لگتے ہیں۔ یہ سب بھی یقیناً لسانیات کا حصہ ہیں لیکن چھوٹا حصہ۔ ''اصلی'' لسانیات میں تو تشریحی لسانیات کے مباحث، علم اصوات اور صوتیات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے جن پر اردو میں بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔

حواشی:

۱۔ قاموس المحیط کے مولف کا پورا نام محمد بن یعقوب بن محمد ابو طاہر مجدالدین شیرازی فیروز آبادی تھا۔ ظفر احمد صدیقی کے مطابق مجدالدین کی ''پیدائش ۷۲۹ ہجری میں شیراز کے شہر فیروز آباد کے قریب کرزین میں ہوئی''، نیز یہ کہ وہ ''تالیفِ لغت میں طریق اختصار کے بانی وموجد، حدیث وتفسیر اور لغت کے لیے اپنے دور میں مرجع عصر'' تھے۔ دیکھیے: ظفر احمد صدیقی، تحقیقی مقالات (پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۲۰۰۳ء) ص ۱۵۸ وبعدہٗ۔

۲۔ اعمال نامہ (پٹنہ: خدا بخش لائبریری، ۱۹۹۲ء) ص ۵۹۔۴۵۸

۳۔ پنجاب میں اردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء)، حاشیہ، ص ۱۲۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Cambridge Encyclopedia of Language (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)، ص ۳۹۶۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language (لندن: پینگوین بکس، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۸۴ [دوسرا ایڈیشن]۔

۸۔ آر۔ ایل۔ ٹراسک (R.L. Trask)، Language: the Basics (لندن: روٹلیج، ۲۰۰۴ء)، ص ۹۔۷؛ نیز پی۔ ایچ۔ میتھیوز (P.H. Matthews)، Linguistics: A Very Short Introduction (کراچی، اوکسفرڈ، ۲۰۰۵ء)، ص ۱ (پاکستانی ایڈیشن)۔

۹۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Cambridge Encyclopedia of Language، محولۂ بالا، ص ۳۹۷۔

۱۰۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language، محولۂ بالا، ص ۱۸۴۔

۱۱۔ وکٹوریا فرام کن ودیگر، An Introduction to Language (Victoria Fromkin Et al) (میلبرن: تھامسن پباشنگ، ۲۰۰۵ء)، ص ۶۔۳ [پانچواں ایڈیشن]

۱۲۔ Language (لندن: جارج ایلین اینڈ اَن وِن، ۱۹۶۷ء)، ص ۲۱۔

۱۳۔ وکٹوریا فرام کن ودیگر، An Introduction to Language (Victoria Fromkin Et al)، محولۂ بالا، ص ۳۔

۱۴۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: وکٹوریا فرام کن و دیگر (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language ، محولۂ بالا، ص۴۹۳۔۴۸۳

۱۵۔ ڈیوڈ کرسٹل(David Crystal)، The Cambridge Encyclopedia of Language، محولۂ بالا، ص۴۰۴۔

۱۶۔ آر۔ایچ۔روبنز (R.H.Robins)، General Linguistics: An Intordunctory Survey، (لندن: روٹلیج، ۲۰۱۳ء)، ص۶۔

۱۷۔ ایضاً، ص۸۔۷

۱۸۔ تفصیلات کے لیے: ڈیوڈ کرسٹل(David Crystal)، Linguistics، (ہرمنڈس ورتھ: پینگون، ۱۹۸۲ء)، ص۲۴۳۔۲۳۹

۱۹۔ یہ تعریف مذکورہ بالا مختلف مآخذات نیز کیتھ ایلن (Keith Allan) کے مضمون What is Linguistics? سے ماخوذ ہے مشمولہ The Routledge Handbook of Linguistics، مرتبہ کیتھ ایلن (Keith Allan) (لندن: روٹلیج، ۲۰۱۶ء)، ص۲۔۱

۲۰۔ آر۔ایچ۔روبنز (R.H.Robins)، General Linguistics: An Intordunctory Survey، محولۂ بالا، ص۸۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ یہ تفصیلات آر۔ایل۔ٹراسک (R.L.Trask) کی کتاب Language and Linguistics: the Key Concepts (مرتبہ پیٹر اسٹاک ویل (Peter Stockwell)) سے ماخوذ ہیں جس میں لسانیات کے بنیادی تصورات اور اصطلاحات کی بڑی تعداد کی وضاحت کی گئی ہے (نیویارک: روٹلیج، ۲۰۰۷ء)۔

۲۳۔ وکٹوریا فرام کن و دیگر، (Victoria Fromkin Et al) An Introduction to Language، محولۂ بالا، ص۲۱۔

۲۴۔ گیان چند جین، عام لسانیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، پہلا باب۔

☆......☆......☆
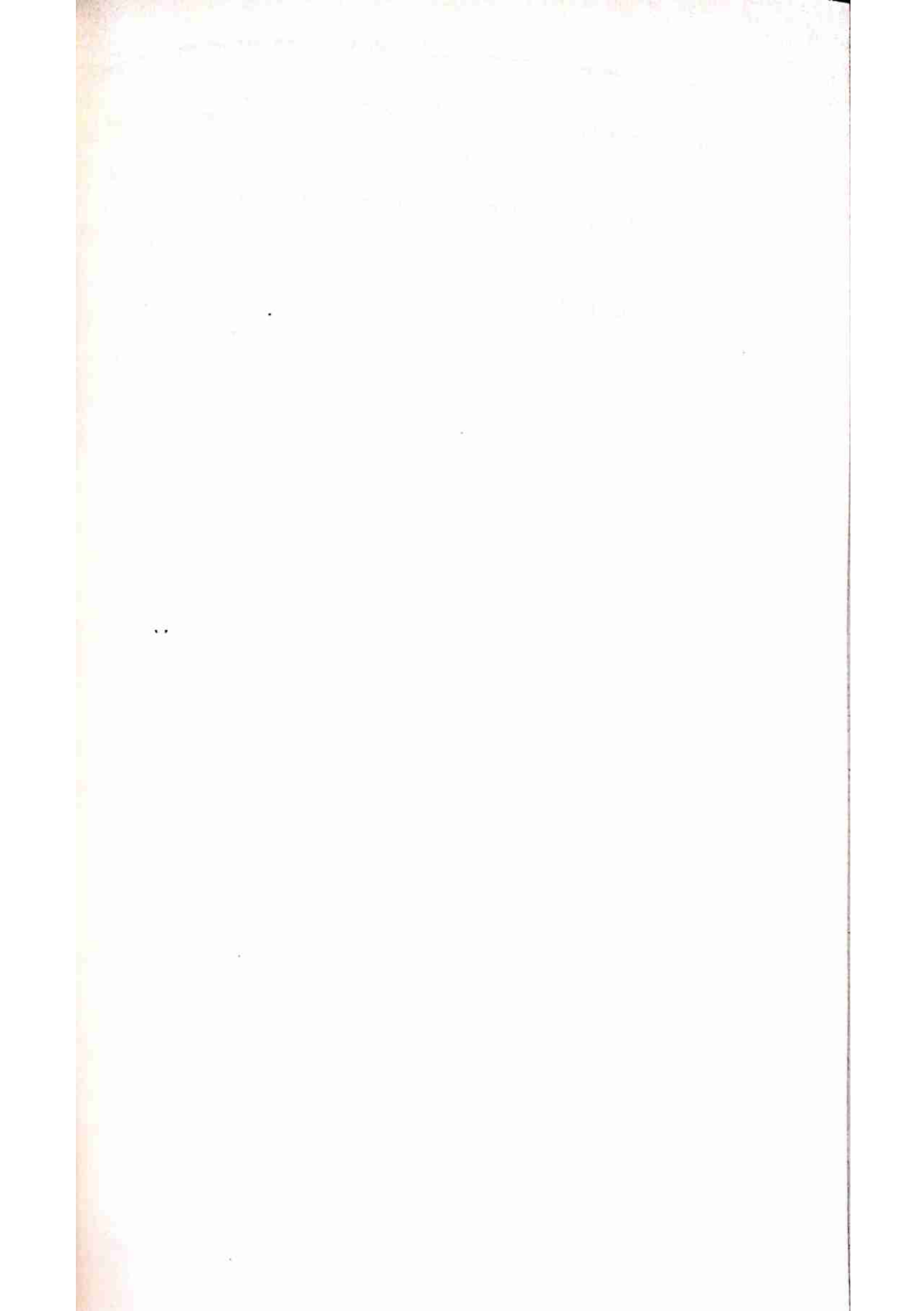
دوسرا باب: تاریخِ لسانیات

لسانی مطالعات کی تاریخ: ایک مختصر جائزہ
(ابتدا تا اٹھارھویں صدی)

آغاز سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں لسانیات (linguistics) (جسے زبان شناسی بھی کہا جاتا ہے) کی تاریخ اور لسانی و لسانیاتی مطالعات کی تاریخ سے مراد کسی ایک یا کسی خاص زبان کی تاریخ نہیں ہے بلکہ لسانی مطالعات کی تاریخ سے مراد ہے یہ جائزہ کہ انسان نے زبان کا باقاعدہ مطالعہ کب شروع کیا؟ دنیا کے کن خطوں میں اور کن زمانوں میں لسانی مطالعے کیے گئے؟ علمِ لسانیات کا باقاعدہ آغاز کیسے اور کب ہوا؟ اور لسانیات کا علم کن راہوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے[1]۔

انھی سوالات کے مختصر جوابات ہم اس باب میں لسانیات کی تاریخ کے جائزے کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگرچہ یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ ایک مختصر باب میں ان سوالات کا مکمل جواب دینا مشکل ہے، تاہم کوشش ہے کہ اہم نکات کا ذکر یہاں ہو جائے۔

☆ لسانی مطالعات کا آغاز

زبان سے متعلق مطالعات کا باقاعدہ آغاز یوں تو تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل یونان میں ہوا لیکن زبان اور اس سے متعلق مسائل و مباحث کا بے قاعدہ آغاز تو اسی وقت ہو گیا تھا جب انسان زبان کے عملی استعمال میں مسائل اور سوالات سے دوچار ہوا اور اس نے زبان میں دل چسپی لینی شروع کی۔ ان دل چسپی کے ثبوت کے طور پر ملنے والے ابتدائی نقوش آج سے کوئی چھے ہزار سال پہلے کے ہیں۔ زبان میں انسان کی دل چسپی کی وجوہات میں، جیسا کہ ہم اس باب میں

آگے چل کر دیکھیں گے، مذہبی متون کی تفہیم و تفسیر بھی تھی، فلسفے و منطق کے سوالات بھی اور ذخیرۂ الفاظ اور بیان و بدیع کا مطالعہ بھی[۲]۔ اس دل چسپی کی وجہ سے دنیا کے مختلف قدیم تہذیبی مراکز، مثلاً قدیم عراق، قدیم ایران، یونان، ہندوستان، چین اور عرب وغیرہ، میں لسانیاتی مطالعات کا آغاز ہوا۔ ان مراکز نے اپنے اپنے طور پر کچھ کامیابیاں حاصل کیں۔

اگرچہ آج مغرب لسانیاتی مطالعات میں سب سے آگے ہے لیکن یورپ میں کیے گئے ابتدائی لسانیاتی مطالعات درحقیقت دنیا کے دیگر خطوں میں کیے گئے قدیم لسانیاتی نظریات و مطالعات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے بعد ہی آگے بڑھ سکے تھے۔ بلکہ یورپی یا مغربی لسانیات آج ترقی کی جس منزل پر کھڑی ہے اس منزل کا حصول دیگر علاقوں بالخصوص مشرقی خطوں کی اپنی آزادانہ اور انفرادی کاوشوں سے استفادے کے بغیر مغرب کے لیے ممکن نہ تھا[۳]۔ خاص طور پر قدیم یونان میں لسانیات کی فلسفیانہ بنیادیں رکھنے میں یونانی فلاسفہ نے جو کام کیے اور ہندوستان میں سنسکرت کے ماہرین نے قواعد اور صوتیات پر جو کام کیے انھی کی بنیاد پر لسانیاتی مطالعات کا سلسلہ آگے بڑھا۔ نیز بعض دیگر خطوں کی لسانیاتی روایات کے کئی دھارے یورپی لسانیاتی سائنس میں بہتے نظر آتے ہیں[۴]۔

☆ لسانی مطالعات قدیم عراق میں

علمِ لسانیات کی تاریخ اور لسانی مطالعات کی جڑوں کی تلاش میں ہم ذخیرۂ الفاظ، قواعد اور تلفظ کے مباحث کے آغاز تک پہنچتے ہیں۔ لسانی مطالعات کے آغاز کی قدیم ترین صورت الفاظ کی ایک فہرست ہے جو قدیم عراق یا میسوپوٹیمیا[۵] (Mesopotamia) میں تیار کی گئی تھی۔ لیکن یہاں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ انسان نے لکھنا کب اور کیسے شروع کیا کیونکہ الفاظ کی یہ قدیم ترین فہرست جو دریافت ہوئی ہے اور جو بابل (Babylon) میں تقریباً پانچ ساڑھے پانچ ہزار سال قبل بنائی گئی تھی (اور جسے بعض ماہرین دنیا کی اولین لغت بھی قرار دیتے ہیں)، اس خط میں ہے جسے میخی خط (cuneiform) یا خطِ اوتاد کہتے ہیں۔ یہاں فن تحریر اور اس کی تاریخ پر کچھ کہنا ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ لسانیات کی تاریخ کا ایک اہم جزو تحریر کی تاریخ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ

بعض سوالات ایسے لاینحل ہیں جن کی وجہ سے فنِ تحریر کی ابتدا اور اس کے ارتقا کی تاریخ میں آج بھی کہیں کہیں کچھ خلا نظر آتے ہیں[٦]۔

مختصراً یہ کہ رسم الخط کی ایجاد سے پہلے زبان کی تحریری صورت کا آغاز تصویری رسم الخط (pictogram) سے ہوا جس میں حروفِ تہجی کی بجائے تصویریں بنائی جاتی تھیں[٧]۔ اگلے دور میں تصویری خط ارتقا پا کر تصوّری رسم الخط یا تمثالی رسم الخط (ideogram) میں تبدیل ہو گیا اور تصویر بنانے کی بجائے علامات سے کام لیا جانے لگا۔ گویا تحریر کی ابتدا خیال یا تصور (idea) کو تصویر کی مدد سے بیان کرنے سے ہوئی اور پھر تصویریں علامات کی شکل میں ڈھل گئیں کیونکہ تصویر بنانا دقت طلب بھی تھا اور وقت بھی اس میں زیادہ لگتا تھا۔ لیکن تصویروں کی طرح اشکال و علامات بنانا بھی طویل اور دقت طلب تھا چنانچہ رفتہ رفتہ علامات حروف میں ڈھلنے لگیں اور رسم الخط کی صورت میں آ گئیں[٨]۔ دنیا کا قدیم ترین رسم الخط، جیسا کہ سطورِ بالا میں ذکر ہوا، میخی خط (cuneiform) سمجھا جاتا ہے۔ میخی خط کو پیکانی خط بھی کہتے ہیں جو پیکان (بمعنی نیزے یا تیر کی نوک) سے ہے۔ اسے خطِ اوتاد بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ اوتاد (اوتاد جمع ہے وتد کی، وتد بمعنی کھونٹا یا میخ) کی مدد سے عبارت لکھنے کا ایک طریقہ تھا۔ میخی خط کا ایک نام پیکانی خط کے علاوہ مسماری خط بھی ہے کیونکہ مسمار میخ اور کیل کو کہتے ہیں[٩]۔ میخی خط کے آثار سمیریوں (Sumerians) نے چھوڑے ہیں جو تین ہزار پانچ سو سال قبل مسیح کے لگ بھگ یعنی آج سے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال قبل کے قدیم عراق یا جنوبی میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) (جسے اردو میں بین النہرین بھی کہا جاتا ہے) کی ایک تہذیب تھی۔ میسوپوٹیمیا میں مٹی کی کچی اور نیم خشک تختیوں پر کیل یا میخ کو دبا کر حروف بنائے جاتے تھے اور ان تختیوں کو بعد میں آگ پر تپا کر پختہ کر لیا جاتا تھا[١٠]۔ سمیریوں نے اس خط میں داستانیں، دعائیں، نظمیں، کہاوتیں اور یہاں تک کہ لغت بھی چھوڑی ہے[١١]۔ اس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں کہ یہ دراصل الفاظ کی فہرست ہے اور یہ لغت یا لغت نما تحریر تختیوں پر لکھی ہوئی ہے[١٢]۔ اگر اسے لغت مان لیا جائے تو یہ دنیا کی پہلی لغت شمار ہو گی۔ لغت کہیے یا فہرستِ الفاظ، بہر حال اس کا شمار دنیا کے قدیم ترین تحریری نقوش میں ہوتا ہے۔

بعد میں اس میخی خط کو عکادیوں (Akkadians)، اشوریوں (Assyrians) اور حتیوں (Hittites) حتیٰ کہ مصریوں (Egyptians) نے بھی اپنالیا[۱۳]۔ حالانکہ مصریوں کا اپنا رسم الخط ہیروغلیفی (Heiroglyphs) موجود تھا لیکن قدیم دور کے مصری ہم سایہ ریاستوں کو میخی خط میں سفارتی مکاتیب بھجواتے تھے اور ایک ہزار چار سو سال قبل مسیح میں میخی خط تجارت اور سفارت کاری کے لیے بین الاقوامی رسم الخط بن چکا تھا[۱۴]۔ گویا ابتدائی لسانی مطالعات کا قدیم ترین سراغ قدیم عراق کی تہذیب (جس کے آثار جنوبی میسوپوٹیمیا میں پائے گئے) اور اس کے بعد کے ادوار میں ملتا ہے۔

☆ میخی خط قدیم ایران میں

میخی خط قدیم ایران میں بھی استعمال ہوا لیکن یہ سمیریوں (Sumerians) اور عکادیوں کے میخی خط سے مماثل ہونے کے باوجود کچھ مختلف تھا[۱۵]۔ قدیم ایران میں میخی خط کی مختلف شکلیں رائج تھیں اور قدیم ایران میں ہخامنشی (Achaemenid) دور کے بادشاہ داریوش اوّل (جو ۵۲۲ قبل مسیح کے لگ بھگ تخت نشین ہوا) کے بنوائے ہوئے کوہِ بے ستون کے نقوش پتھروں میں کندہ ہیں[۱۶]۔ ماہرین کے مطابق اس خط میں حروفِ تہجی کی بعض ابتدائی شکلیں بھی ملتی ہیں[۱۷] جنھوں نے آگے چل کر ارتقا پایا اور حروفِ تہجی کی شکل اختیار کر گئیں۔ میخی خط کے قدیم ایران میں مختلف شکلوں میں مستعمل ہونے اور پتھروں پر کندہ کیے جانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریر کا فن ترقی پذیر تھا اور دیگر علاقوں میں بھی پھیل رہا تھا۔

☆ قدیم ہندوستان میں لسانی مطالعات

جنوبی ایشیا کی جدید زبانوں کے ارتقا سے بہت پہلے ان علاقوں میں لسانیاتی مطالعات کی روایت کا آغاز ہو گیا تھا جو آج ہندوستان اور پاکستان کے نام سے معروف ہیں[۱۸]۔ قدیم ہندستان میں پانینی (Panini) جیسا مفکرِ زباں اور قواعد نویس پیدا ہوا جس کی سنسکرت زبان کی قواعد کے بارے میں لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) جیسے بڑے ماہر لسانیات نے لکھا کہ یہ "one of the greatest monuments of human intelligence" یعنی انسانی ذہانت

کی عظیم ترین یادگاروں میں سے ایک ہے [۱۹]۔ البتہ بلوم فیلڈ یہ بھی کہتا ہے کہ قواعد پر پانینی کی لکھی ہوئی اس کتاب، جو ہم تک پہنچنے والی اس موضوع پر قدیم ترین دستاویز ہے، کے پیچھے کئی نسلوں کی محنت ہوگی [۲۰]۔ چوتھی صدی قبلِ مسیح کے پانینی سے قبل کی گئی ''نسلوں کی محنت'' کا کوئی بہت زیادہ تفصیلی سراغ تو نہیں ملتا لیکن ابواللیث صدیقی نے لکھا ہے کہ پانینی نے اپنی اس قواعد میں اپنے کم از کم چونسٹھ (۶۴) پیش رؤوں کا ذکر کیا ہے [۲۱]۔ سنسکرت زبان میں لکھی گئی پانینی کی یہ قواعد منظوم ہے اور اس کا نام ''اشٹا دھیائی'' ہے [۲۲]۔ اس کے آٹھ حصے ہیں اور اسی لیے اس کا نام اشٹا دھیائی ہے (''اشٹ'' یعنی آٹھ اور ''ادھیایا'' یعنی خطبہ)، اس میں آٹھ (۸) خطبات ہیں اور ہر خطبے کے چار (۴) پد یعنی حصے ہیں [۲۳]۔ پانینی کے کام کو اس کے بعد دیگر ماہرین مثلاً دوسری صدی قبل مسیح کے قواعد نویسوں کاتیاین (Katyayana) اور پتنجلی (Patanjali) نے آگے بڑھایا [۲۴]۔

پانینی جس گاؤں میں پیدا ہوا اس کا نام تکشلا تھا اور جو آج ٹیکسلا کے نام سے پاکستان کا حصہ ہے [۲۵]۔ پانینی کے زمانے کے بارے میں اختلاف ہے لیکن بیش تر محققین کا خیال ہے کہ اس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح کا ہے [۲۶]۔ پانینی نے آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل اپنی سنسکرت کی منظوم قواعد ''اشٹا دھیائی'' میں صوتیاتی و لسانی موضوعات پر جس گہرے غور و خوض سے کام لیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی [۲۷]۔

☆ قدیم یونان میں

قدیم یونان کے فلسفیوں نے جن فلسفیانہ افکار کی بنیاد رکھی ان افکار نے آگے چل کر دنیا کی تہذیب اور بالخصوص مغربی تہذیب کو متاثر کیا۔ ان فلسفیوں کے افکار ہی کی بنیاد پر مزید تحقیق اور ترقیوں نے قرونِ وسطیٰ (پانچ سے پندرھویں صدی عیسوی) تک ان علوم کو نکھارا اور ان علوم میں فلسفہ تو شامل تھا ہی، ادب، زبان، تنقید، طب، ہیئت، ریاضی، علم ہندسہ اور موسیقی بھی ان میں شامل ہیں [۲۸]۔

آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل قدیم یونان میں زبان اور اس کے متعلقات کے باقاعدہ مطالعے کا آغاز ہوا۔ مغرب میں زبان اور لسانی مطالعات سے دل چسپی کا آغاز قواعد کے

مطالعے سے نہیں بلکہ فلسفے کے مطالعے کے نتیجے میں ہوا۔ اس میں اوّلین دل چسپی چوتھی صدی قبل مسیح کے افلاطون (Plato) نے لی۔ اپنی کتاب Cratylus میں اس نے بحث اٹھائی کہ نام (یا لفظ) conventional یعنی روایتی ہوتے ہیں یا natural یعنی فطری۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ آج بھی لسانیات میں زیر بحث آتا ہے کہ لفظ کے معنی من مانے یا الل ٹپ (arbitrary) ہوتے ہیں یا لفظ اور اس کے مفہوم میں کوئی خاص منطقی ربط ہوتا ہے [۲۹] (اس بحث کی تفصیل اس کتاب میں معنویات یعنی Semantics کے باب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے)۔

☆ قدیم چین میں

دوسری صدی قبل مسیح میں چین میں بھی زبان کے متعلقات کے مطالعات کی ابتدا ہوئی۔ قدیم چین کی ہین سلطنت (Han Dynasty) کے وقائع (جو تیسری صدی قبل مسیح کے اوائل میں قلم بند کیے گئے) لکھا ہے کہ آٹھ سال کی عمر کے بچوں کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے اور درس گاہ میں ان کو چھے (۶) ''فنون'' (arts) سکھائے جاتے ہیں اور ان میں سے پانچویں مرحلے پر ''حروفِ تہجی کے چھے (۶) اصولوں'' کا ذکر ہے۔ یہ حروف تہجی لکھنے کے چھے (۶) مختلف انداز یا طریقوں پر مبنی تھے جن میں تصویری خط کے علاوہ آوازوں کو حروف میں ظاہر کرنے کے اصول بھی تھے [۳۰]۔ یہاں ان فہرست ہائے الفاظ (word books) کا ذکر بھی ضروری ہے جو چین میں دوسری صدی قبلِ مسیح اور اس سے قبل بھی موجود تھیں [۳۱]۔

☆ رومن تہذیب اور لسانیات

لنگ وِسٹکس (linguistics) یعنی لسانیات کا لفظ انیسویں صدی کے آغاز میں استعمال ہونا شروع ہوا اور اس کا صحیح اور ٹھیک مترادف قدیم دور میں موجود نہیں تھا [۳۲]۔ لسانی مطالعات کا آغاز دراصل قواعدی مباحث سے ہوا اور قدیم دور کے قواعد نویس بالخصوص یونانی اور لاطینی کے قواعد داں ہی دراصل لسانیات کے اوّلین نقیب ہیں، یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے الفاظ کے زمرے (categories) یا ان کی قواعدی حیثیتیں طے کیں اور ان میں سے کئی ان قواعدی حیثیتوں یا زمروں سے قریب ہیں جو ہم آج استعمال کرتے ہیں یعنی اسم، فعل، ضمیر اور متعلقِ فعل

(adverb) وغیرہ [۳۳]۔ صرفی سطح پر بھی وہ اسی طرح کی تقسیم کرتے تھے جن سے ہم مانوس ہیں یعنی صیغہ یا گردان (conjugation)، تعداد (یعنی واحد جمع) یا تصریف (inflection) نیز ان معاملات میں وہ اصول بھی قائم کرتے تھے جن میں سے بعض واضح اور اکثر منتشر حالت میں ہیں [۳۴]۔

یونانی قواعد داں اپالونیئس ڈسکولس (Apollonius Dyscolus) (جو دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے) اور رومی قواعد داں پریشن (Prescian) (جو چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں گزرا ہے) وہ قواعد نویس ہیں جن کے ہاں نحو کے مسائل پر اظہار خیال ملتا ہے اور اسی لیے بسا اوقات لسانیات کی تاریخ کو قواعد کی تاریخ کے طور پر دیکھنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے [۳۵]۔

☆ عرب دنیا میں

قرونِ وسطیٰ میں عبرانی اور عربی زبانوں کے قواعد کے مطالعے کا آغاز ہوا۔ سیبویہ کی مشہور تصنیف الکتاب فی النحو، جو اس نے ۷۶۰ء میں لکھی، عربی زبان کی قواعد کو منضبط کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش تھی۔ یہ کتاب جو صرف ''الکتاب'' کے نام سے معروف ہے، بے شک عربی قواعد نویسی کی طویل تاریخ میں مستند ترین کتاب ہے اور سیبویہ کے بعد آنے والے نحویوں نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا [۳۶]۔ سیبویہ نے جس ذہانت سے عربی زبان کا تجزیہ کیا تھا وہ آج اس کی وفات کے بارہ سو (۱۲۰۰) سال بعد بھی عربی لسانیات کے ماہرین کے اذہان پر چھایا ہوا ہے [۳۷]۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر آواز صوتِ تکلم (speech sound) نہیں ہوتی کیونکہ بعض آوازیں (sounds) بعض زبانوں میں بے معنی ہوتی ہیں کیونکہ وہ اس زبان کے کسی بامعنی لفظ میں استعمال نہیں ہوتیں، لہٰذا ان زبانوں میں یہ آوازیں صوتیہ یا فونیم (phoneme) نہیں مانی جاتیں (اگرچہ کسی اور زبان میں یہ آوازیں صوتیہ ہو سکتی ہیں، جیسے ق اور غ کی آوازیں عربی کے صوتیے ہیں لیکن انگریزی کے نہیں ہیں۔ اندازہ ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں دوسو (۲۰۰) صوتیے ہیں لیکن کوئی ایک زبان بھی ایسی نہیں ہے جس میں یہ سارے صوتیے وجود رکھتے ہوں)۔ سیبویہ تاریخ میں پہلا آدمی تھا جس نے آواز (sound) کے صوتیاتی اصولوں پر غور کیا۔ سیبویہ نے صوتیات (Phonetics) اور علم الاصوات یعنی فونیمیات (Phonology) پر جو بحث کی ہے اور سمعی

صوتیات (auditroy phonetics) اور تلفیظی صوتیات (articulatory phonetcs) کا جس طرح تجزیہ کیا ہے اس سے وہ دنیا کے چند پہلے فطری ماہرین علم اصوات یا ماہرین فونیمیات (phonologists) میں شامل ہو جاتا ہے[۳۸]۔

لیکن افسوس آج بھی بعض حضرات اردو کی قواعد لکھنے بیٹھتے ہیں تو آواز، لفظ، حرف اور صوتیے (phoneme) میں کوئی فرق نہیں کرتے اور اردو بازار کے تجارتی ناشرین نے اردو قواعد پر جوادھ کچری کتابیں شائع کی ہیں ان کو تو چھوڑیے، بعض پروفیسر حضرات بھی آواز، حرف، لفظ اور صوتیے میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔ مثلاً مقتدرہ قومی زبان (اب اس کا نام ادارۂ فروغِ قومی زبان ہو گیا ہے) نے قواعد پر ایسی دو کتابیں شائع کی ہیں جن کے لکھنے والوں کو اس بات کا کوئی ادراک ہی نہیں ہے جو سیبویہ نے کوئی بارہ سو سال پہلے لکھ دی تھی لہٰذا انھوں نے اکیسویں صدی میں بھی آواز، حرف، لفظ، اصواتِ تکلم (speech sounds) کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا ہے حالانکہ یہ سب مخصوص مفہوم اور تصورات کے حامل الفاظ ہیں اور لسانیات اور قواعد میں ان سب کا الگ الگ، مختلف و منفرد، طے شدہ اصطلاحی مفہوم ہے۔

☆ لسانیاتی مطالعات اور فلولوجی (Philology)

اٹھارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر کئی عالموں نے زبان کے مطالعے میں دل چسپی لینی شروع کی اور یہ تعداد اور دل چسپی اتنی بڑھی کہ زبان کے مطالعے کا سائنس کی ایک شاخ کے طور پر ظہور ممکن ہو گیا۔ اس مطالعے کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ سائنسی تحقیق کی مدد سے زبان کا تجزیہ کیا جائے[۳۹]۔ اٹھارھویں صدی سے قبل مغربی دنیا میں لسانیات کے مطالعے سے دل چسپی بیشتر یا تو فلسفیوں کو تھی یا ان قواعد نویسوں کو جو زبان کے مخصوص اور محدود استعمال (جو ان کے نزدیک ''درست'' تھا) پر زور دیتے تھے[۴۰]۔ لیکن ۱۷۸۶ء میں سر ولیم جونز (William Jones) نے اپنے ایک مقالے میں ثابت کیا کہ ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت اور بعض یورپی زبانوں مثلاً یونانی، کلٹیک (Celtic)، لاطینی اور المانی یعنی جرمینک (Germanic) نیز فارسی میں حیرت انگیز مماثلت ہے[۴۱]۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان زبانوں کی اصل ایک ہے اور یہ سب اسی ایک ماخذ

سے نکلی ہیں۔ ولیم جونز کی اس تحقیق کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگلے تقریباً سو سال تک ماہرین اس قدیم ترین ماخذ زبان یا پروٹولینگوئج (proto-language) کا کھوج لگانے میں مصروف رہے جس کی اولاد یہ سب زبانیں ہیں[۴۲] (پروٹولینگوئج کی تفصیل اس کتاب میں تاریخی لسانیات کے باب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے)۔ گویا ولیم جونز کے سنسکرت اور لاطینی و یونانی زبانوں کے ہم رشتہ ہونے کے نظریے نے انسانی زبانوں کے آپس کے رشتوں اور زبانوں کے خاندانوں کے باقاعدہ نظریات کی بنیاد رکھ دی[۴۳]۔

لسانیات (linguistics) سے پہلے زبان کے مطالعے کی سائنس کو فلولجی (philology) یا علمِ زبان یعنی علم لسان کہا جاتا تھا۔ ولیم جونز پہلا آدمی تھا جس نے سب سے پہلے تقابلی فلولجی کی اصطلاح استعمال کی اور اس طرح اٹھارھویں صدی عیسوی میں تقابلی لسانیات کی بنیادیں رکھیں۔ فلولجی کا لفظ یورپ کی بعض زبانوں میں کسی اور مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ برطانوی انگریزی میں اب یہ لفظ زیادہ تر تاریخی لسانیات (hisotrical linguistics) اور تقابلی لسانیات (comparative linguistics) کے لیے استعمال ہوتا ہے[۴۴]۔ ایلینا بشیر کے مطابق فلولوجی کا لفظ سب سے پہلے ۱۸۳۷ء میں استعمال ہوا[۴۵]۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ اسے لسانیات یا لنگ وسٹکس (linguistics) کا نام ۱۸۵۵ء میں دیا گیا[۴۶]۔ لیکن یہ بات کچھ درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ جدید لسانیات کے بانی فرڈی نینڈ سوسیئر (Ferdinand de Saussure) کے مطابق لسانی مطالعات کا آغاز قواعد سے ہوا اور اس کے بعد اس وقت علمِ زبان یا فلولجی آئی جب فریڈرک اگسٹ وولف نے ۱۷۷۷ء میں سائنسی تحریک شروع کی تھی اور ''فلولجی'' کا اطلاق سب سے پہلے اسی تحریک پر ہوا[۴۷]۔ لیکن علمِ لسان یا فلولجی کا بنیادی مسئلہ زبان کا ڈھانچا نہیں ہے بلکہ اس کا بنیادی کام متون کو تلاش کر کے ان کی تشریح اور تبصرہ ہے[۴۸]۔ اس کام کے لیے علمِ لسان کا اپنا طریقہ ہے جس سے وہ مختلف زمانوں یا مختلف لکھنے والوں کی زبان کی خصوصیات کا تعین کرتے ہیں اور قدیم زمانوں کی یا متروک زبانوں کی تحریروں کی تفہیم کی کوشش کرتے ہیں[۴۹]۔ بے شک فلولجی کی وجہ سے تاریخی لسانیات کی راہ ہموار ہوئی لیکن علمِ لسان پر ایک اعتراض سوسیئر نے یہ کیا کہ یہ غلامانہ حد تک لکھی

ہوئی زبان کا تابع ہے اور زندہ زبان کو نظر انداز کر دیتا ہے[۵۰]۔

یہ درست ہے کہ ۱۸۱۶ء میں فرانز بوپ (Franz Bopp) نے سنسکرت اور جرمینک زبانوں کی مماثلت پر جو کام کیا وہ نیا نہیں تھا اور اس سے قبل ولیم جونز یہ کام کر چکا تھا لیکن بوپ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ان مماثل زبانوں کے کوائف کے مطالعے سے ایک نئے لسانی سائنسی علم کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے[۵۱]۔ بہرحال جدید لسانیات کا آغاز اٹھارھویں صدی عیسوی کے اختتام سے قبل نہیں ہوسکا تھا۔

☆ لسانیات کا دورِ جدید

بیسویں صدی کے آغاز میں جدید لسانیات کا دور شروع ہوا جو بڑی حد تک سوسیئر کا مرہونِ منت ہے۔ اس نے تشریحی اور ساختیاتی لسانیات کے بعض اہم تصورات پیش کیے بلکہ اس کے ساختیات کے نظریے نے عمرانیات (sociology) اور علم البشریات (anthropolgy) کو بھی متاثر کیا۔ یہ سوئستانی یا سوئس (Swiss) عالم لسانیات کا پروفیسر تھا اور اسے جدید علم لسانیات کے بانیوں میں سے ایک کہا جاتا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے لیکچروں سے لیے گئے نوٹس اس کے شاگردوں نے کتابی صورت میں Course in General Lingusitics کے نام سے ۱۹۱۶ء میں شائع کیے۔ بعد ازاں اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا[۵۲]۔

بیسویں صدی میں لسانیات پر اتنا وسیع و عمیق کام ہوا ہے کہ اس کی تفصیل ایک اور کتاب کی محتاج ہے۔

حواشی:

۱۔ ویوین لا، (Vivien Law) The History of Linguistics in Europe: From Plato to 1600، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۔

۲۔ ڈیوڈ کرسٹل، (David Crystal) Cambridge Encyclopedia of Language (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء) [اشاعتِ نو] ص ۴۰۴۔

۳۔ آر ایچ رابنز (R.H. Robins)، A Short History of Linguistics (لندن: روٹلج، ۲۰۱۳ء)، ص ۷،۶۔

۴۔ ایضاً، ص ۷۔

۵۔ میسوپوٹیمیا (Mesopotamia) عراق میں تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح میں دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے درمیانی علاقے اور آس پاس کے بعض علاقوں پر محیط خطے کا نام تھا۔ میسوپوٹیمیا کی اصطلاح بنیادی طور پر یونانی زبان کے الفاظ سے بنائی گئی ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں مابین النہرین یا دو دریاؤں کے درمیان۔ اسی لیے میسوپوٹیمیا کو اردو میں بین النہرین، فارسی میں میانِ رودان (یا میانِ دو رود) اور عربی میں بلاد الرافدین کہتے ہیں۔

۶۔ ڈیوڈ کرسٹل، Cambridge Encyclopedia of Language، محولۂ بالا، ص ۱۹۶۔

۷۔ تحریر کی ایجاد اور ارتقا سے متعلق یہ معلومات نیز اگلی سطور میں درج معلومات بھی مختلف مآخذ سے لی گئی ہیں اور کئی کتب میں موجود ہیں، مثلاً: پی ای کلیٹر (P.E.Cleator)، Lost Languages، (نیویارک: مینٹر بکس، ۱۹۶۲ء)، باب دوم وسوم؛ نیز وکٹوریا فرامکن و دیگر (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language (میلبرن (آسٹریلیا): تھامسن، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۸۶، [پانچواں ایڈیشن]؛ ماریو پی (Mario Pei)، The Story of Language، (نیویارک: نیو امریکن لائبریری، ۱۹۶۶ء)، ص ۱۰۴-۹۵؛ سی ایل باربر (C. L.Barber)، The Story of Language، (لندن: پین بکس، ۱۹۷۹ء)، [طباعتِ نو] ص ۴۶-۳۷؛ شیخ ممتاز حسین جونپوری، خط و خطاطی، (کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۱ء) باب اوّل و دوم؛ محمود علی خان ماہر، علم الحروف یا تحقیقاتِ ماہر، (دہلی: ناشر مصنف، ۱۹۳۴ء)، ص ۴۴-۳۱؛ سید محمد سلیم، اردو رسم الخط (کراچی: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۱ء)، ص ۱۴۔

۸۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: حاشیہ ۷، محولہ بالا کتب۔ محمود علی خان ماہر نے اس ضمن میں کچھ تفصیل بھی دی ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ ابتدا میں تصویر بنا کر حالات اور جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ مثلاً ایک بادشاہ کو شیر نے ہلاک کر دیا تو اس واقعے کے بیان کے طور پر ایک تصویر میں شیر اور انسان کو لڑتے

ہوئے دکھایا گیا، یہ تصویری خط کا مادی دور تھا (علم الحروف، ص ۳۱)۔ اگلے دور میں تصویری خط ارتقا پا کر تصوری رسم الخط (ideogram) میں ڈھل گیا۔ اب تصویر بنانے کی بجائے اشاروں اور تصورات سے کام لیا جانے لگا، مثلاً دشمنی کے اظہار کے لیے سانپ کو کنڈلی مارے ہوئے دکھایا گیا، آسمان کے لیے نصف قوس کی شکل بنائی گئی۔ یہ گویا خط کا معنوی دور تھا جس میں مادی اشیا خود اپنی علامت کی بجائے جذبات اور احساسات کی علامت بنیں (ایضاً، ص ۳۱)۔

۹۔ سید محمد سلیم، اردو رسم الخط، محولہ بالا، ص ۱۴۔

۱۰۔ وکٹوریا فرامکن، محولہ بالا، ص ۴۸۶؛ نیز سید محمد سلیم، محولہ بالا، ص ۱۴۔

۱۱۔ وکٹوریا فرامکن، محولہ بالا، ص ۴۸۶۔

۱۲۔ لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield)، Language، (لندن: جارج ایلن اینڈ ین ون لمٹیڈ، ۱۹۶۷ء)، [اشاعتِ نو] ص ۲۹۳۔

۱۳۔ اسٹیون روجر فشر (Steven Roger Fischer)، A History of Language، (لندن: ری ایکشن بکس، ۱۹۹۹ء)، ص ۹۴۔

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ ایڈورڈ جی براون (Edward G. Browne)، A Literary Hisotry of Persia، جلد اوّل، (دہلی: گڈورڈ بکس، ۲۰۰۲ء)، ص ۶۱ وبعدہٗ۔

۱۶۔ پی۔ای۔ کلیٹر (P.E. Cleator) نے اپنی کتاب Lost Languages میں اس کی تفصیل دی ہے، محولہٗ بالا، بالخصوص باب ۳۔

۱۷۔ ایضاً۔

۱۸۔ جے الیف اسٹال (J.F. Staal)، Sanskrit Philosophy of Language مشمولہ History of Linguistic Thought and Contemporary Linguistics، مرتبہ Hermann Parret (برلن: والٹر ڈی گرٹر اینڈ کمپنی، ۱۹۷۵ء)، ص ۱۰۲۔

۱۹۔ بلوم فیلڈ، محولہ بالا، ص ۱۱۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۔۱۱

۲۱۔ جامع القواعد، حصۂ اوّل، (لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۱ء)، ص ۱۷ (مرکزی اردو بورڈ کا موجودہ نام اردو سائنس بورڈ ہے)۔

۲۲۔ مرزا خلیل بیگ، لسانی مسائل ومباحث (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۷۱۔۱۷۰

۲۳۔ ایضاً؛ نیز ابواللیث صدیقی، جامع القواعد، محولہ بالا، ص ۱۷۔

۲۴۔ ابواللیث صدیقی، محولہ بالا؛ نیز مرزا خلیل بیگ، محولہ بالا۔

۲۵۔ مرزا خلیل بیگ، محولہ بالا، ۱۷۰۔
۲۶۔ ایضاً۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔۱۷۰
۲۸۔ ویون لا (Vivien Law)، محولہ بالا، ص ۱۳۔
۲۹۔ ڈیوڈ بوسٹوک (David Bostock)، Plato on Understanding Language مشمولہ Companion to Ancient Thought 3: Language (مرتبہ اسٹیفن ایورسن (Stephen Everson)) (کیمرج: کیمرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۳۔۱۰
۳۰۔ کیرن اسٹیفن چنگ (Karen Steffen Chung) East Asian Linguistics مشمولہ The Oxford Handbook of the Hisotry of Linguistics (مرتبہ کیتھ ایلن (Keith Allan))، (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورٹی پریس، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۱۲۔
۳۱۔ ایضاً۔
۳۲۔ پیٹر میتھیوز (Peter Mathews)، Greek and Latin Linguistics مشمولہ History of Linguistics Volume II (مرتبہ گیلیوسی لپشی (Giulio C Lipschy)، (نیویارک: روٹلج، ۱۹۹۴ء)، ص ۱ [اشاعتِ ثانی]
۳۳۔ ایضاً۔
۳۴۔ ایضاً۔
۳۵۔ ایضاً۔
۳۶۔ رمزی بعلبکی (Ramzi Baalbaki)، The Legacy of the *Kitab* (لیڈن: برل، ۲۰۰۸ء)، ص xii۔ سیبویہ کی تاریخ و جاے پیدائش اور تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ لیکن اس کی کتاب کی کئی شرحیں لکھی گئیں اور دبستان بصرہ کا شاید ہی کوئی علم ہوگا جس نے الکتاب پر حواشی نہ لکھے ہوں، دیکھیے: اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، ج ۱۱، لاہور پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء، (اشاعتِ ثانی)۔ علامہ عبدالعزیز میمن کے مطابق سیبویہ سے پہلے کسی نے ایسی کتاب نہیں لکھی اور نہ اس کے بعد لکھی گئی، دیکھیے: مقالاتِ علامہ عبدالعزیز میمن (مرتبہ محمد راشد شیخ) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۹ء، ص ۲۷۶۔ عبدالستار صدیقی نے سیبویہ کی الکتاب سے بعض اقتباسات بھی دیے ہیں جن میں اصوات اور ان کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، دیکھیے: مقالاتِ صدیقی، ج ۲، (مرتبہ ساجد صدیق نظامی)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء، ص ۱۶۸۔۱۶۶
۳۷۔ امل ای مروگی، کیس ورستیغ (مرتبین) (Amal E Marogy & Kees Versteegh)، تعارف، The Foundations of Arabic Linguistics II (لیڈن: برل، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۔

۳۸۔ جولیٹ بلے ونز (Juliette Blevins) , Natural and Unnatural Sound Patterns مشمولہ Naturalness and Iconicity in Language (مرتبہ کلاس ویلمس اور لڈوویک ڈی کیپیئر Klaas Willems & Ludovic DeCuypere) (ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ کمپنی، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۲۳۔

۳۹۔ ڈیوڈ کرسٹل، محولہ بالا، ص ۴۰۴۔

۴۰۔ جیفری فنچ (Geoffrey Finch)، Linguistic Terms and Concepts (لندن: میکملن، ۲۰۰۰ء)، ص ۳۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۔

۴۲۔ ایضاً۔

۴۳۔ میکال بی پراڈاوسکی (Michal B Paradowski)، Comparatve Linguistics and Language Pedagogy مشمولہ Multilingualism and Applied Comparative Linguistics، (مرتبہ فرینک بوئرس و دیگر Frank Boers Et al)، (نیوکاسل: کیمبرج اسکالرز پبلشنگ، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۔

۴۴۔ روبنز، محولہ بالا، ص ۶۔

۴۵۔ ایلینا بشیر (Elena Bashir)، Urdu and Linguistics: A Fraughat But Evolving Relationship مشمولہ Annual of Urdu Studies، شمارہ ۲۶، ص ۱۲۳۔۹۷)

۴۶۔ ایضاً۔

۴۷۔ فرڈی ننڈ ڈی سوئیر (Ferdinand de Saussure)، Course in General Linguistics، (لندن: بلومز بری، ۲۰۱۳ء) [اشاعتِ نو]، ص ا۔

۴۸۔ ایضاً۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۔۱

۵۰۔ ایضاً۔

۵۱۔ ایضاً۔

۵۲۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: جان ای جوزف (John E Joseph)، Saussure (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء)۔

☆.....☆.....☆

تیسرا باب: مارفیمیات (۱)

مارفیم، مارفیمیات اور اردو

اس موضوع پر کچھ عرض کرنے سے قبل لفظ ''مارفیمیات'' کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ یہ انگریزی کے ''مارفولوجی'' morphology کا اردو مترادف ہے جو لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ اردو میں اسے صَرف اور صَرفیات کا نام بھی دیا گیا ہے۔ لیکن گیان چند صاحب کا خیال تھا کہ نیا لفظ گھڑنے کی بجائے اسے مارفیمیات کہا جائے[۱]۔ چونکہ صَرف قواعد کی ایک شاخ کا بھی نام ہے اور مارفیمیات صَرف ہوتے ہوئے بھی صَرف سے تھوڑی سی مختلف ہوتی ہے اس لیے اسے مارفیمیات کہنا بہتر ہے۔ لہٰذا ہم مارفولوجی کو مارفیمیات ہی کہیں گے۔ اگرچہ اردو میں کچھ مصنفین نے اس کا نام تشکیلیات بھی لکھا ہے[۲] لیکن عتیق صدیقی نے گلیسن کی کتاب کے اردو ترجمے[۳] میں بھی اسے مارفیمیات کا نام دیا ہے جو مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے قواعد کی شاخ یعنی صَرف اور لسانیاتی صرفیات میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے مارفیم کو دیکھتے ہیں۔

☆ مارفیم: معنی کی اکائی

مارفیمیات سے پہلے مارفیم (morpheme) کو سمجھنا چاہیے کیونکہ مارفیمیات نام ہے مارفیم کے مطالعے کا۔ اگرچہ مارفیم کو اردو میں ''صرفیہ'' بھی کہا گیا ہے[۴] لیکن ایک رجحان اردو میں یہ بھی ہے کہ مارفیمیات کی طرح لفظ مارفیم کا بھی ترجمہ کرنے کی بجائے اسے مارفیم ہی کہا جائے[۵]۔

مارفیم (morpheme) کی تعریفوں میں بظاہر ذرا سا اختلاف ملتا ہے، مثلاً مارفیم کی

ایک تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

A minimal unit of meaning or grammatical function.[۶]

یعنی معنی کی مختصر ترین یا قواعدی عمل کی مختصر ترین اکائی۔

مارفیم کی ایک اور تعریف یہ ہے:

The basic unit of grammatical meaning is the morpheme.[۷]

یعنی قواعدی معنی کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی مارفیم ہے۔

ایک اور تعریف یہ ہے:

A part of a word that cannot be broken down further into meaningful or recognizable parts.[۸]

یعنی کسی لفظ کا وہ حصہ جسے مزید بامعنی یا قابلِ شناخت حصوں میں تقسیم نہ کیا جاسکے۔

بظاہر ان تعریفوں میں تھوڑا سا فرق ہے لیکن یہ صرف الفاظ کا فرق ہے ورنہ بنیادی مفہوم یہی ہے کہ معنی کی سب سے چھوٹی اکائی مارفیم ہے۔ ذرا سی الجھن ان تعریفوں میں لفظ ''قواعدی'' کے استعمال سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کی وضاحت مختصراً یوں کی جاسکتی ہے کہ کبھی کبھی کسی لفظ کا کوئی حصہ ایسا ہوتا ہے جو ''لغوی'' یا لفظی معنی نہیں دیتا بلکہ ''قواعدی'' معنی دیتا ہے۔ اس کی مثال انگریزی کا لفظ opened ہے۔ یہ دو مارفیموں سے مل کر بنا ہے، یعنی open اور ed۔ یہاں open تو ایک ایسا لفظ ہے جو لغوی معنی رکھتا ہے لیکن ed کے الگ سے کوئی لغوی یا لفظی معنی نہیں ہیں اور یہ صرف ایک قواعدی ضرورت یعنی صیغۂ ماضی کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ پس یہ بھی مارفیم ہے اور قواعدی مارفیم ہے[۹]۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

معنی کی مختلف اکائیاں ہوسکتی ہیں اور ان میں سے ایک بڑی اکائی ''جملہ'' ہے، اس سے چھوٹی اکائی فقرہ یا کوئی ترکیب ہے اور معنی کی اس سے بھی چھوٹی اکائی لفظ ہے۔ گویا معنی کی سب سے چھوٹی اکائی بظاہر لفظ ہے لیکن کوئی لفظ ایسا بھی ہوتا ہے جو بظاہر ایک لفظ ہوتا ہے لیکن

اصل میں دو یا زیادہ لفظوں یا اجزا سے مل کر بنا ہوتا ہے اور وہ جزو ہی دراصل معنی کی سب سے چھوٹی اکائی ہوتا ہے۔ اسی جزو کو مارفیم کہتے ہیں۔ یعنی مارفیم معنی کی مختصر ترین اکائی ہے، چاہے وہ لفظ ہو یا لفظ سے چھوٹا کوئی بامعنی جزو، جیسا کہ اوپر انگریزی لفظ opened کی مثال میں ہم نے ed کو دیکھا۔ معنی کی سب سے چھوٹی اکائی جسے مزید تقسیم نہ کیا جا سکے، مارفیم ہے۔ اسے اردو میں صرفیہ بھی کہتے ہیں۔

☆ مارفیم کی تعریف اور اہم نکات

اوپر دی گئی تینوں تعریفوں کا مفہوم ایک ہی ہے اور ان تینوں تعریفوں کو ملایا جائے اور ان پر غور کیا جائے تو ہم یہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں ؎:

۱۔ مارفیم معنی کی مختصر ترین یا قلیل ترین اکائی ہوتی ہے۔ گویا کوئی لفظ یا کسی لفظ کا کوئی جزو جسے مزید بامعنی ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ممکن نہ ہو ایک مارفیم ہے، مثلاً لفظ ''کتاب'' ایک مارفیم بھی ہے اور لفظ بھی۔ لفظ کتاب کو مزید بامعنی حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ مارفیم کا لفظ ہونا ضروری نہیں ہے، کوئی حرف یا کسی لفظ کا کوئی ٹکڑا بھی مارفیم ہو سکتا ہے، مثلاً لفظ ''کتابی'' میں ''ی'' بھی ایک مارفیم ہے (کتاب+ی)۔ اسی طرح انگریزی لفظ opened میں ed بھی ایک مارفیم ہے اور الگ سے پہچانا بھی جا رہا ہے۔

۳۔ لفظ ''کتابی'' کو مزید بامعنی حصوں میں تقسیم کرنا ممکن ہے، اس میں ''ی'' لفظ کا جزو ہے اور مفہوم دے رہا ہے لہٰذا لفظ ''کتابی'' میں ''کتاب'' بھی ایک مارفیم ہے اور ''ی'' بھی ایک مارفیم ہے۔ گویا ''کتابی'' ایک لفظ ہے جس میں دو مارفیم ہیں یعنی: کتابی = کتاب+ی۔

۴۔ کسی لفظ میں ایک مارفیم ہو سکتا ہے اور کسی لفظ میں ایک سے زیادہ مارفیم بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ''کتاب'' میں ایک مارفیم ہے، ''کتابی'' میں دو مارفیم ہیں: کتاب + ی ،

اسی طرح ''خدانخواستہ'' میں تین مارفیم ہیں: خدا+نَ+خواستہ (یعنی خدانہ چاہے،اللہ نہ کرے)۔''اشرف المخلوقات'' میں چار مارفیم ہیں: اشرف+ال+مخلوق+ات۔ کسمپرسی میں بھی چار مارفیم ہیں: کس+مَ+پُرس+ی۔کس یعنی کوئی، ''مَ'' فارسی میں نفی کے مفہوم کے لیے آتا ہے، پُرس دراصل فارسی مصدر پرسیدن (یعنی پوچھنا) سے ہے اور ''ی'' یہاں حالت وکیفیت کالاحقہ ہے۔یہ چاروں الگ الگ مارفیم ہیں۔

۵۔ مارفیم کا بامعنی ہونا ضروری ہے،لفظ ہونا ضروری نہیں ہے۔مارفیم بامعنی ہوتا ہے اور کسی دوسرے مارفیم یا لفظ کے ساتھ مل کر اس کے معنی کو بدل دیتا ہے۔لفظ کتابی میں ''ی'' ایک مارفیم ہے لیکن یہ کوئی لفظ نہیں ہے نہ الگ سے کوئی معنی دیتا ہے مگر لفظ کتاب کے معنی کو بدل دیتا ہے (اسے اسم noun سے صفت adjective بنا دیتا ہے)۔''اشرف المخلوقات'' کو دیکھیے۔اس میں ''ال'' عربی کا حرفِ تخصیص (definite article) ہے اور ''ات'' عربی میں مؤنث کی جمع کی علامت ہے۔گویا یہ دونوں بامعنی ہیں اور ''قابلِ شناخت'' ہیں اس لیے مارفیم ہیں۔

۶۔ اگرچہ کوئی مارفیم کبھی کبھی اکیلا کوئی معنی نہیں دیتا اور بظاہر مہمل یا بے معنی لگتا ہے لیکن کسی لفظ کے ساتھ مل کر معنی دینے لگتا ہے کیونکہ اس کے مفہوم کو بدل دیتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر خدانخواستہ کی مثال میں دیکھا کہ ''نَ'' بظاہر اکیلا کچھ بھی نہیں ہے لیکن کسی لفظ سے مل کر نفی کے معنی دیتا ہے۔اسی طرح لفظ ''نِڈر'' کی مثال ہے (یعنی جسے ڈر نہ لگتا ہو) جو ایک لفظ ہے مگر اس میں دو مارفیم ہیں (نِ+ڈر)۔نِ اور ڈر دونوں مارفیم ہیں کیونکہ یہ اجزا معنی رکھتے ہیں اور ''قابلِ شناخت'' ہیں، جیسا کہ اوپر کی ایک تعریف میں اشارہ کیا گیا ہے۔لیکن ''نِ'' لفظ نہیں ہے، صرف مارفیم ہے اور حرفِ نفی (یعنی نافیہ) کا کام کرتا ہے۔''ڈر'' لفظ بھی ہے اور مارفیم بھی۔

۷۔بعض مارفیم اکیلے نہیں آسکتے،انھیں کسی دوسرے مارفیم کے ساتھ جڑنا پڑتا ہے اور جب وہ جڑتے ہیں تو معنی دیتے ہیں اور دوسرے مارفیم کے معنی کو بدل دیتے ہیں۔

۸۔ مختصراً یہ کہ کسی بھی زبان میں چھوٹے سے چھوٹا یا مختصر ترین بامعنی جزو جسے مزید بامعنی اجزا میں تقسیم نہ کیا جا سکے مارفیم (morpheme) یا صرفیہ کہلاتا ہے، خواہ وہ لفظ ہو یا لفظ سے چھوٹی معنی کی کوئی اکائی۔ مثلاً لفظ ''کتاب'' کو مزید بامعنی حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اس لیے یہ ایک مارفیم ہے لیکن لفظ ''کتابی'' کو دو بامعنی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اس لیے اس ایک لفظ میں دو مارفیم ہیں۔

۹۔ ہر لفظ مارفیم ہوتا ہے لیکن ہر مارفیم لفظ نہیں ہوتا۔

اب مارفیم کی یہ تعریف واضح ہو جاتی ہے کہ مارفیم معنی کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی ہے جو لغوی (یعنی لفظ) بھی ہو سکتی ہے اور قواعدی (مثلاً ''ی'' یا ''ن'') بھی۔ مارفیم کا لفظ ہونا ضروری نہیں ہے، مارفیم کا معنی دینا ضروری ہے، چاہے وہ اکیلا بامعنی نہ ہو۔

اوپر ایک تعریف میں ''قواعدی معنی کی اکائی'' کے الفاظ آئے ہیں، اس کی وضاحت یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے۔ دراصل لغت اور قواعد کے لحاظ سے مارفیم دو طرح کے ہو سکتے ہیں، لغوی اور قواعدی۔

☆ لغوی مارفیم (lexical morpheme)

لغوی مارفیم (lexical morpheme) کی اصطلاح بالعموم لغوی معنیات (lexical semantics) اور لغت نویسی (lexicography) میں استعمال ہوتی ہے اور اس سے مراد ہے کوئی لفظ یا مرکب جسے لغت یعنی ڈکشنری (dictionary) میں بطور اندراج (entry) شامل کیا جا سکے، مثلاً کوئی لفظ جیسے دل، لڈو یا کوئی ترکیب جیسے بور کے لڈو، یا محاورہ جیسے دل میں لڈو پھوٹنا وغیرہ۔ یہ سب لغوی اکائیاں (lexicla units) ہیں۔ ان کا اندراج لغت میں ہو سکتا ہے۔ الگ الگ بھی (یعنی ''دل'' اور ''لڈو'' کی صورت میں) اور ترکیب کے طور پر بھی (یعنی مثلاً دل میں لڈو پھوٹنا)۔ لیکن ان کی تصریفی شکلیں (مثلاً دلوں، لڈوؤں یا پھوٹتے اور پھوٹنے وغیرہ) لغوی اکائیاں نہیں ہیں اور ان کا لغت میں شمول بطور اندراج درست نہیں مانا جائے گا کیونکہ یہ ایک ہی لفظ کی تصریف شدہ شکلیں ہیں۔ ان کے لغت میں اندراج کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ

قاری ان کی مجرد یا بنیادی شکل لغت میں دیکھ لے گا۔ اسی کو لغویہ یا لفظیہ یا لیکسیم (lexeme) کہتے ہیں[11]۔

لغوی اکائی یا لغوی مارفیم وہ مارفیم ہے جس کی تصریف نہ ہوئی ہو۔ اوپر ہم نے انگریزی کے لفظ opened کی مثال دی ہے۔ اس میں open لغوی مارفیم ہے لیکن ed قواعدی مارفیم ہے۔ لڑکا لغوی مارفیم ہے لیکن لڑکے یا لڑکوں اسی کی تصریف شدہ شکلیں ہیں۔

☆ قواعدی مارفیم (grammatical morpheme)

قواعدی مارفیم سے مراد ہے کوئی بامعنی لسانی عنصر (حرف یا مارفیم) جو کسی خاص اصول کے تحت کسی لفظ یا لفظ کے جزو سے جڑے۔ بعض اوقات اس کا جڑنا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک الگ لفظ بھی ہوسکتا ہے لیکن لغوی مارفیم (جس کا ذکر اوپر آیا) کے برعکس قواعدی مارفیم کے بسا اوقات کوئی ''لغوی'' معنی نہیں ہوتے اور اس کا کام صرف قواعدی تعلق کو یا لفظ کی قواعدی حیثیت کو ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ قواعدی مارفیم بہت مختصر (ایک حرف یا دو حرفوں کی) صورت میں بھی ہوسکتا ہے جیسے انگریزی میں ed- جو مختلف لفظوں کے ساتھ جڑتا ہے (جیسے play+ed)۔ اسے قواعدی مارفیم (grammatical morpheme) کا نام دیا گیا ہے[12]۔

اردو میں قواعدی مارفیم کی مثال میں ''یا'' کو پیش کیا جاسکتا ہے جو اردو افعال کے آخر میں ماضی کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے، مثلاً گیا، آیا، کھایا وغیرہ میں یہ آخر میں دیکھا جاسکتا ہے، یہ ایک مارفیم ہے لیکن اس کے لغوی یا لفظی معنی یہاں کچھ بھی نہیں ہیں۔ البتہ یہ قواعدی معنی کے لحاظ سے ماضی کے صیغے کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا الفاظ میں ''یا'' قواعدی اکائی ہے۔

☆ لغوی لفظ اور قواعدی لفظ

بعض دفعہ لسانیات کی کتابوں میں لغوی لفظ اور قواعدی لفظ کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ لغوی معنی رکھنے والے الفاظ کو لسانیات کی بعض کتابوں میں وضاحت کی خاطر لغوی لفظ (lexical word) یا موادی لفظ (content word) بھی کہا جاتا ہے[13]۔

قواعدی لفظ کو بعض اوقات شکلی لفظ (form word)، عملی لفظ (function word)، ساختی لفظ (structural word) اور خالی لفظ (empty word) بھی کہا جاتا ہے[۱۴]۔ اس کی مثال انگریزی کے اس جملے I want to see میں لفظ to ہے[۱۵]۔

☆ یک مارفیمی الفاظ

کسی بھی زبان کا کوئی لفظ لیجیے، وہ یا تو ایک مارفیم یعنی ایک صرفیے پر مشتمل ہوگا یا ایک سے زیادہ مارفیموں پر۔ جو لفظ ایک مارفیم پر مبنی ہو اسے یک صرفیائی یا یک مارفیمی (monomorphemic) کہتے ہیں۔ یہ وہ لفظ ہوتا ہے جو مزید بامعنی اجزا میں تقسیم نہیں ہوسکتا:

یک مارفیمی الفاظ کی مثالیں:

انگریزی سے: sky, father, blue

اردو سے: ہوش، سات، میز، خراب

اس ضمن میں وکٹوریا فرامکن نے ایک ضروری یاددہانی کرائی ہے اور وہ یہ کہ بے شک er- انگریزی میں ایک مارفیم ہے اور player جیسے الفاظ کے آخر میں آتا ہے (play+er) (یعنی انگریزی کے لفظ ''پلیئر'' میں دو مارفیم ہیں) لیکن لفظ father کے آخر میں جو er ہے وہ کوئی الگ مارفیم نہیں ہے بلکہ لفظ فادر (father) کا حصہ ہے کیونکہ father ایک ہی مارفیم پر مبنی لفظ ہے[۱۶]۔

اردو کے ضمن میں اسی طرح کی ایک مثال گیان چند نے دی ہے اور بتایا ہے کہ بچپن اور پاگل پن میں جو ''پن'' ہے وہ یقیناً ایک مارفیم ہے اور بچپن (بچ + پن) اور پاگل پن (پاگل + پن) میں یہ موجود ہے کیونکہ یہ دو دو مارفیموں پر مبنی لفظ ہیں لیکن درپن (بمعنی آئینہ) میں جو ''پن'' ہے اس کا اس ''پن'' سے کوئی تعلق نہیں جو بچپن اور پاگل پن میں ہے۔ درپن یک مارفیمی لفظ ہے اور اس میں ''پن'' الگ مارفیم نہیں ہے[۱۷]۔

☆ کثیر مارفیمی الفاظ

دو یا زیادہ مارفیموں پر مبنی لفظ کو کثیر مارفیمی (polymorphemic) کہتے ہیں۔

کثیر مارفیمی الفاظ دو یا تین یا زیادہ مارفیموں پر بھی مشتمل ہو سکتے ہیں۔ ان کی مثالیں انگریزی اور اردو دونوں میں موجود ہیں، مثلاً:

دو مارفیمی الفاظ کی مثالیں:

انگریزی سے: aside (a+side), unable (un+able), highly (high+ly) wanted (want+ed), player (play+er), careless (care+less)

اردو سے: ہوشیار (ہوش + یار)، ساتواں (سات+واں)، میزیں (میز+یں)، خرابی (خراب+ی)، جانور (جان+ور)، بحال (بِ+حال)، بچپن (بچ+پن)

سہ مارفیمی الفاظ:

انگریزی کی مثالیں: carelessness (care+less+ness), unfaithful (un+faith+ful)

اردو کی مثالیں: ہوشیاری (ہوش+یار+ی)، خرابیاں (خراب+ی+اں)، بے حسی (بے+حس+ی)، بہرحال (بَ+ہر+حال)

چہار مارفیمی الفاظ:

انگریزی سے مثال: remarkably (re+mark+abl+y)

اردو سے مثال: بے دردانہ (بے+درد+ان+ہ)۔ یہاں ''بے'' ایک مارفیم ہے، دوسرا مارفیم ''درد'' ہے، ''ان'' (جو فارسی میں جمع کی علامت ہے) تیسرا مارفیم ہے اور ''ہ'' چوتھا مارفیم ہے (اس چوتھے مارفیم کی وجہ سے یہ لفظ متعلقِ فعل یعنی adverb بن جاتا ہے)۔

پنج مارفیمی الفاظ:

انگریزی کی مثال: denationalisation (de+nation+al+is+ation)

اردو کی مثال: غیر جانب دارانہ (غیر+جانب+دار+ان+ہ)

☆ مارف (morph)

مارفیمیات میں مارف کی اصطلاح بھی مستعمل ہے۔اس کو سمجھنے کے لیے بنیادی بات یہ ہے کہ مارفیم کے بارے میں یہ ذہن میں رکھا جائے کہ مارفیم ایک مجرد (abstract) تصور ہے۔ لیکن جب مارفیم کو کسی مادی یا مجسم شکل میں پیش کیا جائے تو وہ مارف (morph) کہلاتا ہے۔گویا جب ہم کوئی مارفیم بولتے ہیں یا لکھتے ہیں تو اس کی صوتی شکل (آواز) یا اس کی تحریری شکل (املا یا ترسیم) مارف کہلاتی ہے[۱۸]۔

یوں سمجھ لیجیے کہ وہ مادی شکل (خواہ آواز ہو یا تحریر) جس میں کسی مارفیم کو پیش کیا جائے مارف ہے۔مارفیم معنی کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی ہے مگر یہ ایک ذہنی تصور ہے اور مارف اس کی طبعی یا مادّی شکل ہے۔دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ معنی کی مختصر ترین اکائی (مارفیم) کا صوتی یا تحریری شکل میں اظہار مارف کہلاتا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ مارفیم اور مارف کا فرق محض علمی اور نظری ہے کیونکہ مارفیم کو بالعموم ایک ہی مارف (یعنی لکھی ہوئی یا بولی ہوئی شکل) سے ظاہر کیا جاتا ہے[۱۹]۔مثلاً لفظ ''میز'' ایک مارفیم ہے، جب ہم اسے کسی بھی رسم الخط کے حروفِ تہجی کی مدد سے لکھیں گے (مثلاً اردو حروف میں ''میز'' اور انگریزی میں table) تو اس کی لکھی ہوئی یہ شکل مارف کہلائے گی۔اگر بولیں گے تو بولی ہوئی شکل (یعنی آواز کی لہریں) جس طرح ہمیں سنائی دے گی وہ بھی مارف ہے۔

گویا عام طور پر مارفیم اور مارف میں کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن کچھ صورتیں ایسی ہیں جب یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی مارفیم (یعنی اس کا ذہنی مفہوم) کبھی کبھی ایک ہی زبان میں مختلف تحریری صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ مختلف صورتیں لفظ کے لحاظ سے ہوتی ہیں۔اس کی مثال یہ ہے کہ ''نفی'' کا تصور ایک مارفیم ہے جو مختلف الفاظ یا مرکبات میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوسکتا ہے ۔ یہ مارفیم اردو قواعد میں حرفِ نفی یا نافیہ (negative) کہلاتے ہیں اور انگریزی میں ان کی مثال -un-, in-, ir-, im-, dis-, non جیسے سابقے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''نفی یا منفی صورت'' ایک مارفیم ہے اور اوپر درج انگریزی کے سابقے

(یعنی dis- اور un- وغیرہ) اسی ایک مارفیم کے "مارف" (morph) ہیں کیونکہ ان سب کا مفہوم "نفی یا منفی یا نہ ہونے کی حالت یا کیفیت" ہے اور یہ نافیے ہیں جن میں سے کوئی possible کے ساتھ لگے گا، کوئی regular کے ساتھ اور کوئی honest کے ساتھ [۱۲]۔ یعنی مثلاً: im+possible یا ir+regular یا dis+honest وغیرہ۔

اردو میں نافیوں کی مثال لیں تو نفی یا نہ ہونے کا تصور ایک مارفیم ہے اور اس کے مارف یہ ہو سکتے ہیں (جو حرفِ نفی یا نافیے ہیں) : اَ، نِ، نا، اَن، غیر، بے، بلا، جیسے:

اَٹل : اَ+ٹل (جو نہ ٹلے)

نِڈر : نِ+ڈر (جو نہ ڈرے)

نادان: نا+دان (جو نہ سمجھے)

انجان: اَن+جان (جو نہ جانے)

اسی طرح: غیر+مہذب، بے+وقوف، بلا+وجہ، وغیرہ۔

اردو میں حرفِ نفی ایک مارفیم ہے۔ مارفیم حرفِ نفی کے مارفوں کا نقشہ یوں بنایا جا سکتا ہے [۱۳]۔
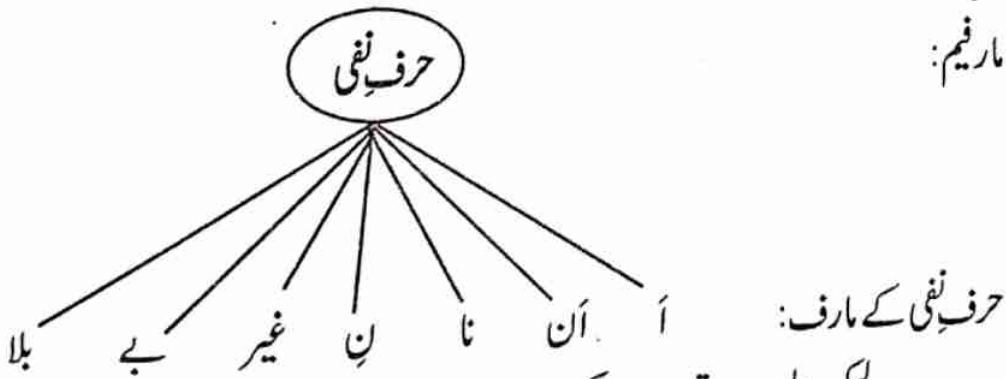
مارفیم: حرفِ نفی

حرفِ نفی کے مارف: اَ، اَن، نا، نِ، غیر، بے، بلا

لیکن ایسی صورتیں بہت کم ہیں جن میں ایک مارفیم کے بہت سے مارف ہوں اور مارفیم کو بالعموم ایک ہی مارف سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

☆ ایلومارف (allomorph)

بعض اوقات ایک ہی مارفیم کی آواز مختلف طریقے پر ادا کی جاتی ہے، مثلاً ماضی کے صیغے کا تصور ایک مارفیم ہے اور انگریزی میں اسے ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ed- کا لاحقہ ہے جو

ایک مارفیم ہے۔ لیکن مختلف انگریزی الفاظ کے ساتھ اس لاحقے کا تلفظ بدل جاتا ہے اور اس کی آواز مختلف طرح سے ادا کی جاتی ہے، مثلاً انگریزی کے لفظ repel کا ماضی replled ہے اور انگریزی کے لفظ wed کا ماضی wedded ہے لیکن دونوں کے آخر میں آنے والا مارفیم ed- مختلف تلفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک ہی مارف ہے (یعنی صیغۂ ماضی) لیکن ایک میں صرف ''ڈ'' کی آواز آتی ہے اور دوسرے میں ''اِڈ'' کی۔ ان دونوں مختلف شکلوں کے جوڑے یا سیٹ کو ایلو مارف (allomorph) کہتے ہیں [۲۲]۔ اوکسفرڈ کی لغت کے مطابق -allo یونانی زبان کا سابقہ ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں مختلف یا دوسرا۔ گویا ایلومارف کے لفظی معنی ہیں مختلف مارف۔

گویا ایک ہی مارف کی اگر مختلف شکلیں ہوں تو وہ ایلو مارف کہلاتی ہیں۔ انگریزی میں -allo ایک سابقہ ہے جو کسی لسانی اکائی کی مختلف شکلوں کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے (جیسے ایلو پیتھک)۔ پس ایلو مارف دراصل مارف کی ایک مختلف شکل ہوتی ہے۔ اصطلاحاً ایلو مارف کسی مارف کی مختلف شکلوں کا جوڑا یا سیٹ (set) ہوتا ہے [۲۳]۔

انگریزی سے اس کی دوسری مثال جمع کو ظاہر کرنے والے الفاظ کی ہے۔ انگریزی الفاظ میں جمع بناتے وقت کبھی ایس (s) لگاتے ہیں لیکن یہ کبھی تو ''سین'' یا ایس (s) کی آواز دیتا ہے جیسے books میں یہ ''س'' کی آواز دیتا ہے اور کبھی ''زے'' یعنی زیڈ یا زی (z) کی آواز دیتا ہے جیسے buses میں اس کی آواز ''ز'' کی ہے۔ جمع کا ''تصور'' ایک مارفیم ہے اور اس کا ایس (s) کی شکل میں اظہار مارف ہے لیکن جمع بناتے وقت اس کی دو آوازوں کا جوڑا یا سیٹ (''س'' اور ''ز'' کی آوازیں) ایلو مارف ہے [۲۴]۔

اردو میں اس کی مثال یوں لی جاسکتی ہے کہ ''لڑکا'' ایک مارفیم ہے اور اس کی جمع ''لڑکے'' ہے۔ جملے میں صرفی ضرورت کے لحاظ سے ''لڑکے'' اور ''لڑکوں'' لکھا جائے گا اور یہ دونوں (لڑکے اور لڑکوں) ایلو مارف ہیں [۲۵]۔

☆ صفر مارف (zero morph)

جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا، مارف دراصل مارفیم کی لکھی ہوئی یا بولی ہوئی شکل ہے اور

بعض اوقات ایک مارفیم (یعنی مفہوم کے ذہنی تصور) کی دو شکلیں (یعنی تحریری یا املائی یا صوتی صورتیں) ہوتی ہیں۔ جیسے ''نفی'' کے تصور کی شکلیں ''نَ'' اور ''نا'' وغیرہ ہوسکتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک تصور کی دو شکلیں تو ہوتی ہیں لیکن ان کو ظاہر کرنے کے لیے دو الگ الگ مارف (یعنی تحریری شکلیں یا الگ الگ املا) نہیں ہوتے۔ انگریزی میں اس کی مثال لفظ sheep (یعنی بھیڑ) ہے جس کے ہجے واحد اور جمع کی صورت میں ایک ہی ہوتے ہیں، مثلاً

He has one sheep.

She has three sheep.

یہاں دونوں جملوں میں ایک ہی لفظ یعنی sheep آیا ہے حالانکہ پہلے جملے میں واحد (ایک بھیڑ) کا تصور ہے اور دوسرے میں جمع (تین بھیڑیں) کا۔ لیکن ان کو ایک ہی انگریزی میں ایک ہی مارف یعنی sheep سے ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ انگریزی میں ''شیپ'' (sheep) کی جمع ''شپ'' ہی ہے، لہٰذا دوسرے مارف کا وجود نہیں ہے اور اسی لیے یہ صفر مارف (zero morph) کہلائے گا[۲۶]۔

یہاں مزید وضاحت کردی جائے کہ جمع کا تصور ایک مارفیم ہے اور واحد کا تصور بھی ایک مارفیم ہے، ان دونوں کو ظاہر کرنے کے لیے انگریزی میں عام طور پر واحد کے آگے ایس (s) کا اضافہ کیا جاتا ہے تاکہ جمع بن سکے، مثلاً book اور books۔ اس کو ظاہر کرنے کے لیے واحد اور جمع کے الگ الگ مارف (ہجے یا آواز) ہوتے ہیں لیکن جب واحد اور جمع دونوں کے لیے ایک ہی مارف ہو (ایک ہی ہجے کی وجہ سے) تو اسے صفر مارف کہتے ہیں[۲۷]۔ جیسا کہ ہم نے اوپر sheep کی مثال میں دیکھا کہ اس کی جمع بھی اسی ہجے کے ساتھ ہے۔

اردو میں اس کی مثال لی جائے تو یوں ہوگی:

اس نے ایک پان کھایا۔

میں نے دو پان کھائے۔

پہلے جملے میں پان واحد اور دوسرے میں جمع ہے لیکن دونوں کا مارف (یعنی لکھی ہوئی شکل) ایک جیسی ہے لہٰذا یہ صفر مارف یا زیرو مارف ہے۔ گیان چند نے میں اس ضمن میں لفظ پتھر

کی مثال دی ہے جو اردو میں واحد اور جمع دونوں کی صورت میں ایک ہی املے کے ساتھ آ سکتا ہے، جیسے:

اِس نے ایک پتھر پھینکا۔

اُس نے دس پتھر پھینکے۔ [۲۸]

یہاں پتھر ایک مارفیم ہے اور اس کے واحد اور جمع کا مارف ایک ہی ہے (یعنی لکھی ہوئی شکل میں ایک ہی ہجے ہیں)، لہٰذا یہ بھی صفر مارف یا zero morph کی مثال ہے۔

☆ مارفیمیات: مارفیموں کا علم

مارفیمیات یا مارفولوجی (morphology) کی اصطلاح بالعموم جرمن ادیب اور فلسفی گوئٹے سے منسوب کی جاتی ہے جس نے یہ اصطلاح انیسویں صدی میں علمِ حیاتیات (biology) کے تناظر میں وضع کی تھی[۲۹]۔ اس انگریزی لفظ کا اشتقاق دیکھا جائے تو اس میں مارف (-morph) یونانی زبان کا ہے جس کے معنی ہیں شکل، وضع، ظاہری ہیئت، گویا مارفولوجی شکلوں یا ہیئتوں کے مطالعے کا علم ہے[۳۰] لیکن لسانیات میں مارفولوجی سے مراد ہے وہ ذہنی نظام جو لفظ کی شکل بنانے سے متعلق ہے اور اس کے دوسرے معنی ہیں لسانیات کی وہ شاخ جو لفظوں، ان کی اندرونی ساخت اور اس امر سے بحث کرتی ہے کہ ان کی تشکیل کیسے ہوتی ہے[۳۱]۔

مارفیمیات کی تعریف کئی کتابوں میں ملتی ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

> Morphology is the study of the internal structures of words.[۳۲]

یعنی مارفیمیات لفظوں کی اندرونی ساخت کا مطالعہ ہے۔ لیکن یہ تعریف جو بظاہر سیدھی سی ہے اختلاف کا باعث بھی ہے کیونکہ لفظ ''لفظ'' کی متفقہ تعریف لسانیات کے ماہر اب تک طے نہیں کر سکے ہیں[۳۳] لیکن سرِ دست ہم اس تعریف میں لفظ ''لفظ'' کو عمومی معنی میں لیتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔ مختصراً یوں کہنا چاہیے کہ مارفیمیات لفظوں اور مارفیموں کی ساخت، ان کے بننے کے اصولوں اور ان کے باہمی تعلق کا مطالعہ ہے، یعنی مارفیمیات اس امر کا بھی مطالعہ کرتی ہے کہ

مارفیم آپس میں کیسے مل کر لفظ بناتے ہیں [۳۴]۔

مارفیمیات کے ضمن میں ایک باہمی متضاد بات یہ ہے کہ مارفیمیات قواعدی مطالعات کا قدیم ترین حصہ ہوتے ہوئے جدید ترین حصہ بھی ہے [۳۵]۔ قدیم ترین اس لیے کہ جہاں تک ہمیں علم ہے اولین ماہر لسانیات وہ تھے جنھوں نے صَرف اور صَرفیات کا مطالعہ کیا اور اس کی مثال سمیری الفاظ کی وہ قدیم ترین فہرست ہے جو میسو پوٹیمیا (Mesopotemia) میں مٹی کی تختیوں پر لکھی ہوئی تھی اور جس کے بارے میں ایک رائے ہے کہ اس کا تعلق تقریباً ایک ہزار چھے سو (۱۶۰۰) سال قبلِ مسیح کے زمانے سے ہے [۳۶]۔ لیکن مارفولوجی کے جدید مطالعات انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں زیادہ رائج ہوئے اس لحاظ سے یہ جدید مطالعات کا بھی حصہ ہے [۳۷]۔

☆ مارفیم کی قسمیں

مارفیم کی دو قسمیں ہوتی ہیں: آزاد مارفیم اور پابند مارفیم۔ ان دونوں کی بھی دو دو قسمیں ہوتی ہیں، اس طرح کُل چار قسمیں ہوگئیں جو یہ ہیں:

مارفیم
(morpheme)

- آزاد مارفیم (free morpheme)
  - کھلا (open)
  - بند (close)
- پابند مارفیم (bound morphemem)
  - تصریفی (inflectional)
  - اشتقاقی (derivational)

ان کی تفصیل ذیل میں پیش ہے۔
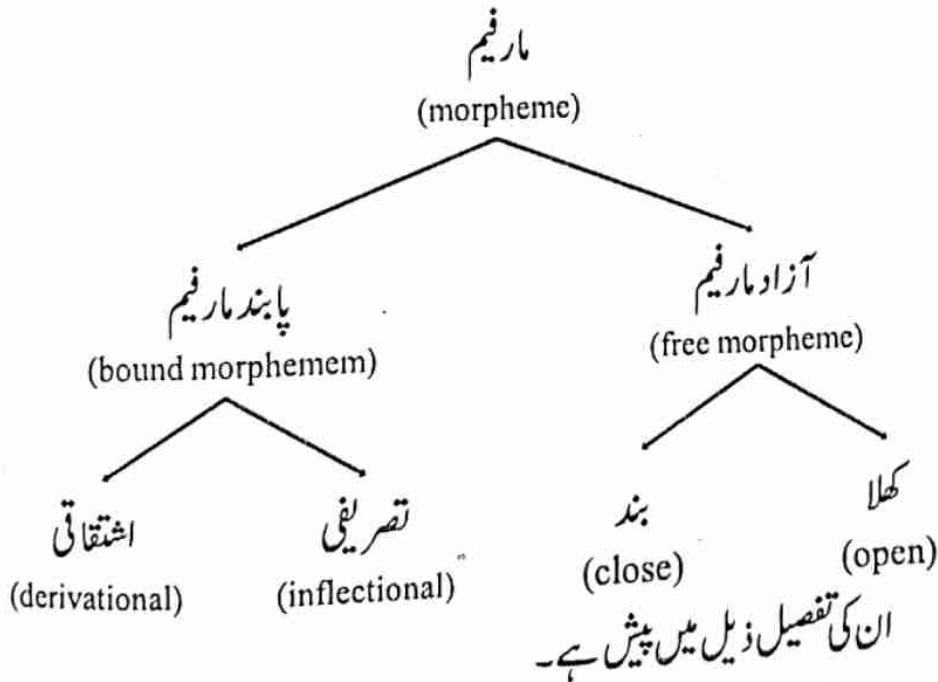
☆ آزاد مارفیم (free morpheme)

کچھ مارفیم ایسے ہوتے ہیں جو اکیلے بامعنی لفظ کی حیثیت سے آسکتے ہیں، مثلاً میز، کتاب، سات، دل، جان، لڈو۔ یہ آزاد ان معنوں میں ہیں کہ تنہا بھی بامعنی ہوتے ہیں اور ایک

لفظ کی حیثیت سے تنہا اور آزادانہ استعمال ہو سکتے ہیں[۳۸]۔

☆ پابند مارفیم (bound morpheme)

جو مارفیم اکیلے بامعنی حیثیت سے نہیں آ سکتے وہ پابند مارفیم کہلاتے ہیں۔ یہ آزاد مارفیم کے برعکس خود کوئی بامعنی لفظ نہیں ہوتے اور انھیں کسی اور مارفیم کے ساتھ ملنا پڑتا ہے۔ مثلاً ''واں''، اکیلا کوئی معنی نہیں دیتا لیکن اگر کسی شمار یا عدد کو ظاہر کرنے والے لفظ (آزاد مارفیم) سے مل جائے مثلاً سات سے، تو ساتواں (سات + واں) کی صورت میں ''واں'' کے کچھ معنی ہوں گے۔ یعنی سات آزاد مارفیم ہے اور واں پابند مارفیم۔

اسی طرح ''ور'' اکیلا کچھ معنی نہیں دیتا لیکن جانور (جان + ور)، سخنور (سخن + ور) اور ہنرور (ہنر + ور) وغیرہ میں ''ور'' معنی دے رہا ہے۔ یہ بھی پابند مارفیم ہے۔ گویا ساتواں اور جانور ایک لفظ ہیں لیکن ان میں دو دو مارفیم ہیں، ایک آزاد اور دوسرا پابند، یعنی سات + واں اور جان + ور[۳۹]۔ سات اور جان آزاد مارفیم ہیں جبکہ ''واں'' اور ''ور'' پابند مارفیم ہیں۔

☆ آزاد مارفیم کی قسمیں

آزاد مارفیم کی دو قسمیں ہیں: کھلا اور بند۔

کھلا مارفیم (open morpheme)

یہ وہ آزاد مارفیم ہے جو بذاتِ خود ایک لفظ ہوتا ہے اکیلا معنی رکھتا ہے اور اس سے کوئی پابند مارفیم مل بھی سکتا ہے۔ یہ بالعموم اسم یا فعل یا صفت ہوتا ہے۔ اسے کھلا اس لیے کہتے ہیں کہ یہ کسی اور سے جڑنے کے لیے آزاد اور کھلا ہے۔ مثلاً لفظ کتاب ایک اسم ہے، یہ آزاد اور کھلا مارفیم ہے اور اس میں ایک اور مارفیم ''یں'' جڑ سکتا ہے یعنی کتابیں (کتاب + یں = کتابیں) بنانا ممکن اور درست ہے[۴۰]۔

اردو میں عام طور پر اسم (noun)، فعل/ مصدر (verb/infinitive) اور صفت (adjective) کھلے مارفیم ہوتے ہیں۔

بند مارفیم (close morpheme)

یہ وہ مارفیم ہوتا ہے جو آزاد تو ہوتا ہے یعنی اکیلا ایک لفظ ہوتا ہے اور اپنے معنی دیتا ہے لیکن اس سے کوئی اور مارفیم جڑ نہیں سکتا۔ یہ عام طور پر حرفِ جار (مثلاً: سے، پر، تک) ہوتا ہے یا حرفِ عطف (مثلاً: اور، و)۔ آپ دیکھیے کہ لفظ ''اور'' (یعنی and کے معنی میں) یا لفظ ''سے'' (یعنی from کے معنی میں) سے کوئی اور لفظ یا حرف یا مارفیم نہیں جڑ سکتا۔ یہ بند مارفیم ہیں۔ اسی طرح لفظ ''کو'' ہے۔ یہ بھی آزاد مارفیم ہے لیکن چونکہ اس کا راستہ ''بند'' ہے لہٰذا یہ آزاد ہوتے ہوئے بھی بند مارفیم ہے[۱۴] یعنی کسی سے جڑ نہیں سکتا۔

اردو میں عام طور پر حروفِ عطف (conjunction) اور حروفِ جار (preposition) بند مارفیم ہوتے ہیں۔ اسی طرح ضمیر (pronoun) (مثلاً میں، تم، وہ) بھی بند مارفیم ہیں۔ علامتِ فاعل ''نے'' اور علامتِ مفعول ''کو'' بھی بند مارفیم ہیں۔ یہ سب بند مارفیم ہیں لیکن یاد رہے کہ یہ آزاد مارفیم کی ایک قسم ہیں۔ گویا خود اکیلے بامعنی ہیں لیکن کسی سے جڑ کر نیا لفظ نہیں بنا سکتے۔

☆ پابند مارفیم کی قسمیں:

پابند مارفیم کی دو قسمیں ہیں: تصریفی اور اشتقاقی۔

تصریفی مارفیم (inflectional morpheme)

تصریفی مارفیم وہ پابند مارفیم ہوتا ہے جو پابند ہونے کی وجہ سے خود اکیلا کوئی معنی نہیں دیتا لیکن کسی آزاد مارفیم کے ساتھ جڑتا ہے اور اس میں تصریفی نوعیت کی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے یعنی کسی مارفیم سے جڑ کر اس کی تعداد (واحد جمع) یا جنس (مذکر مؤنث) یا حالت (case) یا زمانے (tense) میں تبدیلی کر دیتا ہے البتہ قواعدی زمرہ (grammatical category) (اسم، فعل، صفت وغیرہ) نہیں بدلتا۔ جیسے انگریزی میں ed- کو لیجیے۔ یہ پابند مارفیم ہے یعنی خود اکیلا بامعنی لفظ کی حیثیت سے نہیں آسکتا لیکن کسی آزاد مارفیم مثلاً walk کے ساتھ مل کر اسے walked بناتا ہے اور اس میں ماضی کا مفہوم پیدا کر دیتا ہے۔ اگرچہ فعل فعل ہی رہا اور اس کا قواعدی زمرہ

تبدیل نہیں ہوا۔ اسی طرح ایس (s-) کی مثال ہے جو بذاتِ خود اکیلا کوئی بامعنی حیثیت نہیں رکھتا لیکن کسی اسم (noun) مثلاً book سے جڑ کر اسے books یعنی جمع میں ڈھال دیتا ہے۔

• اگرچہ اسم اسم ہی رہتا ہے لیکن اس کی تصریف (inflection) ہو جاتی ہے اور یہ واحد سے جمع بن جاتا ہے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تصریفی مارفیم کسی دوسرے مارفیم سے جڑ کر اس کی قواعدی حیثیت یا قواعدی زمرہ تبدیل نہیں کرتا، اس کے جڑنے سے اسم اسم ہی رہتا ہے لیکن اسم کی تعداد یا جنس بدل جاتی ہے، جیسے ''شیر'' میں ''نی'' کے جڑنے سے شیر کی جنس بدل گئی۔ اسی طرح کتاب ایک مارفیم ہے جو آزاد اور کھلا مارفیم ہے اور اس کے ساتھ ''یں'' جڑتا ہے جو تصریفی مارفیم ہے اور پابند مارفیم ہے۔ کتاب اسم ہے اور ''یں'' کے جڑنے سے اس اسم کی جمع بن گئی، قواعدی زمرہ (grammatical category) نہیں بدلا یعنی اسم اسم ہی رہا لیکن واحد جمع کی شکل میں تبدیلی آ گئی اور اس میں تصریف ہو گئی[۴۲]۔

اردو میں لاحقۂ جمع عام طور تصریفی مارفیم ہوتا ہے، مثلاً:

ے، یں، اں، ان، ہا

اس کی مثالیں:

لڑکے (لڑک + ے)، کتابیں (کتاب + یں)، لڑکیاں (لڑکی + یاں)،

دوستان (دوست + ان)، سالہا (سال + ہا)۔

اسی طرح اردو میں علامتِ تانیث بھی تصریفی مارفیم ہے، مثلاً ی، ن، نی، جیسے:

لڑکی، دھوبن، اونٹنی۔

اشتقاقی مارفیم (derivational morpheme)

یہ پابند مارفیم کی قسم ہے۔ یہ مارفیم خود اکیلے کوئی معنی نہیں رکھتے لیکن آزاد (کھلے) مارفیم سے مل کر اس میں ایسی تبدیلی کرتے ہیں کہ اس کا قواعدی زمرہ (grammatical category) تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ کتاب آزاد اور کھلا مارفیم ہے اور اسم ہے، اس کے

ساتھ ''ی'' لگایا جائے جو پابند اور اشتقاقی مارفیم ہے تو لفظ بنے گا کتابی (کتاب+ی) اور لفظ ''کتابی'' صفت ہے۔ اردو میں اسم کے آخر میں یائے نسبت بڑھانے سے وہ صفت ہو جاتا ہے، مثلاً باپ سے باپی، تعلیم سے تعلیمی (یعنی تعلیم کا، تعلیم سے متعلق یا منسوب)، بھار (یعنی بوجھ یا وزن) سے بھاری (یعنی بوجھل یا وزنی) اور دھن (یعنی دولت) سے دھنی، وغیرہ[۴۳]۔

اسی طرح کتاب سے کتابی۔ ''ی'' نے اسم ''کتاب'' کو صفت بنا دیا۔ اس کا مفہوم تبدیل کر دیا اور اس کا قواعدی زمرہ بھی تبدیل کر دیا۔ پس ''ی'' پابند مارفیم ہے اور اشتقاقی مارفیم ہے کیونکہ لفظ کی قواعدی حیثیت یا قواعدی زمرہ تبدیل کرنا ایک قسم کا اشتقاقی عمل ہے[۴۴]۔

اردو کے اشتقاقی مارفیم کی ایک اور مثال دیکھیے۔ ''نا''، ''انا'' اور ''یانا'' اردو میں پابند مارفیم ہیں یعنی اکیلے کچھ معنی نہیں رکھتے لیکن کسی مارفیم سے مل کر نیا لفظ بنا سکتے ہیں، مثلاً تلاش، وصول اور قبول جیسے الفاظ میں ''نا'' لگا کر ''تلاشنا''، ''وصولنا'' اور ''قبولنا'' جیسے مصادر بنا لیے گئے[۴۵]۔ اردو میں ''انا'' کا لاحقہ (یا مارفیم) اکثر فعل متعدی یا متعدی المتعدی کے لیے آتا ہے مثلاً بھگانا، چِلانا، دکھانا، رُلانا۔ اسی طرح برف سے برفانا، برق سے برقانا۔ حتیٰ کہ انگریزی کے اسم ''فلم'' (film) کے ساتھ ''انا'' لگا کر ہم نے ''فلمانا'' بھی بنا لیا ہے[۴۶]۔ قوم ایک اسم ہے اور اس کے ساتھ ''یانا'' لگانے سے ''قومیانا'' بنا جو ایک مصدر ہے۔ گویا لفظ قوم (اسم) سے مشتق ہو کر ایک نیا لفظ قومیانا (مصدر) بنا، اس طرح ''یانا'' اشتقاقی مارفیم ہے۔

اشتقاقی مارفیم کو اشتقاقی اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے لفظ میں اشتقاق ہوتا ہے یعنی ایک لفظ مشتق ہو کر نئے لفظ بن جاتے ہیں۔ اردو میں کئی سابقے اور لاحقے ایسے ہیں جو اشتقاقی مارفیم ہیں، مثلاً ''اَن''، ''بیچ''، ''تِ''، ''س'' وغیرہ سابقے ہیں اور ''الا''، ''او''، ''ت'' اور ''یا'' وغیرہ لاحقے ہیں۔ یہ مارفیم بھی ہیں۔ ان کا ذکر اگلے باب میں ہوگا۔

حواشی:

۱۔ گیان چند، عام لسانیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص۱۹۲۔
۲۔ مثلاً عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب زبان اور علمِ زبان (حیدرآباد دکن: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۶ء) میں اسے تشکیلیات کا نام دیا ہے۔
۳۔ دیکھیے: توضیحی لسانیات (مترجم عتیق صدیقی)، (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۷۹ء)۔
۴۔ مثلاً عبدالسلام نے عمومی لسانیات (کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء) میں اور اقتدار حسین خان نے اردو صرف ونحو (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۰ء [اشاعتِ سوم]) میں اسے صرفیہ بھی لکھا ہے۔
۵۔ مثلاً نصیر احمد خان نے اردو ساخت کے بنیادی عناصر (دہلی: اردو محل، ۱۹۹۱ء) میں اور سہیل بخاری نے تشریحی لسانیات (کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۸ء) میں اسے مارفیم ہی کہا ہے۔
۶۔ جارج یول (George Yule)، The Study of Language، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء)، ص۷۵ [دوسرا ایڈیشن]۔
۷۔ جارج ڈیوڈ مورلے (G. David Morley)، Syntax in Functional Grammar (لندن: کنٹینیم، ۲۰۰۰ء)، ص۱۵۱۔
۸۔ ایڈرین اکماجین و دیگر (Adrain Akmajian Et al)، Linguistics: An Introduction to Language and Communication، (کیمبرج (میساچوسٹس): ایم آئی ٹی پریس، ۲۰۱۰ء)، دوسرا باب نیز ص۵۹۱۔
۹۔ جارج یول (George Yule)، The Study of Language، محولۂ بالا، ص۷۵۔
۱۰۔ اس کی تفصیلات لسانیات اور مارفولوجی کے موضوع پر لکھی گئی ان مختلف کتابوں سے ماخوذ ہیں جن کا ذکر یہاں حواشی اور کتابیات میں موجود ہے۔ البتہ مثالیں اردو زبان سے دی گئی ہیں اور اردو کی مثالیں بعض صورتوں میں انگریزی کتب میں دی گئی مثالوں سے بوجوہ مختلف ہیں۔
۱۱۔ لیکسیم یا لغویہ کے ضمن میں تفصیلات کے لیے دیکھیے: The Lexeme in Descriptive and Theoretical Morphology اولیور بونامی (Olivier Bonami) کی مرتبہ اس کتاب میں مختلف محققین کے لیکسیم پر تین مقالے شامل ہیں۔ (برلن: لینگویج سائنس پریس، ۲۰۱۸ء)۔
۱۲۔ رونالڈ ڈبلیو لینگکر (Ronlad W. Langacker)، Cognitive Grammar مشمولہ Linguistic Theory and Grammatical Description: Nine Current Approaches (مرتبہ فلپ جی ڈروسٹ و دیگر (Philip G. Droste Et al.))،

(ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۸۷۔

۱۳۔ مثلاً ڈیوڈ کرسٹل نے The Penguin Dictionary of Language (لندن: پینگوین بکس، ۱۹۹۹ء) [دوسرا ایڈیشن] میں یہ نام دیے ہیں، دیکھیے: ص ۱۳۹۔

۱۴۔ ڈیوڈ کرسٹل، The Penguin Dictionary of Language، محولۂ بالا، ص ۱۳۹۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language (میلبرن: تھامسن پبلشنگ، ۲۰۰۵ء)، ص ۷۲ [پانچواں ایڈیشن]

۱۷۔ گیان چند، عام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۱۹۳۔

۱۸۔ جارج ڈیوڈ مورلے، محولہ بالا، ص ۱۵۱۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ایضاً۔ مورلے نے انگریزی کی مثالیں دی ہیں ہم نے انھیں یہاں اردو میں ڈھال لیا ہے۔

۲۲۔ تفصیلات: مارک ارنوف ودیگر (Mark Aronoff Et al)، What is Morphology? (چچیسٹر: ولی بلیک، ۲۰۱۱ء)، پہلا باب [دوسرا ایڈیشن]۔

۲۳۔ پی ایچ میتھیوز (P.H. Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Lingiuistics (نیویارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۷ء)، ۲۳۲، ۱۴؛ نیز ڈیوڈ کرسٹل، The Penguin Dictionary of Language (David Crystal)، محولۂ بالا، ص ۲۲۳۔

۲۴۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر، محولۂ بالا، ص ۲۵۰۔۲۴۵

۲۵۔ گیان چند، عام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۱۹۳۔

۲۶۔ جارج یول، The Study of Language، محولۂ بالا، ص ۷۹۔

۲۷۔ ایضاً، نیز وکٹوریا فرامکن ودیگر، محولہ بالا، ص ۲۵۰۔۲۴۵

۲۸۔ عام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۱۹۳۔

۲۹۔ مارک ارنوف ودیگر، (Mark Aronoff Et al)، What is Morphology?، محولۂ بالا، ص ۱۔

۳۰۔ ایضاً۔

۳۱۔ مارٹن ہسپلمتھ ودیگر (Martin Haspelmath Et al)، Understanding Morphology (لندن: روٹلج، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۔

۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ ایضاً۔
۳۴۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، محولۂ بالا، ص ۶۶؛ نیز مارک ارنوف و دیگر، ص ۱۔
۳۵۔ مارک ارنوف و دیگر، محولۂ بالا، ص ۳۔۱
۳۶۔ ایضاً، ص ۱۔
۳۷۔ ایضاً۔
۳۸۔ اس کی تفصیل مختلف کتابوں سے ماخوذ ہے جن میں سے کچھ کا حوالہ اوپر آ چکا ہے نیز فرانسس کٹمبا Francis Katamba کی کتاب Morphology: Palgrave Modern Linguistics (لندن: میکملن، ۲۰۱۹ء)[دوسرا ایڈیشن] میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے، ص ۵۲۔۴۸۔
۳۹۔ ایضاً۔
۴۰۔ ایضاً۔
۴۱۔ ایضاً۔
۴۲۔ ایضاً۔
۴۳۔ شوکت سبزواری، اردو لسانیات (کراچی: مکتبۂ تخلیق ادب، ۱۹۶۶ء) ص ۱۶۳۔
۴۴۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، محولۂ بالا، ص ۴۳۔
۴۵۔ شان الحق حقی، لسانی مسائل و لطائف (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۷۔۲۶
۴۶۔ ایضاً، ص ۵۵۔
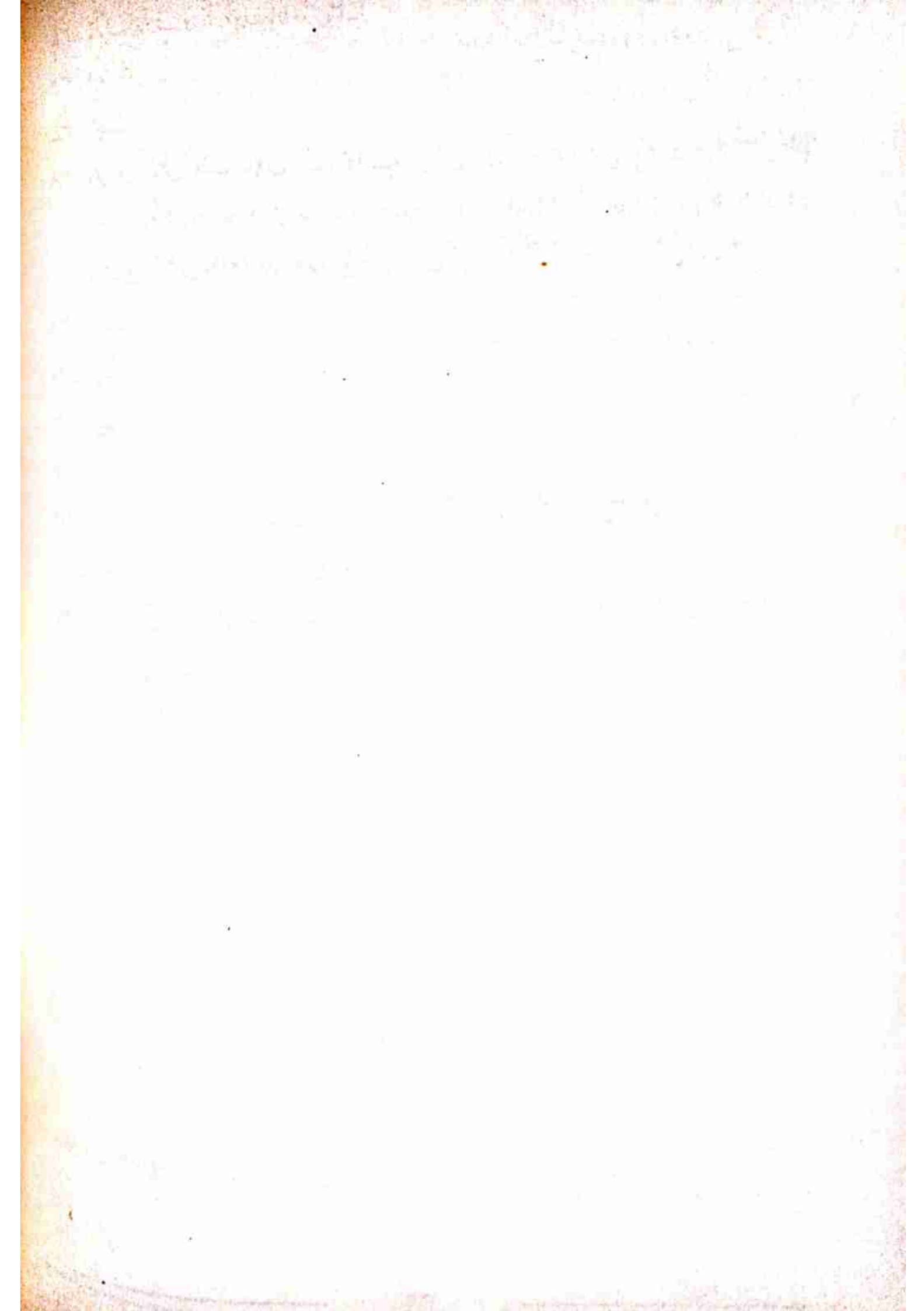
چوتھا باب: مارفیمیات (۲)

تعلیقیہ، مادّہ، ساق اور اردو کے مارفیم

مارفیم اور اس کی قسموں کا مطالعہ ہم نے پچھلے باب میں کیا۔ اس مطالعے کی بنیاد پر اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اردو لفظوں اور مارفیموں کی ساخت میں مادّے، ساق اور تعلیقیوں کا کیا حصہ ہوتا ہے۔

☆ تعلیقیہ (affix)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ''تعلیقیہ'' (affix) ایک ایسا مارفیم ہوتا ہے جو کسی دوسرے مارفیم یا لفظ سے ''تعلق'' جوڑتا ہے۔ اس آکر جڑنے والے مارفیم کی عام اور سادہ سی مثال کوئی سابقہ یا لاحقہ ہوسکتا ہے جو اردو میں بھی بہت عام ہے۔ مثلاً ''باک'' اردو میں ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں ڈر، اندیشہ، فکر، شرم۔ اس میں ''بے'' کا سابقہ جوڑیں تو ''بے باک'' بنے گا۔ بے باک کے آخر میں ''ی'' کا لاحقہ جوڑیں تو ''بے باکی'' بنے گا۔ یہاں ''بے'' اور ''ی'' تعلیقیے (affixes) ہیں اور مارفیم بھی ہیں (تعلیقیے کو اردو کی بعض کتابوں میں چسپیے بھی کہا گیا ہے، بہرحال تعلیقیہ اور چسپیہ دونوں affix ہی کے معنی میں ہیں)۔ لفظ بے باکی میں ''بے'' سابقہ ہے اور ''ی'' لاحقہ۔

تعلیقیے کی تعریف یوں کی گئی ہے: تعلیقیہ (affix) وہ بامعنی جزو ہوتا ہے جو کسی لفظ کے مادّے (root) سے جڑا ہوتا ہے اور تعلیقے کے جڑنے سے وہ لفظ پیچیدہ شکل اختیار کرلیتا ہے[۱]۔ لیکن تعلیقیے کا خود بامعنی لفظ ہونا ضروری نہیں ہے، یہ لفظ یا لفظ سے چھوٹی کوئی بامعنی اکائی یعنی مارفیم بھی ہوسکتا ہے، مثلاً ''اَٹل'' (یعنی جو نہ ٹلے) میں ''ٹل'' ایک لفظ ہے اور مارفیم بھی۔ ''اَ'' یہاں ایک

مارفیم ہے اور سابقہ ہے۔اس طرح لفظ ''اَٹل'' میں دو مارفیم ہیں، پہلا ''اَ'' اشتقاقی مارفیم ہے (جو پابند مارفیم کی ایک قسم ہے) اور دوسرا ''ٹل'' ایک کھلا مارفیم ہے (جو اصل میں آزاد مارفیم کی ایک قسم ہے)۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تعلیقیہ چونکہ ایک طرح کا مارفیم ہوتا ہے لہٰذا اس کا خود لفظ ہونا یا الگ سے اپنے مستقل معنی رکھنا ضروری نہیں ہے۔ تعلیقیہ کسی بھی لفظ یا اس کے مادّے یا کسی مارفیم سے جڑ کر اس کے معنی بدل دیتا ہے۔

تعلیقیوں کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کو کسی مارفیم کے آگے، پیچھے یا درمیان میں لگا کر نئے الفاظ اور تراکیب بنائی جاسکتی ہیں اور اس طرح کی لفظ سازی سے ہزاروں نئے الفاظ و تراکیب وضع کی جاسکتی ہیں۔

☆ تعلیقیوں کی قسمیں

تعلیقیوں کی متعدد قسمیں ہیں لیکن یہاں صرف تین کا ذکر ہوگا، جو یہ ہیں: سابقہ، لاحقہ اور وسطانیہ۔ان کا مختصر تعارف پیش ہے:

(الف) سابقہ (prefix)

سابقہ وہ تعلیقیہ یا جزو ہوتا ہے جو کسی لفظ کے مادّے (root) کے آغاز میں جڑتا ہے[2]۔ اردو میں سابقوں کی خاصی تعداد ہے اور ان میں سے کچھ فارسی اور عربی سے بھی آئے ہیں۔ان کی تفصیل وحید الدین سلیم نے دی ہے[3] اور ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔اَن (نفی کے لیے):

اَن جان (انجان)، ان دیکھا، ان گھڑ (ناتراشیدہ، بے ڈول)، اَن گِنا (جو شمار نہ کیا جائے)، ان ہونی (انہونی)۔

۲۔پچ (پانچ کا مخفف):

پچ رنگا (پانچ رنگوں کا، اس کے آخر میں ''الف'' لاحقہ ہے)، پچ لونا (چورن جس میں پانچ نمک پڑتے ہیں)، پچ ہتا (پانچ ہاتھ کا، جوان یا تنومند کو بھی کہتے ہیں)، پچ کلیان (گھوڑا جس کے چاروں پاؤں اور ماتھا

سفید ہو)، پچ لڑا (ہار جس میں پانچ لڑیاں ہوں)۔

۳۔تِ (تین کا مخفف):

تِپائی (چھوٹی میز جس کے تین پاؤں ہوں)، تِباسی (تواسی بھی کہتے ہیں، تین دن کی باسی چیز)، تِراہا (جہاں تین راستے ملتے ہوں)۔

۴۔سِ/سَ/سُ (بمعنی اچھا):

سِڈول (اچھے ڈول کا، متناسب جسم کا)، سَپوت (اچھا یا فرماں بردار بیٹا)، سُہاگ (سُ + بھاگ بمعنی قسمت؛ لفظاً: خوش نصیبی)۔

۵۔سم (بمعنی پورا):

سمبندھ (رشتہ یا ملاپ)، سمدھن (جس سے پورا رشتہ ہو، لڑکے یا لڑکی کی ساس؛ اصل میں سم بندھن)، سمدھیانہ۔

(ب) لاحقہ (suffix)

لاحقہ وہ تعلیقیہ یا جزو ہوتا ہے جو کسی لفظ کے مادّے کے بعد جڑتا ہے[۴]۔ اردو میں لاحقوں کی بڑی تعداد موجود ہے اور ان کی تفصیل وحیدالدین سلیم نے دی ہے[۵]۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔الا (وصفیت کے لیے):

پنیالا (پانی والا، سالن وغیرہ جو پانی زیادہ پڑنے سے پھیکا ہو جائے، پن یہاں پانی کی تخفیف ہے)، مٹیالا (مٹی والا، مٹی کے رنگ کا، بھورا، مٹی سے اٹا ہوا)، کوڑیالا (کوڑی والا، سانپ جس کی کھال پر سفید چتیاں بنی ہوتی ہیں)۔

۲۔انی (لاحقۂ تانیث):

نوکرانی، مغلانی، مہترانی، جیٹھانی، دیورانی۔

۳۔ اؤ' (لاحقۂ صفیت و قابلیت):

ڈباؤ' (جیسے ہاتھی ڈباؤ یعنی پانی جس میں ہاتھی ڈوب جائے)، بکاؤ' (جیسے بکاؤ مال یعنی وہ مال جو بِک سکے)، اُٹھاؤ' (جیسے اٹھاؤ چولھا یعنی چولھا جو اٹھایا جا سکے، نیز وہ شخص جو کہیں جم کر نہ رہے اور ٹھکانے بدلے)، چلاؤ' (چلانے کے قابل، جیسے کام چلاؤ' یعنی جو گزارے کے لائق ہو، بہت اچھا نہ ہو اور جس سے محض کام چلے)۔

۴۔ ت (لاحقہ برائے حاصلِ مصدر):

بچت (بچنا سے)، کھپت (کھپنا سے)، لکھت (لکھنا سے)، پڑھت (پڑھنا سے)، لاگت (لگنا سے)، رنگت (رنگنا سے)۔

۵۔ یا/ یا (لاحقۂ تصغیر، کبھی تحقیر کے لیے اور کبھی پیار کے اظہار کے لیے بھی آتا ہے):

بھیّا (بھائی سے، یعنی چھوٹا بھائی)، بِٹیا (بیٹی سے، چھوٹی بیٹی)، لُٹیا (لوٹا سے)، گیّا (گاے سے)، کھٹیا (کھاٹ سے)، نیّا (ناو سے)، میّا (ماں سے)، چُٹیا (چوٹی سے)، بغیا (باغ سے، یعنی چھوٹا باغ)، امبیا (امب یعنی آم سے، چھوٹا آم، کیری)۔

(ج) وسطانیہ (infix)

سابقہ (prefix) مارفیم ہوتا ہے اور لاحقہ (suffix) بھی مارفیم ہے۔ سابقوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ یہ لفظ سے پہلے لگتے ہیں اور لاحقے لفظ کے بعد میں۔ لیکن بعض زبانوں میں ایسے مارفیم بھی پائے جاتے ہیں جو کسی لفظ کے درمیان میں داخل ہو کر لفظ کے معنی بدل دیتے ہیں۔ ایسے مارفیم کو وسطیہ یا وسطانیہ (infix) کہتے ہیں۔ سابقوں اور لاحقوں کی طرح وسطانیہ بھی لفظ سازی کا ایک طریقہ ہے۔

وسطانیہ (infix) وہ تعلیقیہ ہے جو کسی مادّے (root) کے وسط میں جوڑا جائے[۶]۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وسطانیہ ایک مارفیم ہوتا ہے جو کسی مارفیم کے بیچ میں داخل کیا جاتا ہے[7]۔ وسطانیے کی مثالیں عربی، لاطینی اور بعض دیگر زبانوں میں ملتی ہیں[8]۔ وسطانیے سامی زبانوں میں عام ہیں لیکن ہند یورپی میں ان کا رواج نہیں[9]۔ مثلاً عربی (جو سامی خاندان کی زبان ہے) میں لفظ کے مادّے کے وسط میں کچھ حروف داخل کر دیے جاتے ہیں اور اس کی مثال مادّہ ''ع۔ل۔م'' ہے جس سے لفظ علم بھی بنتا ہے اور جس کے وسط میں مثلاً الف داخل کر کے ''ع۔ا۔ل۔م'' (عالم) بنایا جا سکتا ہے۔ ع۔ل۔م کے بیچ میں لام اور الف داخل کریں تو ع۔ل۔ل۔ا۔م (علاّم) اور صرف ''ی'' داخل کریں تو ''علیم'' بنے گا۔

لیکن خالص اردو میں اس کی مثالیں بہت کم ہیں اور جو ہیں انھیں صحیح معنوں میں وسطانیہ نہیں قرار دے سکتے۔ اس کی وضاحت گیان چند نے کی ہے[10]۔ انگریزی میں وسطانیوں کی تعداد بہت کم ہے اور یہ عموماً فحش الفاظ ہوتے ہیں (اور یہ کبھی ذرا سے بدلے ہوئے تلفظ/ املا میں ہوتے ہیں) جو کسی لفظ کے درمیان ڈال دیے جاتے ہیں[11]۔

البتہ عربی کی طرح اگر فارسی سے ان الفاظ کی مثالیں لی جائیں جو اردو میں رائج ہیں تو مثلاً ''م'' اور ''ن'' وسطانیے ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں فارسی میں حرفِ نفی کے طور پر کسی ترکیب کے درمیان میں آتے ہیں، جیسے:

خدانخواستہ	(خدا+ن+خواستہ)	(تین مارفیم)
کسمپرسی	(کَس+مَ+پُرس+ی)	(چار مارفیم)

☆ مادّہ (root)

تعلیقیوں کے بعد مادّے اور ساق کو سمجھنا ضروری ہے تاکہ مارفیمیاتی مباحث اور مارفیمی تجزیے کو سمجھا جا سکے۔

مادّہ یا root اصل میں کسی لفظ کی جڑ یا اس کی بنیاد ہوتی ہے جس میں بعد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے (گویا مادّے (root) میں سے تنا نکلتا ہے جسے ساق یا stem کہتے ہیں)۔ اردو میں اُس لسانیاتی اصطلاح کو عام طور پر ''مادّہ'' کہا گیا جسے انگریزی میں root کہتے ہیں۔ البتہ

گیان چند نے اسے ''اصل'' کا نام دیا ہے[۱۲]۔ لیکن مادّہ کی اصطلاح اب اردو میں رائج ہو چکی ہے لہٰذا اسے بلا وجہ بدلنا مناسب نہیں ہے اور ہم اسے مادّہ ہی کہیں گے۔

کسی لفظ سے تمام تعلیقیے (لاحقے اور سابقے) ہٹا لینے کے بعد جو بچتا ہے اسے مادّہ (root) کہتے ہیں[۱۳]۔ مادّے کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ مادّے (root) سے مراد ہے کسی لفظ یا مارفیم کا وہ حصہ جس سے لفظ نکلتے ہیں مگر وہ خود کسی لفظ سے نہیں نکلا ہوتا[۱۴]۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ کسی لفظ کا وہ حصہ جسے مزید مارفیموں یا بامعنی اجزا میں تقسیم نہ کیا جا سکے، اُس لفظ کا مادّہ (root) ہوتا ہے[۱۵]۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ مادّہ (root) بطور لفظ اکیلا بھی آ سکے، مثلاً انگریزی کے دو لفظ painter اور conceive لیجیے۔ painter میں paint مادّہ ہے اور er- تعلیقیہ ہے (اور لاحقہ ہے اور مارفیم بھی ہے)، جبکہ conceive میں ceive مادّہ ہے اور con تعلیقیہ ہے (اور سابقہ ہے اور مارفیم بھی ہے)۔ paint تو بطور لفظ اکیلا آ سکتا ہے لیکن ceive نہیں آ سکتا۔ حالانکہ paint اور ceive دونوں مادّے (roots) ہیں[۱۶]۔ یہی ceive ہمیں انگریزی کے دوسرے الفاظ میں بھی نظر آتا ہے مثلاً deceive اور receive میں، اگرچہ یہ الگ سے پہچانا تو جاتا ہے لیکن اس کے معنی کو الگ سے شناخت نہیں کیا جا سکتا اور اسے مزید تقسیم بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ مارفیم ہے[۱۷]۔

ڈاکٹر عبدالسلام نے ceive کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مارفیم نہیں ہے کیونکہ ''یہ کوئی معنی ادا نہیں کرتا''[۱۸]۔ لیکن اکماجین کے مطابق یہ مارفیم ہے اگرچہ اس کو الگ سے کسی معنی کے طور پر شناخت نہیں کیا جا سکتا[۱۹]۔ کیونکہ یہ بہر حال کسی اور مارفیم سے جڑ کر اس کے معنی کو تبدیل کر دیتا ہے۔

اردو میں اس کی ایک مثال لڑکا، لڑکی، لڑکے، لڑکوں، لڑکیاں، لڑکیوں اور لڑکپن جیسے الفاظ ہیں جن میں مادّہ ''لڑک'' ہے اور ''ا'' یا ''ی'' کے اضافے سے ساق (stem) بنے گا اور اس میں مزید اضافہ ہو سکے گا۔ مثلاً:

ساق	=	مارفیم	+	مادّہ
لڑکا	=	ا	+	لڑک
لڑکی	=	ی	+	لڑک
لڑکپن	=	پن	+	لڑک

ان سب الفاظ میں مادّہ (root) ''لڑک'' ہے۔یعنی ''لڑک'' کے بعد مختلف لاحقے (مثلاً ا، ی، ے، وں، یاں، یوں اور پن) لگا کر مختلف الفاظ بنائے جاسکتے ہیں مثلاً لڑکوں، لڑکیاں، لڑکیوں، وغیرہ۔حالانکہ ceive کی طرح اکیلا ''لڑک'' بھی بامعنی جزو کی طرح سے نہیں آتا لیکن ''ا'' اور ''ی'' اور ''پن'' وغیرہ کے تعلیقیوں کے ساتھ مل کر لفظ کے معنی بدلتا ہے، پس ''لڑک'' بھی مارفیم ہے اور مادّہ (root) ہے (اور ceive بھی مادّہ ہے اور مارفیم ہے)۔

اردو میں مادّے (root) کی ایک مثال گیان چند جین نے دی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ لفظ انسان میں ''اِنس'' مادّہ ہے۔اس میں ''ان'' کا لاحقہ (تعلیقیہ) لگا اور یہ ''انسان'' بن گیا ہے (اگرچہ گیان چند کی کتاب میں کاتب نے یہاں root کو غلطی سے stem لکھ دیا ہے لیکن آگے کے جملوں سے وضاحت ہو جاتی ہے)[20]۔

انگریزی کے مارفیموں کی کثیر تعداد مادّوں پر مشتمل ہے اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے[21]۔البتہ مادّوں کے مقابلے میں تعلیقیوں (سابقوں اور لاحقوں) کی تعداد ہر زبان میں بہت کم ہوتی ہے[22]۔

☆ ساق (stem)

آسان لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ مادّہ (root) اصل میں کسی لفظ کی جڑ ہے اور اس جڑ میں جب کچھ اضافہ ہو جاتا ہے تو اسے تنا کہنا چاہیے اور اصطلاح میں اس تنے کا نام ساق (stem) ہے۔عربی میں ساق کا مطلب ہے ڈنٹھل یا تنا اور انگریزی میں stem کے بھی یہی معنی ہیں۔گویا مادّے یا جڑ میں سے ساق یا تنا نکلتا ہے۔

ساق کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ جب کوئی مادّہ (root) کسی تعلیقیے (affix) سے جڑ جاتا ہے تو حاصل ہونے والا لفظ ساق (stem) کہلاتا ہے[۲۳]۔ اس بات کو یوں بھی کہا گیا کہ ساق ایک ایسی ساخت ہے جس میں کسی تعلیقیے کے جڑنے سے نیا لفظ یا نئے الفاظ بنائے جاتے ہیں[۲۴]۔ یعنی ساق ایسا مارفیم یا مارفیموں کا مجموعہ ہے جس میں کوئی تعلیقیہ جوڑا جا سکے[۲۵]۔

ہم نے اوپر گیان چند کی کتاب سے مثال دیتے ہوئے لفظ انسان میں ''انس'' کو مادّہ کہا ہے۔ اس میں ''ان'' کے اضافے سے جب ''انسان'' بنا تو اب ''انسان'' ساق (stem) ہو گیا اور اس میں ایک اور لاحقہ ''ی'' لگا کر ''انسانی'' بنایا گیا۔ اب ''انسانی'' خود ایک ساق ہو گیا اور اس میں ''یت'' کے اضافے سے ''انسانیت'' کا لفظ بنا۔ گویا مادّہ ایک ہی رہتا ہے اور ساق بدلتے جاتے ہیں۔ انسان، انسانی اور انسانیت میں ساق (stem) تو بدل رہا ہے لیکن مادّہ (root) یعنی ''انس'' وہی ہے۔ گویا جڑ تو وہی ہے بس تنے سے شاخیں پھوٹ رہی ہیں اور ہم یہاں سہولت کے لیے نئی شاخ ہی کو تنا (stem) کہہ دیتے ہیں (جس سے پھر نیا لفظ پھوٹتا ہے)۔ واضح رہے کہ لفظ انسانیت میں ''ی'' پر تشدید ہے اور اس لفظ کا درست تلفظ یائے مشدد بفتحہ ہے (یعنی ''ی'' پر تشدید ہے زبر کے ساتھ)۔ گو عام بول چال میں غیر مشدد یعنی ایک ہی ''ی'' کے ساتھ مستعمل ہے (یعنی انسانیّت کی بجائے انسانیت بولا جاتا ہے)، لہٰذا لفظ ''انسانی'' کو ساق مانا جائے گا اور ''یت'' لاحقہ۔ گویا دونوں ''ی'' برقرار رہیں گی۔

☆ اردو میں ساق کی مثال

ایک دو مثالیں اردو کی ہم اوپر دے آئے ہیں یعنی ''لڑک'' مادّہ یا جڑ ہے اور اس سے جو ساق یا تنے نکلے ہیں وہ لڑکا، لڑکی اور لڑکپن وغیرہ کی صورت میں ہیں۔ اسی طرح سطورِ بالا میں ''انس'' کی مثال بھی آئی کہ یہ جڑ یا مادّہ ہے اور ''انسان'' ساق ہے جس سے مزید ساق بنائے جاسکتے ہیں اور ان ساقوں میں تعلیقیے جوڑے جاسکتے ہیں۔

ایک اور مثال اردو سے دیکھیے۔ ''چُھونا'' اردو میں ایک مصدر ہے اور اس کا فعلِ امر

''چُھو'' ہے۔اس سے لفظ بنا ''چُھوت'' بمعنی لمس یا مس۔ ناپاک اور ناپاکی کو بھی ''چھوت'' کہتے ہیں اور چھونے سے لگنے والی بیماری کو بھی۔ یہاں ''چُھو'' مادّہ ہے اور ''ت'' لاحقہ ہے۔اب ''چھوت'' ایک ساق ہے اس میں ایک سابقے ''اَ'' کا اضافہ کیجیے۔لفظ بنا ''اَچُھوت'' یعنی جسے چُھوا نہ جاسکے، نجس یا ناپاک جسے لوگ پاس نہ بٹھائیں اور اسی لیے شودر کو اچھوت کہنے لگے۔اب ''اچھوت'' ایک ساق ہے اور اس میں ایک اور مارفیم یا لاحقے ''ا'' کا اضافہ کیجیے۔لفظ بنا ''اچھوتا'' یعنی جسے چُھوا نہ گیا ہو، پاک، جو آلودہ نہ ہو، انوکھا یا کنوارہ کے معنوں میں بھی آتا ہے، نذر و نیاز کے کھانے کو بھی اچھوتا کہتے ہیں کیونکہ اسے بغیر طہارت کے نہیں چھوتے۔ اسی کی تانیث ''اچھوتی'' ہے۔

''بو'' ایک مادّہ ہے۔ ''خوش'' کا سابقہ لگنے سے خوشبو ساق بن گیا اور اس میں دار کا لاحقہ لگایا جاسکتا ہے اور اس طرح ''خوشبودار'' بنتا ہے جس میں تین مارفیم ہیں۔ان تین مارفیموں میں سے بو مادّہ ہے، خوش تعلیقیہ (سابقہ) ہے اور دار بھی تعلیقیہ (لاحقہ) ہے۔اس طرح کی کئی مثالیں ہیں۔

☆ مارفیم اور صرفی تبدیلیاں

لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہر زبان کی مارفیمیات اپنی منفرد خصوصیات کی حامل ہوتی ہے اور ان خصوصیات کا دار و مدار اس زبان کی صَرف اور نحو پر ہوتا ہے۔ضروری نہیں کہ اگر کسی زبان میں کوئی مارفیم کسی مخصوص شکل یا خاص املے کی صورت میں آتا ہے تو کسی دوسری زبان میں اس کے ہم معنی یا مترادف لفظ یا مارفیم کی بھی وہی حیثیت ہو اور اس میں صرفی یا املائی نوعیت کی تبدیلیاں بھی ویسی ہی ہوں کیونکہ ہر زبان کی اپنی صرفی اور نحوی ساخت ہوتی ہے جو کسی لفظ میں کسی خاص صرفی تبدیلی کی اجازت دیتی ہے یا نہیں دیتی۔مثال کے طور پر انگریزی کے لفظ boy یا girl کو لیجیے۔ یہ دونوں آزاد مارفیم ہیں۔ان کی جمع اور ان کے ساتھ مرکبِ توصیفی بنانے کے لیے انگریزی کے good میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی لیکن اس کے برعکس اردو میں جنس اور تعداد کے لحاظ

سے لفظ ''گڈ'' کے اردو ترجمے یعنی ''اچھا'' میں صرفی تبدیلی ہوگی:

اچھا لڑکا	good boy
اچھے لڑکے	good boys
اچھی لڑکی	good girl
اچھی لڑکیاں	good girls

یہ دیکھیے کہ اردو میں صفت (adjective) ''اچھا'' کی تین شکلیں ان چار مرکبات میں آئیں، یعنی اچھا، اچھے اور اچھی۔ گویا ''اچھ'' میں ''ا''، ''ے'' اور ''ی'' کا اضافہ ہوا۔ لیکن انگریزی میں صرف ایک ہی شکل یعنی good سے کام چل گیا۔ گویا اردو میں صفت کی بھی جمع ہوتی ہے مگر صرف مذکر کی حالت میں اور اردو میں اگر صفت تانیث کی حالت میں جمع میں ہے تب بھی اس کے لیے واحد ہی کی شکل استعمال ہوگی، یعنی ''اچھی'' لڑکی اور ''اچھی'' لڑکیاں، جبکہ اصولاً ''اچھیاں لڑکیاں'' ہونا چاہیے (لیکن یہ بات ازراہِ تفنن ہی کہی گئی ہے)۔

اب صفت کی بجائے اسم (noun) اور اس کی جمع کو دیکھیے:

انگریزی میں boy اور girl کی جمع بنانے کے لیے ان کے ساتھ ایک پابند مارفیم یعنی ایس (s) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں ایک ہی حرف کے ذریعے صرفی تبدیلی کی بجائے جنس اور تعداد کے لحاظ سے الگ الگ صرفی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور لڑکے، لڑکوں، لڑکیاں، لڑکیوں آسکتا ہے، مثلاً:

لڑکے آئے۔	Boys came.
لڑکوں نے ایک شیر دیکھا۔	Boys saw a lion.
لڑکیاں آئیں۔	Girls came.
لڑکیوں نے ایک شیر دیکھا۔	Girls saw a lion.

ان جملوں میں انگریزی میں girl اور boy کی جمع ایک ہی صورت یعنی ایس (s) کے ساتھ ہوگی جبکہ اردو میں تعداد اور جنس کے لحاظ سے ''ے''، ''وں''، ''یاں'' یا ''یوں'' لکھنا پڑے گا۔

☆ زبانوں کی نوعیاتی گروہ بندی اور تعلیقیے

تعلیقیہ (affix) اس لحاظ سے زبان میں بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے نئے لفظ بھی بنائے جاسکتے ہیں اور یہ ساق سازی میں بھی کام آتے ہیں۔

تعلیقیوں کی کئی قسمیں ہیں اور ان میں سے بعض اردو میں استعمال ہوتی ہیں اور بعض کا وجود نہیں ہے کیونکہ تعلیقیوں کا گہرا تعلق زبان کی صرفی ونحوی ساخت پر ہوتا ہے۔ زبان کی قسمیات یا نوعیات یا نوعیاتی گروہ بندی (typology) میں ایک طریقہ صرف ونحو کی بنیاد پر زبانوں کی گروہ بندی ہے۔ اس میں زبانوں کو ساخت کے اعتبار سے تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس کا مختصر ذکر یہاں ضروری ہے تا کہ مارفیموں اور تعلیقیوں (سابقے ولاحقے وغیرہ) کو سمجھا جاسکے۔

یاد رہے کہ یہ تقسیم زبانوں میں موجود غالب عناصر کی بنیاد پر کی گئی ہے ورنہ بیشتر زبانوں میں ایک سے زیادہ خصائص پائے جاتے ہیں [۲۶] اور ایک گروہ کی خصوصیات دوسرے گروہ میں بکثرت مل جاتی ہیں [۲۷]۔ بلکہ اس ضمن میں کچھ اختلافات بھی پائے جاتے ہیں اور بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ تاریخی لسانیاتی مطالعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض زبانیں اور زبانوں کے خاندان ایک نوعی گروہ سے نکل کر دوسرے گروہ میں چلے گئے ہیں [۲۸]۔ لیکن ان مباحث سے قطع نظر ہم یہاں زبانوں کی نوعیاتی گروہ بندی کو لفظ سازی کے تناظر میں دیکھیں گے۔

☆ غیر ترکیبی زبان (isolating language)

اس زبان کے دوسرے نام analytic language اور root language بھی ہیں۔ غیر ترکیبی زبان وہ زبان ہوتی ہے جس میں پابند مارفیم (bound morphes) نہیں ہوتے یا شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں [۲۹]، مثلاً انگریزی کے er- جیسے پابند مارفیم جو الفاظ کے آخر میں جڑ کر لفظ بناتے ہیں اس طرح کی لفظ سازی غیر ترکیبی زبانوں میں نہیں ہوتی [۳۰]۔ غیر ترکیبی

زبان میں تصریف (inflection) اور اشتقاق (derivation) نہیں ہوتے [۳۱] اس میں ہر لفظ اپنی جگہ مکمل اور جامد ہوتا ہے [۳۲]۔ گویا غیر ترکیبی زبان میں الفاظ میں تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے نحوی تعلق واضح ہوتا ہے [۳۳]۔

ویت نامی زبان اور چینی زبان اسی گروہ میں شامل ہیں [۳۴]۔ ایسی زبانوں کے مارفیموں میں دوسرے مارفیم نہیں جڑتے۔

☆ امتزاجی زبان (agglutinating language)

اس کو agglutinative language بھی کہا جاتا ہے اور اس کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں الفاظ آپس میں چپک جاتے ہیں کیونکہ agglutinate کا مطلب ہے آپس میں چسپاں ہو جانا یا باہم گتھ جانا۔ یہ غیر ترکیبی زبان کی ضد ہوتی ہے اور اس میں الفاظ کئی مارفیموں کے آپس میں ملنے سے بنتے ہیں [۳۵]۔ اس کی مثال ترکی زبان اور ہنگری کی زبان یعنی ہنگروی (Hungarian) ہیں [۳۶]۔ ان زبانوں میں مارفیم ایک دوسرے سے جڑتے چلے جاتے ہیں اور ایک طویل اور پیچیدہ لفظ بھی بنا سکتے ہیں جو کئی مارفیموں پر مشتمل ہو سکتا ہے [۳۷]۔ امتزاجی زبانوں کے ایک لفظ میں کئی سابقے اور لاحقے جڑے ہوئے ہو سکتے ہیں مگر ان کو الگ الگ شناخت کیا جا سکتا ہے [۳۸]۔

☆ تصریفی زبان (inflecting language)

اس کے دوسرے نام بھی ہیں اور وہ ہیں ترکیبی زبان (synthetic language) اور ادغامی یا اتصالی زبان (fusional language)۔ ان زبانوں میں لفظ ایک سے زیادہ مارفیموں سے مل کر بن سکتا ہے۔ تصریفی زبانوں میں لفظوں کی اندرونی ساخت میں تبدیلیاں ہوتی ہیں اور یہ تبدیلیاں بالعموم لفظوں کے اختتام پر ہوتی ہیں [۳۹]۔ گیان چند کے مطابق تصریفی زبانوں کے تعلیقیے یا چسپیے (affixes) مختصر اور ''کم حیثیت'' ہوتے ہیں اور ان کے علیحدہ سے کوئی مستقل معنی نہیں ہوتے لیکن وہ لفظ کے مادّے (root) میں مدغم ہو کر اس کا جزوِ لاینفک بن جاتے

ہیں [۴۰]۔ ہند یورپی، سامی اور حامی خاندان کی زبانیں تصریفی زبانوں کے ذیل میں آتی ہیں [۴۱]۔ لاطینی، یونانی اور عربی زبانیں تصریفی زبانوں کی مثالیں ہیں [۴۲]۔ اس کے علاوہ سنسکرت بھی اس کی مثال ہے۔ اسی لیے سنسکرت سے نکلی ہوئی زبانیں مثلاً اردو اور ہندی بھی تصریفی زبانیں ہیں [۴۳]۔

گیان چند نے تصریفی زبانوں کی مزید تقسیم اس طرح کی ہے:

دروں تصریفی: اس میں تصریف کا عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس میں مادّے (root) میں تصریف کی جاتی ہے اور اس کا ذریعہ وسطانیہ (infix) ہے یعنی مادّے کے بیچ میں کچھ حروف داخل کیے جاتے ہیں۔ اس کی مثال سامی خاندان کی زبان عربی ہے جس میں مادّے مثلاً ق۔ت۔ل (قتل) میں وسطانیے کے ذریعے تصریف ہوتی ہے اور مثلاً قاتل، مقتول اور قتیل جیسے لفظ بنائے جاتے ہیں [۴۴]۔

بروں تصریفی: گیان چند کے مطابق اس میں تصریف کا عمل بالعموم خارجی ہوتا ہے اور یہ ہند یورپی خاندان کی زبانوں میں ہوتا ہے نیز یہ کہ اس میں تعلیقیوں میں سے بیشتر لاحقے کام آتے ہیں، مثلاً:

لڑکا، لڑکے، لڑکوں، لڑکی، لڑکیوں

اچھا، اچھی، اچھے [۴۵]

بروں تصریفی میں سابقے بھی استعمال ہوتے ہیں مگر تصریف (inflection) میں لاحقے ہی کام آتے ہیں۔ اس میں سابقے مثلاً بے (جان)، غیر (جانب دار) اور ذی (روح) وغیرہ استعمال ضرور ہوتے ہیں مگر یہ تصریف نہیں ہے [۴۶]۔

اردو الفاظ کی ساخت، ساقوں کی تشکیل اور اردو کی مارفیمی تبدیلیوں کا ذکر نصیر احمد خان نے تفصیل سے کیا ہے لیکن چونکہ یہ تفصیلات بنیادی یا تعارفی نوعیت کی نہیں ہیں اور سرِ دست ہمارے دائرے سے خارج ہیں لہٰذا ان سے گریز کیا جاتا ہے لیکن جو طالب علم یا عام قاری اردو ساق کی تشکیل میں مرکب الفاظ یا مخلوط الفاظ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے نصیر احمد خان کی کتاب ''اردو ساخت کے بنیادی عناصر'' کے متعلقہ ابواب کا مطالعہ مفید ہوگا [۴۷]۔

حواشی:

۱۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictioanry of Language، (لندن: پینگوِن، ۱۹۹۹ء)، ص ۷، [دوسرا ایڈیشن]۔

۲۔ ایضاً، ص ۸۔۷

۳۔ ملاحظہ ہو: وضعِ اصطلاحات (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء)، ص ۶۲۔۳۶ [پانچویں اشاعت]

۴۔ ڈیوڈ کرسٹل، (David Crystal)، The Penguin Dictioanry of Language، محولہ بالا، ص ۸۔۷

۵۔ ملاحظہ ہو: وضعِ اصطلاحات، محولہ بالا، ص ۶۲۔۳۶

۶۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictioanry of Language، محولہ بالا، ص ۸۔۷

۷۔ ایڈورڈ فنیگن (Edward Finegan)، Language: Its Structure and Use (فورٹ ورتھ: ہارکوٹ بریس، ۱۹۹۹ء)، ص ۴۵ [تیسرا ایڈیشن]۔

۸۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictioanry of Language، محولہ بالا، ص ۸۔۷

۹۔ گیان چند، عام لسانیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص ۲۱۰۔

۱۰۔ عام لسانیات، محولہ بالا، ص ۲۱۲۔۲۱۱

۱۱۔ وکٹوریا فرام کن و دیگر (Victoria Fromkin, Et al)، An Introduction to Language، (میلبرن: تھامسن پبلشنگ، ۲۰۰۵ء)، ص ۶۹ [پانچواں ایڈیشن]۔

۱۲۔ گیان چند، عام لسانیات، محولہ بالا، ص ۲۰۱۔

۱۳۔ عبدالسلام، عمومی لسانیات، (کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۷۸۔

۱۴۔ پی ایچ میتھیوز (P H Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Linguistics (نیو یارک: اوکسفرڈ، ۱۹۹۷ء)، ص ۳۲۴۔

۱۵۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، محولہ بالا، ص ۷۰۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ ایڈرین اکماجین و دیگر (Adrian Akmajian, Et al)، Linguistics: An Introduction Language and Communication، (کیمبرج (میساچوسٹس): ایم آئی ٹی پریس، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۹۔

۱۸۔ عمومی لسانیات، محولۂ بالا، ص ۱۷۵۔
۱۹۔ ایڈرین اکماجین ودیگر، محولۂ بالا، ص ۱۹۔
۲۰۔ غام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۲۰۱۔
۲۱۔ عتیق صدیقی (مترجم)، توضیحی لسانیات (دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء)، ص ۷۰۔
۲۲۔ عبدالسلام، عمومی لسانیات، محولۂ بالا، ص ۱۷۸۔
۲۳۔ کرسٹل ڈیوڈ، (David Crystal)، The Penguin Dictioanry of Language،
محولۂ بالا ص ۳۱۹۔
۲۴۔ پی ایچ میتھیوز، Oxford Concise Dictionary of Linguistics، محولۂ بالا، ص ۳۵۳۔
۲۵۔ عتیق صدیقی (مترجم)، توضیحی لسانیات، محولۂ بالا، ص ۷۱۔
۲۶۔ گیان چند، عام لسایات، محولۂ بالا، ص ۲۶۷۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۲۸۷۔
۲۸۔ کیتھ براون ودیگر (Keith Brown, Et al)، Concise Encyclopedia of Languages of the World، (اوکسفرڈ: ا یلسویر لمٹیڈ، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۹۲۔۲۹۱
۲۹۔ اینڈریو ریڈفورڈ ودیگر (Andrew Radford, Et al)، Linguistics: An Introduction، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۵۶ [دوسرا ایڈیشن]۔
۳۰۔ ایضاً۔
۳۱۔ ایڈورڈ فنیگن، محولۂ بالا، ص ۵۴۔
۳۲۔ عام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۲۶۷۔
۳۳۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictioanry of Language، محولۂ بالا،
ص ۳۴۸۔
۳۴۔ ایضاً۔
۳۵۔ اینڈریو ریڈفورڈ ودیگر، محولۂ بالا، ص ۱۵۶۔
۳۶۔ ایضاً۔
۳۷۔ ایضاً، ص ۱۵۷۔
۳۸۔ ایڈورڈ فنیگن، محولۂ بالا، ص ۵۵۔
۳۹۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Cambridge Encyclopedia of he English Language (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)، ص ۲۹۳۔
۴۰۔ عام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۲۳۷۔

۴۱۔ ایضاً۔

۴۲۔ ڈیوڈ کرسٹل، The Cambridge Encyclopedia of he English Language، محولۂ بالا، ص ۲۹۳۔

۴۳۔ عام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۷۳۶۔۷۳۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۷۳۳۔۷۳۲۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۷۳۳۔

۴۶۔ ایضاً۔

۴۷۔ (دہلی: اردو محل، ۱۹۹۱ء)۔

☆......☆......☆

پانچواں باب: معنویات (۱)

معنی، نحو اور تداولیات

کسی بھی زبان کو سمجھنے کے لیے تین باتیں ضروری ہوتی ہیں: ایک یہ کہ ہم اس زبان کے لفظوں اور مارفیموں (morphemes) (یعنی صرفیوں) کے معنی سمجھتے ہوں (مارفیم پر گفتگو پچھلے باب میں ہو چکی ہے)۔ دوسرے یہ کہ ہم یہ بھی سمجھتے ہوں کہ ان الفاظ اور مارفیموں کے معنی کس طرح آپس میں جڑ کر بامعنی جملہ بناتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہم اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ یہ الفاظ، مارفیم اور جملے کس تناظر یا سیاق و سباق میں کہے جا رہے ہیں[۱] یعنی کسی زبان کو سمجھنے کے لیے الفاظ کے معانی کی تفہیم اور الفاظ کے آپس میں جڑنے کے عمل کی تفہیم کے ساتھ ساتھ ان الفاظ یا جملوں کے سیاق یا تناظر کو بھی سمجھنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاق کی وجہ سے الفاظ اور جملوں کے معنی بدل جاتے ہیں (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

گویا یہ تین موضوعات ہیں۔ ان میں سے معنی کا تعلق معنویات (semantics) کے علم سے ہے، الفاظ کے آپس میں جڑنے کا نحو (syntax) سے اور تناظر اور سیاق کا تعلق تداولیات یا پریگ میٹکس (pragmatics) سے ہے۔ ان تینوں کا مختصر جائزہ پیش ہے۔

☆ معنویات (semantics)

معنویات لسانیات کی شاخ ہے اور لفظوں کے معنی اور ان کے باہمی تعلق کا مطالعہ معنویات کا کام ہے۔ معنی کا مطالعہ معنویات یعنی سمنٹکس (semantics) کہلاتا ہے (معنویات کو اردو میں معنیات بھی کہا جاتا ہے)۔ معنویات میں مارفیموں، لفظوں، مرکبات اور جملوں کے معنی کا

مطالعہ کیا جاتا ہے[۲]۔

معنویات کے ذیلی شعبے دو ہیں: (۱) لغوی معنویات (lexical semantics)، جس میں لفظوں کے معنی اور ان کے باہمی تعلق کا مطالعہ کیا جاتا ہے ۔(۲) جملوی معنویات (sentential semantics) یا مرکباتی معنویات (phrasal semantics)، جس میں لفظوں سے بڑی اکائیوں (مرکبات، فقروں اور جملوں) کا مطالعہ کیا جاتا ہے[۳]۔

معنویات میں اختلافی مسائل بہت ہیں اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر ہیں جن میں باہمی فرق وبُعد بھی ہے اور انیس سو چالیس اور انیس سو پچاس کے عشروں میں معنویات کے دائرے اور موضوع پر ماہرین کے درمیان اختلاف بہت بڑھ گیا تھا۔ لیکن اس کی تفصیل سے سرِ دست بڑی حد تک دامن بچاتے ہوئے طالب علموں کے لیے اس ضمن میں ضروری مباحث اور مسائل مختصراً پیش ہیں۔

معنویات (semantics) کو فرانسیسی ماہر لسانیات مشل برے ال (Michel Breal) (۱۹۱۵ء۔۱۸۳۲ء) نے انیسویں صدی کے اواخر میں ایک اُبھرتے ہوئے علم کے طور پر صوتیات (phonetics) کے مقابل پیش کیا تھا[۴]۔ لیکن معنویات کی حیثیت کو جدید لسانیات میں قابلِ رشک نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پہلی جنگِ عظیم سے لے کر لگ بھگ ۱۹۶۰ء تک معنویات کو، خاص طور پر امریکا میں، کچھ زیادہ توقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا[۵]۔ اس کے قواعد کا حصہ ہونے یا نہ ہونے پر بھی اختلافات رہے۔ معروف امریکی ماہر لسانیات لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloomfield) (۱۹۴۹ء۔۱۸۸۷ء) نے ۱۹۳۰ء میں معنویات میں قواعد اور ذخیرۂ الفاظ کو بھی شامل کر لیا[۶]۔ بیسویں صدی کے اواخر میں معنویات کی اصطلاح کو وسیع تر معنوں میں استعمال کیا جانے لگا اور اس میں لفظ کے معنی (لغوی معنویات) کے علاوہ کلام یا گفتگو کے سیاق وتناظر کے مفہوم یعنی پریگ میٹکس (تداولیات) کو بھی شامل کیا جانے لگا[۷]۔ ایک جدید تر رجحان یہ بھی ہے کہ معنویات سے لغوی معنی کی بحث کو بھی نکال دیا جائے اور اس کو صرف ہیئتی یا ساختی معنویات (formal semantics) تک محدود رکھا جائے[۸]۔ لیکن ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ صرف لفظ ہی

نہیں قواعد بھی بہر حال زبان میں کچھ نہ کچھ مفہوم تو بیان کرتی ہے لہٰذا قواعد میں معنویات شامل ہو جاتی ہے اور ان دونوں باتوں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات معقول نظر آتی ہے کہ معنوی معلومات بہر حال قواعد کا جزوِ لاینفک ہے[9]۔

☆ نحو (syntax)

قواعد (grammar) کی دو شاخیں ہیں ایک صَرف (morphology) اور دوسری نحو (syntax)۔ صَرف کی پرانی تعریفوں میں کہا گیا ہے کہ الفاظ کے حروف اور اعراب میں تبدیلی سے مختلف معانیٰ پیدا ہوتے ہیں اور صَرف اسی کے مطالعے کا نام ہے[10]۔ لیکن جدید دور میں اس سے اختلاف کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ اس میں صرف الفاظ نہیں بلکہ الفاظ کے تابع کلمات بھی شامل ہیں[11] (اور اس سے مراد مارفیم ہیں)۔ مختصراً یہ کہ صَرف کے علم میں الفاظ سے بحث ہوتی ہے اور جملوں یا مرکبات میں یا مختلف قواعدی حالتوں یا صیغوں میں مستعمل لفظ کی شکل یا حیثیت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کا مطالعہ صَرف ہے[12]۔ صَرف کا علم بتاتا ہے کہ کوئی لفظ کیا ہے، اسم ہے، فعل ہے حرف ہے یا کچھ اور، نیز اس میں کس طرح کی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ جبکہ نحو (syntax) لفظ سے بڑی لغوی اکائیوں (یعنی تراکیب اور جملے) کے مطالعے کا نام ہے۔ نحو کا اصل تعلق جملے یا مرکب میں الفاظ کی ترتیب اور تقدیم وتاخیر سے ہے[13]۔

جدید لسانیات میں نحو کا مفہوم تھوڑا سا بدل گیا ہے اور اب یہ کہا جاتا ہے کہ مرکبات اور جملے بنانے کے قوانین کا علم نحو کہلاتا ہے[14]۔ لیکن نحو جملے کے اندرونی ڈھانچے اور اس کے مختلف حصوں کے آپس کے ربط اور تعلق کے مطالعے کا بھی نام ہے[15]۔ لفظ کی ساخت کا مطالعہ تو مارفیمیات میں ہوتا ہے لیکن لفظ سے بڑی ترکیبوں یعنی مرکبات یا جملوں میں لفظوں کی ترتیب کا مطالعہ نحو میں ہوتا ہے البتہ بعض مقامات پر مارفیمیات اور نحو کے گڈمڈ ہونے سے ان کی سرحدیں مبہم ہو جاتی ہیں[16]۔

نحو کا علم یہ بھی بتاتا ہے کہ کسی جملے میں کسی لفظ کیا جگہ کیا ہوگی اور اس جملے میں اس لفظ کی تبدیلی سے مفہوم پر کیا اثر پڑے گا۔ گویا جملوں کے مفہوم کا مطالعہ بھی نحو میں ہوتا ہے۔ لیکن بعض

جملے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا مفہوم وہ نہیں ہوتا جو بظاہر نظر آتا ہے اور ایسے جملوں کے مفہوم کا مطالعہ نحو میں نہیں بلکہ تداولیات یا پریگ میٹکس (pragmatics) میں ہوتا ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ تداولیات کیا ہے۔

☆ **تداولیات** (pragmatics)

کسی تعمیراتی کمپنی کے اشتہار میں لکھا تھا ''صرف چند پلاٹ باقی رہ گئے ہیں''۔ اس کا ظاہری مفہوم وہی ہے جو لغوی اور نحوی طور پر (یعنی معنویات اور قواعد کی رو سے) ہونا چاہیے اور وہ مفہوم ہے: ''صرف چند پلاٹ باقی رہ گئے ہیں''۔

لیکن اس جملے میں کچھ اضافی معنی بھی چھپے ہیں جو کسی لفظ سے اور جملے کی بناوٹ سے ظاہر نہیں ہو رہے لیکن موجود ہیں اور وہ معنی ہیں:

(۱) کئی پلاٹ تھے لیکن اب صرف چند باقی رہ گئے ہیں اور اکثر فروخت ہو چکے ہیں۔

(۲) اگر آپ پلاٹ خریدنا چاہتے ہیں تو جلدی کیجیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی فروخت ہو جائیں اور آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں۔

گویا بعض اوقات تحریر یا گفتگو میں لفظی معنوں کے علاوہ ''اضافی معنی'' بھی چھپے ہوتے ہیں جن کا ایک خاص پس منظر یا تناظر ہوتا ہے۔ لفظی معنوں کا مطالعہ معنویات (semantics) ہے اور ''چھپے ہوئے اضافی معنی'' (جن کا دارومدار سیاق و سباق (context) اور صورت حال (situation) پر ہوتا ہے) کا مطالعہ پریگ میٹکس (pragmatics) یا تداولیات ہے [۱۷]۔

یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ اردو میں پریگ میٹکس کا اوّل تو ذکر ہی کم ملتا ہے اور ایک فرہنگ میں اس کا ترجمہ ''علمِ علامتی زبان'' کیا گیا ہے [۱۸]، جو درست نہیں ہے۔ عربی میں چونکہ تَداوُل ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانے اور بدلنے کو کہتے ہیں اور عربی میں پریگ میٹکس کا نام بھی ''التداولیۃ'' ہے لہٰذا اردو میں اسے تداولیات کہنا چاہیے۔ عربی اصطلاح کے استعمال پر اعتراض اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ خود انگریزی کے لفظ پریگ میٹکس کی اصل بھی تو

یونانی اور لاطینی مادّے ہیں۔ بلکہ کئی علوم کی بے شمار انگریزی اصطلاحات کی بنیاد لاطینی اور یونانی ہی پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا اردو میں اصطلاح سازی میں کسی بھی ہم مزاج زبان خاص طور پر عربی، فارسی اور سنسکرت/ پراکرت سے لفظ لینا معیوب نہیں کہا جاسکتا۔

تداولیات کی تعریف دیکھی جائے تو ایک تعریف یہ ہے:

لفظ سے بڑے مرکبات کے معنی کے مطالعے کا نام نحو ہے لیکن بسا اوقات صورت حال (situation) یا سیاق (context) کی وجہ سے لفظ یا مرکب یا جملے کا مفہوم تبدیل ہوجاتا ہے اور سیاق کی وجہ سے معنوں میں تبدیلی کا مطالعہ تداولیات یا پریگ میٹکس (pragmatics) کہلاتا ہے۔[19]

تداولیات کی ایک اور تعریف اس کو سمجھنے میں ممدومعاون ہے اور وہ تعریف ہے:

Pragmatics is about the interaction of semantic knowledge with our knowledge of the world, taking into account the contexts of use.[20]

اس کا مفہوم کچھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ تداولیات کا تعلق ہمارے معنویاتی علم اور دنیا سے متعلق ہمارے علم کے اس باہمی تعامل سے ہے جو زبان کے استعمال کے سیاق وتناظر کو مدِنظر رکھے۔

آسان لفظوں میں اس کا مفہوم یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ جب ہم اپنے آس پاس کے لوگوں، ماحول اور حالات کے پس منظر اور سیاق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس پس منظر اور سیاق کی روشنی میں زبان استعمال کرتے ہیں تو الفاظ اور جملوں کا مفہوم بدل جاتا ہے اور ہم ان کا وہ مفہوم مراد نہیں لیتے جو عام حالات میں لفظوں کے یا جملوں کے ظاہری معنوں سے مراد لیتے ہیں۔

ان ظاہری معنوں کے علاوہ جو معنی ہم مراد لیتے ہیں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں اور کوئی دوست آکر چلتے ہوئے پنکھے کی طرف دیکھ کر کہتا ہے ''آج موسم

کچھ ٹھنڈا نہیں ہورہا؟'' اورآپ اٹھ کر پنکھا بند کردیتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ اردوقواعداورلغت کے کس اصول کی رو سے '' آج موسم کچھ ٹھنڈا نہیں ہورہا ؟'' کا ترجمہ ''پنکھابند کردو'' کیا جاسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ لغوی معنوں اورنحو کی رو سے تو یہ معنی نہیں نکلتے لیکن جس ماحول اورسیاق وسباق میں یہ الفاظ کہے گئے تھے اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ سردی ہورہی ہے پنکھا کیوں چلایا ہے،لہٰذا آپ نے اس کی دل جوئی کے لیے پنکھا بند کردیا۔

یہ معنی جو آپ نے مراد لیے (کہ پنکھا بند کردو) نہ تو معنویات کی رو سے لیے جاسکتے ہیں اور نہ نحو کی بنیاد پر، بلکہ اس کی بنیاد پس منظر،ماحول،تناظر اور سیاق ہے۔اور یہی تداولیات ہے۔

☆ لفظ کے معنی: من مانے اور متفق علیہ

معنی پر گفتگو سے قبل لفظ و معنی کے رشتے سے متعلق ایک اہم بات ضروری ہے۔

کسی لفظ کے جو معنی ہوتے ہیں وہ وہی کیوں ہوتے ہیں جو ہوتے ہیں؟ یہ کیسے طے ہوا کہ فلاں لفظ کے یہ معنی ہوں گے؟ مثال کے طور پر بلی کا مطلب بلی ہی کیوں ہوتا ہے کتا کیوں نہیں ہوتا؟ کتے کو ہم بلی یا گدھا یا گاجر کیوں نہیں کہتے؟ یا اس سوال کو یوں بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ کسی لفظ کے جو معنی ہوتے ہیں اس کی عقلی یا منطقی توجیہ کیا ہوتی ہے؟ اس کا جواب ذرا سی تفصیل چاہتا ہے۔

لیکن پہلے ایک وضاحت: پہلے باب میں ہم نے کہا تھا کہ لفظ و معنی کے تعلق کا ذکر معنویات کے باب میں ہوگا کیونکہ لفظ اور معنی کی بحث معنویات اور سیمینٹکس کے تحت آتی ہے۔ دراصل لفظ اور معنی کا رشتہ سیمیولوجی (semiology) یا سیمیوٹکس (semiotics) سے تعلق رکھتا ہے جس کو اردو میں علمِ علامات کہتے ہیں۔علمِ علامات خود کیا ہے؟ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ علمِ لسانیات دراصل اسی علمِ علامات کی شاخ ہے [۲۱]۔لیکن بعض دیگر ماہرین کا خیال اس کے برعکس ہے یعنی یہ کہ علمِ علامات کو لسانیات کی شاخ ماننا چاہیے [۲۲]۔

علمِ علامات کا بانی فرڈی نینڈ ڈی سوسئیر (Ferdinand de Saussure)(۱۸۵۷ء-۱۹۱۳ء)

تھا جس کو جدید لسانیات کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ سوسئیر نے اس کا نام سیمیولوجی (semiology) تجویز کیا تھا اور کہا تھا کہ یہ علم جو ابھی وجود نہیں رکھتا اس کو معنویات (semantics) سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے [۲۳]۔ سوسئیر نے علمِ علامات کو سماجیات (sociology) اور سماجی نفسیات (social psychology) کا حصہ بھی کہا [۲۴]۔

اس بحث میں پڑے بغیر کہ لسانیات علمِ علامات کی شاخ ہے یا علمِ علامات لسانیات کا حصہ ہے یا سیمیولوجی خود سماجی نفسیات کا کس حد تک حصہ ہے، ہم اس سوال پر آتے ہیں کہ کسی لفظ کے جو معنی ہوتے ہیں وہ کیوں ہوتے ہیں۔ سوسئیر کا نظریہ اس سلسلے میں موجود ہے اور لسانیات میں یہ ''زبان کا من مانا پن'' (arbitrariness of language) کہلاتا ہے۔ لسانیات کی کتابوں میں اس کا ذکر زبان کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لیے ضرور کیا جاتا ہے۔ (یہاں اس کا ذکر معنویات کے ضمن میں اس لیے کیا گیا ہے کہ لفظ اور معنی کی بحث بہرحال معنویات ہی میں ہوتی ہے)۔ آیئے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

لفظ اور معنی کے ضمن میں سوسئیر نے لکھا ہے کہ زبان علامات (signs) کا نظام ہے جو تصورات اور خیالات کو ظاہر کرتا ہے یعنی ہمارے خیالات علامات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ علامت لکھی ہوئی صورت میں کوئی لفظ یا تصویر بھی ہو سکتی ہے اور آواز بھی (یعنی لفظ کی بولی ہوئی صورت میں)۔ سوسئیر کے بقول تحریر، حروفِ تہجی، قوتِ سماعت و گویائی سے محروم افراد کے لیے مستعمل اشارے، مخصوص رسوم، فوجی اشارے، یہ سب علامات ہیں جو ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں [۲۵]۔ ایسی دیگر علامات میں سوسئیر جھنڈی بولی (جھنڈیوں کے ذریعے پیغامات بھیجنے کا نظام)، بحری جہازوں کے جھنڈوں کے خفیہ اشارے اور فوجی بگل کو بھی شامل کرتا ہے [۲۶]۔

سوسئیر کے اس نظریے کا اہم پہلو زبان کا من مانا پن یا زبان کے مفہوم کا الل ٹپ (arbitrary) ہونا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی لفظ یا مارفیم اور اس کے مفہوم میں کوئی لازمی تعلق یا ربط نہیں ہوتا [۲۷]۔ اگر رہائش کے لیے تیار کردہ ایک خاص شکل اور تعمیر کو ایک زبان میں ''مکان''

کہتے ہیں تو دوسری زبان میں اسے ''ہاؤس'' (house) کہتے ہیں۔ تیسری زبان میں کچھ اور کہتے ہیں۔ اگر کسی لفظ اور اس کے مفہوم میں کوئی عقلی ربط ہوتا تو دنیا کی ہر زبان میں ہر چیز کا ایک ہی نام ہوتا اور ہم اس کو سنتے ہی سمجھ جاتے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ بلکہ پوری دنیا میں ایک ہی زبان ہوتی اور نہ کوئی دوسری زبان سیکھنی پڑتی اور نہ کوئی دولسانی لغت ہی لکھی جاتی [۲۸]۔ لیکن مختلف زبانوں میں ایک ہی چیز کے لیے الگ الگ لفظ ہوتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی چیز کے نام اور اس کے مفہوم میں کوئی منطقی (logical) تعلق نہیں ہوتا اور کسی لفظ کے معنی کی عقلی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اسے ایک اور مثال کی مدد سے سمجھتے ہیں [۲۹]۔ اگر انگریزی زبان میں ایک جانور کا نام pig (سؤر) ہے تو کیوں ہے؟ اس لفظ اور اس کے معنی میں کیا تعلق ہے؟ جواب یہ ہے کہ کوئی تعلق نہیں ہے اور تعلق ہے تو یہ کہ سب اس جانور کو یہی کہتے ہیں۔ گویا اس نام کی کوئی وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ سب اسے اسی نام سے جانتے ہیں۔ یہ لفظ ایک علامت ہے جس کا مفہوم پچھلے لوگوں نے طے کر دیا تھا جس کو اب سب مانتے ہیں، اگرچہ شروع میں یہ من مانی (arbitrary) اور الل ٹپ بات تھی اور اس جانور کو یہ نام دینے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن سب نے اس کو مان لیا۔ اور جب سب نے اسے مان لیا تو زبان کی دوسری خاصیت سامنے آتی ہے یعنی اس کا متفق علیہ (agreed upon) ہونا۔ مراد یہ کہ کسی علامت (یعنی لفظ) کے من مانے مفہوم کو سب نے مان لیا۔ اگر ابتدا میں کسی زبان کے بولنے والے سب لوگ کسی لفظ کے من مانے مفہوم پر متفق نہ ہوتے تو یہ لفظ کسی خاص مفہوم یا تصور کو پیش نہ کر سکتا اور نہ یہ لفظ علامت بنتا۔

گویا زبان کی خاصیت یہ ٹھہری کہ یہ علامات کا نظام (system of signs) ہے لیکن ان علامات کا مفہوم من مانا اور الل ٹپ (arbitrary) ہونے کے باوجود متفق علیہ (agreed upon) ہے۔ لفظوں کے معنی اگرچہ الل ٹپ ہیں، بہر حال متفق علیہ ہیں لہٰذا جو معنی طے ہو گئے بس ہو گئے اور ہم اب انھیں اپنی مرضی سے بدل نہیں سکتے کیونکہ ایسا کرنے سے ہمارے لیے ابلاغ ممکن نہیں رہے گا [۳۰]۔ مثلاً بلی کے معنی بلی اور گاجر کے معنی گاجر طے ہو گئے ہیں اور سب نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔ اب ہم بلی کو گاجر اور گاجر کو بلی نہیں کہہ سکتے کیونکہ کوئی ہماری بات نہیں سمجھے

گا۔ رہی یہ بات کہ بلی کو بلی کیوں کہا جائے اور گاجر کو گاجر کہنے کی عقلی توجیہ کیا ہے تو اس کا جواب یہی ہے کہ لفظ کے معنی کی بنیاد عقل یا منطق پر استوار نہیں ہوتی بلکہ من مانی یا الل ٹپ (arbitrary) ہوتی ہے۔

☆ **صوتی علامتیت** (sound symbolism)

البتہ ایک صورت ایسی ہے جس میں کسی لفظ اور اس کے مفہوم میں کوئی عقلی یا منطقی ربط ہوسکتا ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ کسی لفظ کی آواز سنتے ہی اس کا مفہوم سننے والوں کے ذہن میں آجائے ، یہ اس وقت ممکن ہے جب لفظ کے مفہوم اور اس کی آواز میں بہت کم فرق ہو، مثلاً میاؤں، دھڑام، ٹناٹن، ہی ہی ہاہا، کھٹ کھٹ، چوں چوں وغیرہ کو لیجیے، ان آوازوں کو سنتے ہی اس کا مفہوم ذہن میں آجاتا ہے کیونکہ یہ آوازیں اپنے مفہوم کی نقل ہیں۔ لفظ ''سرسراہٹ'' میں واقعی ''سرسر'' کی آواز آتی ہے اور ''جھنجھناہٹ'' میں واقعی ارتعاش کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح کی بہت مثالیں ہیں جن میں الفاظ کی آواز یا تلفظ سے مفہوم کا کچھ اندازہ ہوجاتا ہے۔ جب الفاظ کا تلفظ سن کر ان کا مفہوم ذہن میں آجائے تو اسے صوتی علامتیت (sound symbolism) کہتے ہیں[۳۱] کیونکہ یہاں صوت یعنی آواز مفہوم کی علامت (sign) ہے۔

دنیا کی ہر زبان میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو اپنے مفہوم کی نقل ہوتے ہیں اور ان الفاظ کو اسمِ صوت یا صوت نام (onomatopoeic) کہتے ہیں۔ یہ گویا آواز کا نام ہوتا ہے۔ اس میں لفظ کی صوت (یعنی آواز) سے مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یہ عمل جس میں صوتی تاثر سے معنی پیدا ہوتے ہیں نقلِ صوت (onomatopoeia) یا حکایت الصوت کہلاتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل میں انسانی زبانوں کا آغاز اسی طرح ہوا ہوگا کہ ہر لفظ کی آواز اپنے مفہوم کی نقل ہوگی (گویا یہ زبان کے من مانے یا arbitrary ہونے کی بجائے فطری یعنی natural ہونے کا نظریہ ہے) لیکن دنیا کی ہر زبان میں ایسے الفاظ جن کی آواز اپنے معنی کی نقل ہوں تعداد میں بہت کم ہیں[۳۲]۔ اردو میں اس کی مثال دیکھیں تو لفظ ''چھینک'' کی آواز سے

چھینک سنائی دیتی ہے، لفظ ''کھانسی'' کا صوتی تاثر کھانسنے ہی کا بنتا ہے۔ لیکن اس سے یہ تصور کر لینا کی دنیا کی ہر زبان میں ایسے الفاظ کے لیے ایک ہی لفظ ہوتا ہے درست نہیں ہوگا۔ اردو کے لفظ ''چھینک'' ہی کی مثال لے لیجیے، انگریزی میں اسے sneeze کہتے ہیں اور اس انگریزی لفظ کی آواز (یعنی سنیز) میں بھی کسی حد تک چھینکنے کے آواز سنائی دیتی ہے لیکن یہ ہو بہو نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بعض صورتوں میں یہ فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے مثلاً بوتل وغیرہ سے پانی نکلتے وقت جو آواز آتی ہے اسے اردو میں گٹ گٹ کہتے ہیں، لیکن عربی میں اس کا نام قُلقُل ہے جبکہ انگریزی میں اسے gurgle کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ زبان کے فطری (natural) ہونے کا نظریہ درست نہیں ہے بلکہ من مانے (arbitrary) ہونے کا نظریہ درست ہے کیونکہ صوتی علامتیت میں بھی مفہوم من مانا یا الل ٹپ (arbitrary) ہوتا ہے اور دنیا کی ہر زبان میں ایک نقلِ صوت کے لیے ایک ہی لفظ (اسمِ صوت) نہیں ہے اور مختلف زبانوں میں ایک ہی نقلِ صوت کے لیے اتنے الگ الگ الفاظ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے [۳۳]۔ اس ضمن میں معروف ماہر لسانیات ٹراسک نے جاپانی، عبرانی، ترکی زبانوں میں ایک ہی نقلِ صوت کے لیے مختلف الفاظ کی مثالیں دی ہیں [۳۴]۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہر زبان میں ہر لفظ کی آواز اپنے مفہوم کی نقل ہوتی ہے مثلاً اردو میں کٹ، عربی میں قطع اور انگریزی میں cut بولتے ہی کٹنے کی آواز سنائی دیتی ہے یا لفظ ''کھوکھلا'' کی آواز سن کر کھوکھلے پن کا حساس ہوتا ہے۔ لیکن گیان چند نے اس نظریے کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ہر لفظ کی آواز کے اپنے مفہوم کی نقل ہونے کا نظریہ محض ''لغو'' ہے اور اگر کسی آواز کی بنیاد پر ایسے دس الفاظ پیش کیے جاسکتے ہیں جن کی آواز اس مفہوم کی نقل ہے (مثلاً ''کھ'' کی آواز سے کھوکھلے پن کا احساس جیسے کھوکھلا، کھودنا، کھنڈر جیسے الفاظ میں) تو ''کھ'' کے ایسے پچاس الفاظ موجود ہیں جن کی آواز اپنے مفہوم کی نقل نہیں ہے اور انھوں نے اردو سے اس کی مثالیں بھی دی ہیں [۳۵]۔ البتہ سوسئیر نے زبان کے فطری (natural) یا من مانے (arbitrary) ہونے کی بحث کو یوں سلجھایا ہے کہ زبان ابتدا میں تو من مانی ہی تھی اور لفظ و معنی کا رشتہ الل ٹپ ہی

تھا لیکن صدیوں کے استعمال سے یہ فطری ہو گیا کیونکہ کسی زبان کا بولنے والا اپنے ماحول سے غیر شعوری طور پر کسی لفظ کی آواز ہی سیکھتا ہے اور اس آواز سے وابستہ اور رائج مفہوم ہی اس کے نزدیک اس لفظ کا مفہوم ہوتا ہے۔ گویا اس کے لیے اس لفظ کا وہ مفہوم فطری ہی ہوتا ہے [۳۶]۔ عام آدمی کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ مفہوم من مانا اور الل ٹپ ہے لیکن متفق علیہ ہے۔

☆ نحو کی خود مختاری اور معنویات

نوم چومسکی (Noam Chomsky) لسانیات کے میدان میں ایک بڑا نام ہے اور اُن کے نظریات نے یقیناً لسانیات میں بعض ایسے مباحث چھیڑے ہیں جن کی گونج ان کے پیش کیے جانے کے پچاس ساٹھ سال کے بعد بھی سنائی دے رہی ہے۔ چومسکی کے اِن نظریات میں سے ایک اُن کا ''نحو کی خود مختاری'' (autonomy of syntax) کا نظریہ بھی ہے۔ اس نظریے کے مطابق نحو زبان کا خود مختار حصہ ہے جو خود مختارانہ اپنے طور پر کام کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معنویات (اور تداولیات) کے بغیر بھی جملہ نحو کے لحاظ سے درست ہو سکتا ہے [۳۷]۔

اس کی مثال میں نوم چومسکی نے وہ جملہ گھڑا جو آج بھی دنیائے لسانیات میں معروف ہے۔ وہ جملہ ہے:

Colourless green ideas sleep furiously.

اس کا ترجمہ کچھ یوں ہو سکتا ہے: بے رنگ سبز افکار زور و شور سے سوتے ہیں۔

یہ جملہ نحو کے لحاظ سے بالکل درست ہے اگرچہ معنویات کے لحاظ سے درست نہیں ہے کیونکہ یہ منطقی طور پر غلط ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی چیز بے رنگ ہو گی تو سبز نہیں ہو سکتی اور افکار کوئی مادی شے نہیں ہیں کہ سوئیں اور نہ ہی کوئی زور و شور سے سو سکتا ہے۔

لیکن اگر اسی جملے کو یوں لکھا جائے:

Furiously sleep ideas green colourless.

تو یہ جملہ بے معنی ہو گا کیونکہ اس کی نحوی ترتیب درست نہیں ہے اگرچہ الفاظ بالکل وہی ہیں اور اس میں ہر لفظ انگریزی کا ہے لیکن انگریزی کا کوئی بھی اہل زبان اس کو درست نہیں مانے گا [۳۸]۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جملے کے درست ہونے کا دارومدار اس کے الفاظ کی درست ترتیب اور ان کے باہمی ربط پر ہوتا ہے (اور اسی کا مطالعہ نحو کہلاتا ہے) چاہے عقلی طور پر جملہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو۔ نحوی قوانین کے مطابق اگر کسی جملے میں الفاظ اس زبان کی نحوی ترتیب کے مطابق نہ ہوں تو جملہ بے معنی ہو جائے گا چاہے سارے لفظ لغوی معنی رکھتے ہوں اور معنویات یا لغت ان الفاظ کو بامعنی تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن اگر جملے میں الفاظ کی ترتیب درست ہو تو جملہ عقلی طور پر نادرست ہونے کے باوجود قواعدی لحاظ سے درست ہو سکتا۔

''بے رنگ سبز افکار زور و شور سے سوتے ہیں'' یا اس طرح کے دیگر جملوں کے بے معنی ہونے یا ان کی روایتی تشریح و تفہیم نہ ہو سکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تمام لفظوں کے بامعنی ہونے کے باوجود یہ جملے معنویاتی لحاظ سے آپس میں مطابقت نہیں رکھتے گو اس معنویاتی عدم مطابقت کے باوجود جملہ نحوی لحاظ سے درست ہوتا ہے۔[۳۹]

اس سے معلوم ہوا کہ نحو کا علم خود مختار ہے اور معنویات سے ہٹ کر الگ بھی کام کرتا ہے۔ اسی لیے چومسکی نے کہا کہ نحو زبان کا وہ حصہ یا جزو ہے جو باقی اجزا مثلاً معنویات سے الگ اور آزادانہ طور پر کام کرتا ہے۔[۴۰]

☆ معنوی خاصیت (semantic feature)

نحو کے خود مختار ہونے کا نظریہ معنوی خاصیت کے تصور سے جڑا ہوا ہے لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معنوی خاصیت سے کیا مراد ہے۔

ہر لفظ کا ایک بنیادی مفہوم ہوتا ہے اور اس مفہوم کے کچھ اجزا ہوتے ہیں جو اس لفظ کے پڑھتے یا سنتے ہی ذہن میں آتے ہیں اور جن کے مجموعی تاثر سے لفظ کا مفہوم بنتا ہے، ان مفہومی اجزا کو معنوی خاصیتیں (semantic features) کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ ''لڑکی'' سن کر یا پڑھ کر ذہن میں ''انسان''، ''مؤنث'' اور ''جوان'' کے مفہومی اجزا اُبھرتے ہیں۔ ان اجزا سے مل کر لفظ ''لڑکی'' کا مفہوم مکمل ہوتا ہے۔ یہ مفہومی یا معنوی اجزا لفظ ''لڑکی'' کی معنوی خاصیتیں ہیں[۴۱]۔ یعنی لڑکی انسان ہوتی ہے، صنف یا جنس کے لحاظ سے مرد یا مذکر نہیں بلکہ عورت یا مونث ہوتی

ہے اور عمر کے لحاظ سے بوڑھی نہیں بلکہ جوان یا نوجوان ہوتی ہے۔

گویا معنوی خاصیت (semantic feature) سے مراد ہے کسی لفظ کے معنی کا بنیادی معنوی جزو یا کسی لفظ کے بنیادی مفہومی اجزا میں سے ایک جزو۔

البتہ بعض کتابوں میں اسے ''فیچر'' (feature) یعنی خاصیت کی بجائے ''پروپرٹی'' (property) یعنی ''وصف'' کا نام دیا گیا ہے [۴۲]۔ دراصل معنوی خاصیت کو ظاہر کرنے والے مفہومی جزو کی موجودگی یا عدم موجودگی کو کسی جدول یا چارٹ میں منفی (-) اور مثبت (+) کی علامات سے ظاہر کیا جائے تو اسے ''فیچر'' کہا جاتا ہے۔ بہرحال بنیادی تصور یہ ہے کہ لفظ کے کچھ خاص مفہومی یا معنوی اجزا ہوتے ہیں جنھیں خاصیت یا وصف کہتے ہیں۔

☆ معنوی خاصیتوں کا ثبوت

نوم چومسکی کا نظریہ ہے کہ علمِ نحو خود مختار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے اس نظریے سے اختلاف بھی کیا گیا لیکن اس کے اس جملے ''بے رنگ سبز افکار زور وشور سے سوتے ہیں'' سے اس بات کا ثبوت تو بہرحال ملتا ہے کہ لفظ کی معنوی خاصیتیں ہمارے ذہن میں کہیں موجود ہوتی ہیں اور جب لفظوں کو بے جوڑ یا متضاد طریقے ترتیب دیا جائے (مثلاً بے رنگ سبز افکار) تو ہمارا ذہن ہمیں بتاتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ خرابی یا عدم مطابقت ضرور ہے۔

یہ خرابی یا گڑبڑ کس طرح سامنے آتی ہے؟ اس کی مثال میں دو جملے دیکھیے [۴۳]:

۱۔ وہ کنوارا لڑکا شادی شدہ ہے۔

۲۔ پہاڑی چٹان نے اپنے بال سنوارے۔

ان جملوں میں ''گڑبڑ'' ہے اور وہ ہے: جملے کے بعض الفاظ کی معنوی خاصیتوں کا دوسرے الفاظ کی معنوی خاصیتوں سے ہم آہنگ نہ ہونا۔ ہمارے ذہن میں لفظ ''کنوارا'' (جس کی شادی نہ ہوئی ہو) اور ''شادی شدہ'' (جس کی شادی ہوگئی ہو) کی معنوی خاصیت موجود ہے (معنوی خاصیت یا semantic feature کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) اور ایک ہی جملے میں ان متضاد یا

غیر ہم آہنگ معنی رکھنے والے الفاظ کے اس طرح آنے سے ان کی معنوی خاصیتوں میں مطابقت نہیں رہتی۔ اسی طرح ''چٹان'' سے ہمارے ذہن میں جو معنوی خاصیتیں آتی ہیں وہ ''بے جان'' اور ''پتھر'' ہیں۔ جبکہ بال جانداروں کے ہوتے ہیں اور بے جان چیزیں بال سنوار بھی نہیں سکتیں۔ لہٰذا ان معنوی خاصیتوں کی موجودگی یا عدم موجودگی سے پیدا ہونے والی عدم مطابقت کو ہمارا ذہن معنوی اور عقلی لحاظ سے غلط قرار دے دیتا ہے اگرچہ قواعد (یعنی نحو) کی رو سے یہ جملے بالکل درست ہیں[۴۴]۔

حواشی:

۱۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language ، (میلبرن: تھامسن پبلشنگ، ۲۰۰۵ء)، ص۱۵۶ [پانچواں ایڈیشن]

۲۔ ایضاً۔

۳۔ وکٹوریا فرامکن، محولۂ بالا، ص۱۵۶۔ نیز ایڈورڈ فنیگن (Edward Finegan) Language: Its Structure and Use ، (فورٹ ورتھ: ہارکوٹ بریس، ۱۹۹۹ء)، ص۲۰۱۔

۴۔ پی ایچ میتھیوز (P.H.Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Linguistics ص۳۳۴۔

۵۔ ایڈریان اکماجین ودیگر (Adrian Akmajian Et al)، محولۂ بالا، ص۲۲۵۔

۶۔ پی ایچ میتھیوز، Oxford Concise Dictionary of Linguistics، ص۳۳۴۔

۷۔ ایضاً، ص۳۳۵۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ ایڈرین اکماجین، محولۂ بالا، ص۲۲۵۔

۱۰۔ مثلاً فتح محمد جالندھری کے ہاں یہ تعریف ملتی ہے۔ دیکھیے: مصباح القواعد، حصۂ اوّل (رام پور: ناظم برقی پریس، ۱۹۴۵ء)، ص۱۸۔

۱۱۔ ابواللیث صدیقی، جامع القواعد، حصۂ صَرف (لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۱ء)، ص۲۲۹۔۲۲۸ [اشاعتِ اول]

۱۲۔ مولوی عبدالحق، قواعدِ اردو (کراچی: انجمن ترقیٔ اردو، ۲۰۰۹ء)، ص۵۶۔

۱۳۔ غلام مصطفیٰ خاں، جامع القواعد، حصہ نحو (لاہور: مرزی اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء)، مقدمہ۔ [اشاعتِ اوّل]

۱۴۔ وکٹوریا فرامکن، محولۂ بالا، ص۵۳۸۔

۱۵۔ ایڈرین اکماجین، محولۂ بالا، ص۵۹۸۔

۱۶۔ گیان چند جین، عام لسانیات، ص۲۳۰

۱۷۔ بٹی جے برنر (Betty J. Birner)، Introduction to Pragmatics، (چچیسٹر: ولی بلیک ویل، ۲۰۱۳ء)، ص۱۔

۱۸۔ فرہنگ اصطلاحات لسانیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۷ء)۔

۱۹۔ وکٹوریا فرامکن، محولۂ بالا، ص۱۵۶۔

۲۰۔ پیٹرک گرفتھ (Patrick Griffith)، Introduction to English Semantics and Pragmatics، (ایڈنبرا: ایڈنبرا یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء)، ص۱۔

۲۱۔ پی ایچ میتھیوز، Oxford Concise Dictionary of Linguistics، محولۂ بالا، ص۳۳۶۔

۲۲۔ مثلاً ونفریڈ نوتھ (Winfried Nöth)، Handbook of Semiotics، (بلومنگٹن: انڈیانا یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء) ص ۵۸۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۸، ۵۷۔

۲۵۔ بحوالہ ونفریڈ نوتھ، محولۂ بالا، ص ۵۷۔

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ آر ایل ٹراسک، محولۂ بالا، ص ۱۲۔

۲۸۔ وکٹوریا فرامکن، محولۂ بالا، ص ۵۔۴

۲۹۔ یہ مثال اور وضاحت آر ایل ٹراسک، محولۂ بالا، سے لی گئی ہے (ص ۱۳۔۱۲) لیکن وضاحت اپنے لفظوں میں کی گئی ہے۔

۳۰۔ وکٹوریا فرامکن، محولۂ بالا، ص ۱۵۷۔

۳۱۔ آر ایل ٹراسک، محولۂ بالا، ص ۱۴۔۱۳

۳۲۔ گیان چند، عام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۲۹۶۔۲۹۵

۳۳۔ تفصیلات: آر ایل ٹراسک، محولہ بالا، ص ۱۴۔۱۳

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ گیان چند، عام لسانیات، ص ۲۹۵۔

۳۶۔ گیان چند، عام لسانیات، ۲۹۴۔۲۹۳

۳۷۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: جان کولنس (John Collins)، Chomsky: A Guide for the Perplexed، (نیویارک: کنٹینیم، ۲۰۰۸ء) ص ۴۳۔۴۱

۳۸۔ تفصیلات: ایضاً۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۴۳۔۴۱

۴۰۔ ایضاً۔

۴۱۔ ڈیوڈ کرسٹل، The Penguine Dictionary of Language، محولۂ بالا، ص ۳۰۰۔

۴۲۔ مثلاً وکٹوریا فرامکن، محولۂ بالا، ص ۱۵۹۔۱۵۸؛ وکٹوریا فرامکن "فیچر" اور "پراپرٹی" میں امتیاز کرتی ہیں لیکن جارج یول صرف ان نشانات کا ذکر کرتے ہیں جو جدول میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔ دیکھیے: The Study of Language، محولۂ بالا، ص ۱۱۸۔

۴۳۔ تفصیلات کے لیے: کرسٹن ڈینہم و دیگر (Kristin Denham Et al)، Linguistics for Everyone: An Introduction، (بوسٹن: واڈ سورتھ، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۹۵۔

۴۴۔ ایضاً۔

☆......☆......☆

چھٹا باب: معنویات (۲)

لغوی معنویات اور لغوی رشتے

معنویات (semantics) اور تداولیات یا پریگ میٹکس (pragmatics) دونوں معنی کا مطالعہ کرتے ہیں لہٰذا دونوں میں گہرا تعلق ہوتا ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ معنویات لفظوں کے لفظی یا لغوی معنی (literal sense) سے بحث کرتی ہے اور تداولیات کا تعلق اس مفہوم سے ہے جو غیر لفظی ہوتا ہے اور کسی خاص تناظر یا پس منظر میں مراد لیا جاتا ہے[۱]۔

معنویات چونکہ لفظی معنی سے بحث کرتی ہے لہٰذا معنویات کے ضمن میں لفظ و معنی کے موضوع سے گفتگو کا آغاز ہوتا ہے اور لفظ اور معنی کا مطالعہ لغوی معنویات (lexical semantics) میں ہوتا ہے[۲]۔ یہاں لغوی معنیات اور تداولیات کے بعض اہم معاملات اور بنیادی تصورات کا ذکر ناگزیر ہے جس سے ان دونوں کے دائرۂ کار کا فرق بھی واضح ہوگا اور لسانیات کی ان شاخوں کے بنیادی مباحث سے مزید آگاہی بھی ہوگی۔ پہلے لغوی معنویات کے ضمن میں اہم موضوعات پیش ہیں تاکہ متعلقہ مباحث، جو آگے آرہے ہیں، کی تفہیم آسان ہو:

☆ معنوی خاصیت (semantic feature)

اس کا ذکر ہم پچھلے باب میں کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یاددہانی کے لیے عرض ہے کہ ہر لفظ کا ایک بنیادی مفہوم ہوتا ہے اور اس مفہوم کے کچھ اجزا ہوتے ہیں جو اس لفظ کے پڑھتے یا سنتے ہی ذہن میں آتے ہیں اور جن کے مجموعی تاثر سے لفظ کا مفہوم بنتا ہے، ان مفہومی اجزا کو معنوی خاصیتیں (semantic features) کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ ''لڑکی'' سن کر یا پڑھ کر

ذہن میں ''انسان''، ''مؤنث'' اور ''جوان'' کے مفہومی یا معنوی اجزا ذہن میں ابھرتے ہیں۔ان اجزا سے مل کر لفظ ''لڑکی'' کا مفہوم مکمل ہوتا ہے۔یہ مفہومی اجزا لفظ ''لڑکی'' کی معنوی خاصیتیں ہیں [۳]۔یعنی لڑکی انسان ہوتی ہے، صنف یا جنس کے لحاظ سے مرد یا مذکر نہیں بلکہ عورت یا مونث ہوتی ہے اور عمر کے لحاظ سے بوڑھی نہیں بلکہ جوان یا نو جوان ہوتی ہے۔

گویا معنوی خاصیت (semantic feature) سے مراد ہے کسی لفظ کے معنی کا بنیادی مفہومی جز و یا کسی لفظ کے بنیادی مفہومی اجزا میں سے ایک جز و۔

☆ معنوی میدان (semantic field)

معنویات میں معنوی خاصیتوں کے علاوہ ایک اہم موضوع معنوی رشتوں کا ہے۔لیکن معنوی رشتوں کا ذکر آگے آرہا ہے۔چونکہ معنوی رشتوں کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے معنوی میدان (semantic field) کا ذکر ضروری ہے لہٰذا پہلے اسے بیان کر دیا جائے (معنوی میدان کو لغوی میدان (lexical field) بھی کہا جاتا ہے)۔معنوی میدان کے نظریے (semantic field theory) کے مطابق ہر لفظ ایک ایسے نظامِ اشتراک سے جڑا ہوا ہوتا ہے جو اسے زبان کے دوسرے لفظوں سے کسی نہ کسی طرح منسلک کر دیتا ہے۔یہ انسلاک و اشتراک معنی کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے اور شکل یا ہیئت (form) کے لحاظ سے بھی [۴]۔

اس بات کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ ہر لفظ اس زبان کے دیگر کئی الفاظ سے معنوی و لغوی لحاظ سے یا آواز اور ہجے (spelling) کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی تعلق رکھتا ہے۔کچھ لفظ مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کوئی تعلق رکھتے ہیں، کچھ لفظ تلفظ کے لحاظ سے باہم تعلق رکھتے ہیں اور کچھ الفاظ کا آپس میں تعلق ہجے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔کسی خاص لحاظ سے آپس میں تعلق رکھنے والے الفاظ کو ملا کر مجموعی طور پر معنوی میدان (semantic field) یا لغوی میدان (lexical field) کہتے ہیں، مثلاً انسانی رشتے داریوں کی اصطلاحات یا الفاظ یعنی رشتے کے معنوی میدان کو دیکھا جائے تو اس میں یہ الفاظ شامل ہوں گے: ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، بھتیجا، ماموں، دادا، نانا وغیرہ [۵]۔گویا معنوی میدان سے مراد ہے کسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا وہ حصہ جو معنوی طور پر

کچھ مشترک عمومی مفہوم رکھتا ہو مثلاً لفظ ''رنگ'' کے معنوی میدان میں ''کالا'' اور ''لال'' اور دوسرے رنگوں کے نام شامل ہیں[۶]۔ ایڈورڈ فنیگن نے چند الفاظ میں معنوی میدان یا لغوی میدان کی تعریف دی ہے جو یہ ہے:

lexical field — a set of words with identifiable sementic affinity.

یعنی معنوی میدان یا لغوی میدان ایسے الفاظ کا سیٹ یا مجموعہ ہوتا ہے جن میں کوئی قابلِ شناخت معنوی مماثلت اور ہم آہنگی ہوتی ہے[۷]۔

معنوی میدان کے نظریے کے مطابق کسی زبان کا ذخیرۂ الفاظ آزاد اور خود مختار اجزا پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ الفاظ ایک باہم مربوط لغوی نظام سے جڑے ہوتے ہیں[۸]۔

☆ لغوی یا معنوی رشتہ (lexical or semantic relation)

معنوی خاصیتوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معنوی خاصیتوں کی بنیاد پر الفاظ کے آپس میں مختلف قسم کے رشتے ہو سکتے ہیں اور عام زندگی میں لوگ الفاظ کا مفہوم ان معنوی یا لغوی رشتوں ہی کے ذریعے سے سمجھتے ہیں[۹]۔ مثال کے طور آپ کسی سے پوچھیے کہ ''پوشیدہ رکھنا'' کا کیا مطلب ہے تو وہ کہے گا ''چُھپانا'' (یہ دو لفظوں کے ہم معنی ہونے کی مثال ہے) یا کسی سے کہیے کہ ''اُتھلا'' کیا ہوتا ہے تو جواب ملے گا ''جو گہرا نہ ہو'' (یہ دو لفظوں کے باہم متضاد ہونے کی مثال ہے)۔ پوچھیے کہ چنبیلی کیا ہے تو جواب ہوگا ایک قسم کا پھول (یہ دو لفظوں کے ایک بنیادی اور مشترکہ یا مشمولہ مفہوم (پھول اور اس کی قسمیں) کی مثال ہے)۔ یہاں ان مثالوں میں لفظوں کے مفہومی اجزا یعنی معنوی خاصیتوں (semantic features) میں ایک رشتہ یا تعلق نظر آتا ہے۔ اسے لغوی رشتہ یا معنوی رشتہ (lexical relation or semantic relation) کہتے ہیں[۱۰]۔

لغوی یا معنوی رشتہ اس لحاظ سے دل چسپ ہے کہ ہر لفظ دوسرے لفظ سے کچھ نہ کچھ ربط اور تعلق رکھتا ہے اور ہر لفظ یا تو دوسرے لفظ سے ملتا جلتا ہے یا مختلف ہے، خواہ معنی کے لحاظ سے خواہ شکل (یعنی ہجے یا تلفظ) کے لحاظ سے[۱۱]۔ مثلاً جب دو لفظ ملتے جلتے ہوں گے تو وہ رشتہ ہم معنی یا

ہم شکل ہونے کا ہوگا اور اگر دو لفظ مختلف ہوئے تو یہ رشتہ ضد اور تخالف کا ہوگا۔ اس طرح لغوی رشتوں کی کچھ اقسام سامنے آتی ہیں۔ ان کا کچھ جائزہ لیتے ہیں۔

☆ لغوی رشتوں کی اقسام

لغوی یا معنوی رشتے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ رشتے ایک ہی لغوی یا معنوی میدان سے تعلق رکھنے والے الفاظ کے درمیان بھی ہوتے ہیں اور دیگر الفاظ سے بھی ہوتے ہیں جو زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا حصہ ہوتے ہیں [۱۲]۔

لغوی یا معنوی رشتوں کی اقسام جو لسانیات میں زیرِ بحث آتی ہیں، ان کے انگریزی ناموں میں اکثر بلکہ ہمیشہ nym- کا سابقہ آتا ہے۔ nym- یونانی زبان کے جس مادّے سے نکلا ہے اس کے معنی ہیں نام یا اسم یا لفظ [۱۳]۔ لغوی یا معنوی رشتوں کے نام، ان کے انگریزی نام اور ان کی اقسام یہاں پیش ہیں۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ کئی ایک کے نام اور اقسام کا اردو میں ذکر کہیں نہیں ملتا اور ان انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ خود ہی کرنا پڑا۔

ا۔ ترادف (synonymy)

جب دو لفظوں کے معنی ملتے جلتے ہوں یا ان کے معنی قریب قریب ایک ہوں تو یہ لغوی یا معنوی رشتہ ترادُف (synonymy) کہلاتا ہے اور ایسے الفاظ باہمی مترادف الفاظ (synonyms) کہلاتے ہیں۔

یہاں ہم نے یہ لکھنے کی بجائے کہ ''دو الفاظ ہم معنی ہوتے ہیں'' یا ''دونوں کا مفہوم ایک ہوتا ہے'' یہ لکھا ہے کہ ''ان کے معنی قریب قریب ایک ہوں'' کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو دو الفاظ بظاہر ہم معنی ہوتے ہیں ان کے مفہوم یا محلِ ستعمال میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً بڑا اور عظیم بظاہر ہم معنی ہیں لیکن ان کے استعمال میں تھوڑا سا فرق ہے [۱۴]۔ اسی طرح رنج اور غم بظاہر ہم معنی ہیں لیکن ان کا محلِ استعمال مختلف ہے [۱۵]۔

ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی دو لفظ مکمل طور اور خالصتاً ہم معنی ہوں اور اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی زبان میں دو مختلف زبانوں کے الفاظ رائج ہوں جن کا ایک ہی مفہوم ہو، مثلاً

فارسی کا لفظ زمین اور عربی کا ارض دونوں اردو میں مستعمل ہیں اور دونوں مکمل طور پر ہم معنی ہیں [۱۶] (یعنی زمین اور ارض مرادف ہیں، مترادف نہیں ہیں)۔ جب دو لفظ قریب المعنی ہوں تو وہ مترادف کہلانے چاہئیں کیونکہ وہ مرادف نہیں ہوتے [۱۷]۔ ہاں اگر دو لفظ مکمل طور پر ہم معنی ہوں، جیسے زمین اور ارض، تو وہ مرادف کہلائیں گے۔

۲۔ تضاد (antonymy)

الفاظ کے مابین ایک لغوی رشتہ تخالف یا تناقض یا تضاد (antonymy) کا ہوتا ہے یعنی دو الفاظ مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں، ایک دوسرے کے نقیض ہوں تو وہ متضاد (antonym) کہلاتے ہیں [۱۸]۔ یہ بظاہر بہت سادہ سی بات لگتی ہے لیکن اتنی سادہ بھی نہیں ہے کیونکہ متضاد الفاظ کے بعض جوڑے لیجیے، مثلاً:

ٹھنڈا/گرم

زندہ/مردہ

شادی شدہ/کنوارا

اچھا/بُرا

الفاظ کے یہ جوڑے ایسے ہیں جن میں رشتہ تضاد کا ہے لیکن ان میں سے بعض کے رشتے میں ذرا سا فرق ہے [۱۹]۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے چند جملے دیکھیے [۲۰]:

۱۔ یہ پانی نہ ٹھنڈا ہے نہ گرم ہے۔ (ٹھنڈا/گرم = متضاد)

۲۔ وہ آدمی نہ زندہ ہے نہ مردہ۔ (زندہ/مردہ = متضاد)

۳۔ وہ نہ شادی شدہ ہے اور نہ کنوارا ہے۔ (شادی شدہ/کنوارا = متضاد)

۴۔ اس تعلیمی ادارے کا نتیجہ نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ (اچھا/بُرا = متضاد)

آپ اتفاق کریں گے کہ پہلے اور چوتھے جملے کے بارے میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہاں یہ ممکن ہے کہ پانی نہ ٹھنڈا ہو اور نہ گرم (یعنی دونوں کی درمیانی صورت ممکن ہے)۔ اسی طرح نتیجہ اچھا بھی نہ ہو اور برا بھی نہ ہو یہ بھی ممکن ہے (کہ درمیانی درجے کا نتیجہ آیا ہو)، لیکن دوسرے اور

تیسرے جملے کے بارے میں ہر شخص کہے گا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص زندہ بھی نہ ہو اور مردہ بھی نہ ہو اور اسی طرح کوئی شخص یا تو شادی شدہ ہوگا یا کنوارا (دونوں نہ ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے)۔

یعنی دوسرے اور تیسرے جملوں میں متضاد الفاظ کے جو جوڑے آئے ہیں (زندہ/مردہ اور شادی شدہ/کنوارا) ان کی درمیانی صورت ممکن نہیں ہے۔ ان کے معنی قطعی یا مطلق ہوتے ہیں۔ یہ اُن صورتوں میں سے ہے کہ جب ہم کوئی صفت (adjective) استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم زندہ/مردہ کے برعکس قطعی یا مطلق نہیں ہوتا، مثلاً چھوٹا/بڑا کا مفہوم قطعی یا مطلق نہیں ہے بلکہ چھوٹے یا بڑے کے مفہوم کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ لفظ چھوٹا یا بڑا کس چیز کے لیے استعمال ہو رہا ہے[۲۱]۔ مثال کے طور پر ''چھوٹا ہاتھی'' کا موازنہ ''بڑا چوہا'' سے کریں تو ہاتھی جتنا بھی چھوٹا ہو وہ بڑے سے بڑے چوہے سے بہر حال بڑا ہوگا[۲۲]۔ بڑا اور چھوٹا جیسے الفاظ کی درمیانی کیفیات یا درجات ممکن ہیں لیکن زندہ یا مردہ کی کوئی درمیانی کیفیت یا درجہ نہیں ہوسکتا۔

جب متضاد الفاظ کی درمیانی کیفیات یا درجات میں تقسیم ممکن ہو تو اسے قابلِ تقسیم یا تدریجی متضاد (gradable antonyms) کہتے ہیں لیکن جب یہ تقسیم یا درجات کا تعین ممکن نہ ہو تو ایسے متضاد الفاظ کو دوعنصری متضاد یا ثنوی متضاد (binary antonyms) کہتے ہیں[۲۳]۔

۳۔ کثیر معنویت (polysemy)

کثیر معنویت (polysemy) ایک لغوی رشتہ ہے جس میں کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں اور ایسے لفظ کو کثیر معنوی (polysem) کہتے ہیں[۲۴]۔ کثیر معنوی لفظ ایک ہی قواعدی زمرے (مثلاً فعل یا اسم) سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ایک ہی لفظ بطور اسم الگ الگ معنی میں آتا ہے یا بطور فعل الگ الگ معنی میں آتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی لفظ مختلف قواعدی زمروں سے تعلق رکھتے ہوئے (مثلاً بیک وقت اسم اور فعل ہوتے ہوئے) مختلف معنی رکھتا ہو[۲۵]۔

اس کی مثالیں اگر اردو میں دیکھیں تو بہت ملیں گی کیونکہ اردو میں بعض اوقات ایک لفظ کئی کئی معنوں میں بولا جاتا ہے، مثلاً لفظ جوڑا[۲۶] کے اسم کے لحاظ سے چار معنی ہیں:

۱۔ ہر چیز کا جفت (مثلاً دوسرے پاؤں کا جوتا)۔

۲۔ نر مادہ۔

۳۔ مکمل پوشاک (مثلاً شلوار اور قمیض دونوں)۔

۴۔ کپڑے کا تھان یا پارچہ یا خلعت وغیرہ۔

لیکن ''جوڑا'' بطور فعل ''جوڑنا'' کا ماضی بھی ہو سکتا ہے۔

اردو میں مصدر ''ملنا'' کے دس معنی اور ''چلنا'' کے اٹھارہ معنی ہو سکتے ہیں[۲۷]۔ یہ سب کثیر معنوی الفاظ ہیں۔

۴۔ ذیلی اسمیت (hyponymy)

گزشتہ صفحات میں معنوی میدان کے بیان میں لفظ رنگ، لال اور کالا وغیرہ کی مثال پیش کی گئی تھی۔ یہاں اس مثال کو دو اصطلاحات کی وضاحت کے لیے پھر پیش کیا جا رہا ہے۔

کسی چیز (مثلاً رنگ) کی تحتی یا ذیلی قسمیں ہوں (مثلاً لال، کالا) تو اس عمومی قسم (رنگ) کو جو گویا بالائی سطح پر ہوتا ہے بالائی نام (hypernym) اور اس کے ذیل میں آنے والی قسموں (مثلاً لال، کالا) کو ذیلی نام (hyponym) کہہ سکتے ہیں اور یہ رشتہ ''ذیلی اسمیت'' (hyponymy) کہلاتا ہے[۲۸]۔

اس بات کو اس نقشے کی مدد سے بھی سمجھا جا سکتا ہے:
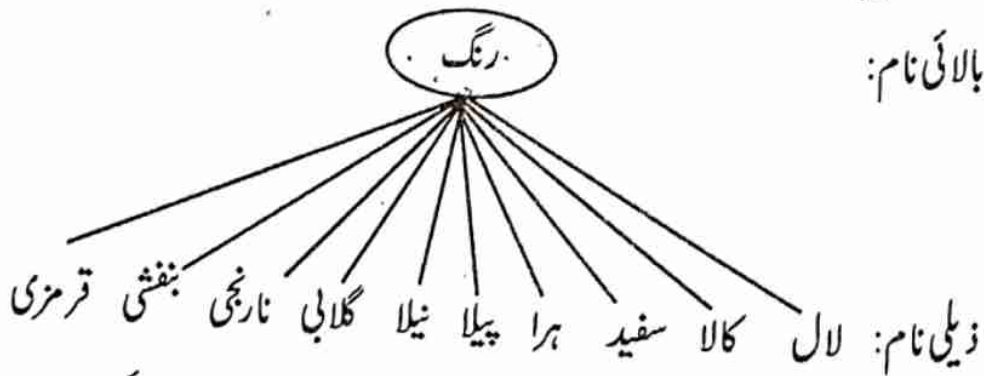
عرض ہے کہ ان انگریزی اصطلاحات کے اردو ترجمے دست یاب یا رائج نہ ہونے پر یہ اصطلاحات وضع کی گئی ہیں (اس میں آسان الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے، اگرچہ بالائی نام کو اسم بالا یا

اسم مافوق بھی کہا جا سکتا ہے اور ذیلی نام کو اسمِ ذیل یا اسم زیریں بھی کہہ سکتے ہیں)۔ ان اردو تراجم کی بنیاد انگریزی لفظ کا اشتقاق ہے۔ ہائپر (-hyper) یونانی زبان کے جس مادے سے نکلا ہے اس کے معنی ہیں اونچا، بالا، بالائی، مافوق، زیادہ، بیش وغیرہ [29]۔ یہ ہائپو (-hypo) کی ضد ہے۔ گویا بالائی نام کا لغوی رشتہ اس لفظ کے ساتھ ہوتا ہے جو hyponym یا ذیلی نام کہلاتا ہے۔ ہائپو (-hypo) یونانی زبان کے جس مادّے سے نکلا ہے اس کے لفظی معنی ہیں نیچا، ذیلی، زیریں، تحتی، ہلکا، کم وغیرہ [30]۔ یہ ہائپر (-hyper) کی ضد ہے۔ اس کا ذکر اوپر ''بالائی نام'' کے ضمن میں آ چکا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے مزید مثالیں پیش ہیں: لفظ ''جانور'' بالائی نام'' ہے اور اس کی ذیلی قسمیں یعنی کتا، بلی اور گائے وغیرہ اس کے ''ذیلی نام'' ہیں۔ ''پھول'' بالائی نام'' ہے اور گلاب، چنبیلی، موتیا اور نرگس وغیرہ اس کے ''ذیلی نام'' ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ بالائی نام اور ذیلی نام کا رشتہ صرف اسم (noun) یا جانوروں اور پھولوں جیسی چیزوں تک محدود نہیں ہے بلکہ بسا اوقات یہ فعل (verb) یا مصدر (infinitive) میں بھی نظر آتا ہے مثلاً بالائی نام ''پکانا'' کے ذیلی نام اُبالنا، سینکنا، تلنا، بھوننا وغیرہ ہو سکتے ہیں [31]۔

بعض اوقات ایک زبان کے کسی بالائی نام کا ذیلی نام دوسری زبان میں اس کا حصہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم اردو میں وہیل کو وہیل مچھلی بھی کہتے ہیں اور ڈولفن کو بھی مچھلی کہا یا سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں مچھلی بالائی نام ہے جس کے ذیلی نام راہو، سرمئی، پاپلیٹ، شارک، ڈولفن اور وہیل وغیرہ ہیں۔ حالانکہ ماہرینِ حیوانیات کے مطابق وہیل اور ڈولفن ممالیہ جانور (mammal) ہیں اور انھیں انگریزی میں بالائی نام ''فِش'' (fish) کا ذیلی حصہ نہیں سمجھا جاتا [32]۔

بنیادی بات یہ ہے کہ بالائی نام اور ذیلی نام کا رشتہ ان لغوی رشتوں میں سے ہے جو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں پائے جاتے ہیں اور اس رشتے کی بنیاد شمول ہے کہ ایک چیز میں کئی چیزیں شامل ہیں۔

۵۔ کُل اسمیت (holonymy)

وہ لفظ جو ایسی چیز کو ظاہر کرے جس کے حصے دوسری چیزوں پر مشتمل ہوں انگریزی میں

(holonym) کہلاتا ہے۔ اردو میں اسے اسمِ کُل یا اسمِ مشمول (holonym) کہنا چاہیے۔ مثلاً لفظ ''درخت'' ایک ایسی چیز کو ظاہر کر رہا ہے میں دوسری چیزیں مثلاً تنا، شاخ، پتا وغیرہ شامل ہیں۔ پس لفظ درخت اسمِ کل (holonym) ہے۔ یہاں تنا، پتا اور شاخ وغیرہ اسمِ جزو (meronym) ہیں۔ کل اور جزو کے اس لغوی رشتے کو کُل اسمیت (holonymy) کہہ سکتے ہیں اگرچہ اردو میں اس کے لیے کوئی باقاعدہ اصطلاح نہیں ہے۔ اس کے انگریزی نام میں -holo کا سابقہ ہے جو یونانی میں کُل یا تمام یا مجموعی کے مفہوم میں آتا ہے[۳۳]۔

اسمِ جزو کے انگریزی نام میں -mero کا سابقہ یونانی سے آیا ہے اور اس کے لفظی معنی ہیں: جزو یا حصہ[۳۴]۔

۶۔ تجنیسِ تام (homonymy)

دو الفاظ اگر ایک ہی ہجے اور تلفظ رکھتے ہوں لیکن معنی کے لحاظ سے مختلف ہوں تو homonyms کہلاتے ہیں اور یہ کیفیت homonymy کہلاتی ہے[۳۵]۔ اسے اردو میں تجنیس کہہ سکتے ہیں لیکن چونکہ مشرقی ادبیات والسنہ میں تجنیس کی کئی قسمیں ہیں اس لیے اسے اردو میں تجنیسِ تام کہنا چاہیے۔

انگریزی میں اس کی مثال bat (بمعنی چمگادڑ) اور bat (بمعنی کرکٹ کا بلّا) کے الفاظ ہیں جن کا املا اور تلفظ یکساں ہے لیکن مفہوم مختلف ہے[۳۶]۔ اس کرکٹ پر یاد آیا کہ لفظ کرکٹ cricket بھی دو ہیں۔ ایک کرکٹ (cricket) گیند بلّے کا کھیل ہے اور دوسرا کرکٹ (cricket) جھینگر کے معنی میں ہے اور دونوں کے ہجے اور تلفظ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ تجنیسِ تام ہے۔

اس لفظ ''ہومونیمی'' کے انگریزی نام میں سابقہ -homo آتا ہے جو یونانی کے ایک لفظ سے مشتق ہے اور جس کے معنی ہیں: مشترک، ویسا ہی، وہی[۳۷]۔

علمِ بدیع کے ماہرین نے تجنیس کی کئی قسمیں بیان کی ہیں مثلاً یہ کہ:

''صنعتِ جناس وہ کہ دو لفظ تلفظ میں مشابہ ہوں اور معنی میں متغایرہ، اس کو تجنیس بھی کہتے ہیں''[۳۸]۔ لیکن اس میں انھوں نے املا کے معمولی فرق کو بھی تجنیس کی ایک شکل تسلیم کیا ہے

نیز لفظ کے الگ الگ قواعدی زمروں (مثلاً اسم اور فعل) ہونے کی صورت میں بھی ان کے الگ الگ نام رکھے ہیں[۳۹]۔ بہرحال، بنیادی بات یہ ہے کہ ایک ہی املے اور تلفظ کے حامل دو مختلف الفاظ کو متجانس اور اس لغوی رشتے کو تجنیس یا جناس کہتے ہیں۔ یادرہے کہ دو الفاظ بالکل یکساں املا اور تلفظ لیکن مختلف معنی کے حامل ہوں تو علمِ بدیع میں اسے تجنیسِ تام کہتے ہیں۔ تجنیس کی کئی قسمیں ہیں لیکن ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے[۴۰]۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تجنیس تام میں دونوں الفاظ کا بالکل الگ الگ وجود کا حامل ہونا ضروری ہے یعنی اگر ایک ہی لفظ کے دو معنی ہیں تو وہ تجنیس نہیں بلکہ کثیر معنویت ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ تجنیس میں دونوں لفظ الگ ہوتے ہیں یعنی اپنی اصل اور مادّے اور اشتقاق کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور ایسے الفاظ کا اندراج جب لغت میں کیا جاتا ہے تو ان کو الگ الگ یعنی دو بار لغت میں لکھا جاتا ہے اور ان کا الگ الگ ماخذ اور اشتقاق بتایا جاتا ہے، مثلاً لفظ ''بر'' کا اندراج اردو لغت بورڈ کی لغت میں متعدد بار کیا گیا ہے اور ہر بار اس کا الگ اشتقاق اور ماخذ درج کیا گیا ہے[۴۱]۔ اور اس طرح کی کثیر مثالیں لغات میں موجود ہیں اس کے برعکس کثیر معنوی لفظ کو لغت میں ایک ہی بار لکھ کر اس کے مختلف معنی شق وار بیان کیے جاتے ہیں کیونکہ اصلاً وہ ایک ہی لفظ ہوتا ہے اور اس کا مادہ یا اشتقاق ایک ہی ہوتا ہے اگرچہ وہ مختلف معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔

حواشی:

۱۔ بٹی جے برنر (Betty J. Birner)، Introduction to Pragmatics، (چیچسٹر: ولی بلیک ویل، ۲۰۱۳ء)، ص ۱ (نیز اس پر پچھلے باب میں بھی گفتگو ہو چکی ہے)۔
۲۔ ایضاً۔
۳۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguine Dictionary of Language، (لندن: پینگوین، ۱۹۹۹ء)، ص ۳۰۰
۴۔ ہارورڈ جیکسن و دیگر (Howard Jackson Et al)، Words, Meanings and Vocabuary (لندن: کنٹینیم، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۴۔
۵۔ ایضاً، ص ۱۶۔
۶۔ پی ایچ میتھیوز (P.H.Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Linguistics (نیویارک: اوکسفرڈ، ۱۹۹۷ء)، ص ۳۳۴۔
۷۔ Language: Its Structure and Use، (فورٹ ورتھ: ہارکوٹ بریس، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۹۰۔
۸۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguine Dictionary of Language، محولۂ بالا، ص ۳۰۱۔
۹۔ جارج یول (George Yule)، The Study of Language، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۱۸۔
۱۰۔ ایضاً۔
۱۱۔ ہارورڈ جیکسن و دیگر، محولۂ بالا، ص ۱۵۔۱۴
۱۲۔ ایڈورڈ فنیگن (Edward Finegan)، Language: Its Structure and Use، محولۂ بالا، ص ۱۹۱۔
۱۳۔ Concise Oxford Dictioanry، (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء)، [گیارھواں ایڈیشن]۔
۱۴۔ آر ایل ٹراسک (R.L.Trask)، Language: The Basics، (لندن: روتلیج، ۲۰۰۴ء)، ص ۵۴۔
۱۵۔ برج موہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ (لاہور: معین الادب، ۱۹۵۰ء)، ص ۹۶۔۹۵ [طبع دوم]
۱۶۔ گیان چند، عام لسانیات، (دہلی: قومی اُردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص ۳۰۰۔
۱۷۔ برج موہن دتاتریہ کیفی کیفیہ، محولۂ بالا، ص ۹۵۔
۱۸۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language، (میلبرن، تھامس پبلشنگ، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۶۳۔
۱۹۔ آر ایل ٹراسک، محولۂ بالا، ص ۵۴۔
۲۰۔ یہ جملے آر ایل ٹراسک (محولۂ بالا) سے ماخوذ ہیں، ص ۵۵۔۵۴

۲۱۔ وکٹوریا فرامکن، محولۂ بالا، ص ۱۶۴۔
۲۲۔ ایضاً۔
۲۳۔ آرایل ٹراسک، محولۂ بالا، ص ۵۵۔
۲۴۔ ایڈرین اکماجین ودیگر، (Adrian Akmajian Et al)، (کیمبرج (میساچوسٹس): ایم آئی ٹی پریس، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۳۵۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۲۳۷۔۲۳۵۔
۲۶۔ لفظ ''جوڑا'' کی مثال سہیل بخاری کی کتاب معنویات (سرگودھا: آزاد بک ڈپو، ۱۹۷۶ء) سے لی گئی ہے (ص ۴۹) لیکن اس کے بطور اسم کے معنی کے لیے علمی اردو لغت (مرتبہ وارث سرہندی) سے مدد لی گئی ہے (لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۵ء)۔
۲۷۔ سہیل بخاری، معنویات، محولۂ بالا، ص ۶۸۔۶۳
۲۸۔ ایڈورڈ فنیگن، محولۂ بالا، ص ۱۹۱۔
۲۹۔ Concise Oxford Dictioanry نیز Thw Oxford English-Urdu Dictioanry (مرتبہ شان الحق حقی)، (کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء) [اشاعتِ ثانی]۔
۳۰۔ ایضاً۔
۳۱۔ فنیگن، محولۂ بالا، ص ۱۹۲۔
۳۲۔ مثال فنیگن نے کسی اور زبان سے دی ہے (ص ۱۹۲) لیکن اردو میں بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے لہٰذا ہم نے اردو کی مثالیں دی ہیں۔
۳۳۔ کنسائز اوکسفرڈ ڈکشنری۔
۳۴۔ ایضاً۔
۳۵۔ وکٹوریا فرامکن، محولۂ بالا، ص ۱۶۲۔
۳۶۔ ایضاً۔
۳۷۔ Concise Oxford Dictioanry، محولۂ بالا، نیز The Oxford English-Urdu Dictioanry (مرتبہ شان الحق حقی)، محولۂ بالا۔
۳۸۔ امام بخش صہبائی، حدائق البلاغت (مرتبہ مزمل حسین)، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۴۷
۳۹۔ نجم الغنی رام پوری، بحر الفصاحت (حصۂ ششم و ہفتم) (مرتبہ سید قدرت نقوی) (لاہور مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۰ء)، دیکھیے: پہلا باغ؛ نیز حدائق البلاغت، محولۂ بالا، ص ۱۴۷ و بعدہٗ۔
۴۰۔ اس کی تفصیل متعدد کتاب میں موجود ہے مثلاً۔ بحر الفصاحت (حصہ ششم و ہفتم)، محولۂ بالا، نیز حدائق ابلاغت، محولۂ بالا، ص ۱۴۷ و بعدہٗ۔
۴۱۔ ملاحظہ ہو: اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۲، (کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء)۔

☆......☆......☆

ساتواں باب: صوتیات (۱)

صوت،صوتیات اور صوتیہ

جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں ان آوازوں کے بارے میں کوئی احساس نہیں ہوتا جو ہم منھ سے ادا کر رہے ہوتے ہیں اور نہ ہمیں یہ خیال آتا ہے کہ ہم گفتگو کے لیے اپنے ہونٹوں، زبان، تالو، حلق اور دانتوں سے کیا کام لیتے ہیں[1]۔ مثال کے طور پر جب ہم غالب کا یہ شعر پڑھتے ہیں:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

تو ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ پہلا مصرع پڑھتے ہوئے ہماری زبان کی نوک جب بار بار ہمارے اوپر کے دانتوں سے ٹکراتی ہے تب ہم ''دال'' (د) اور ''تے'' (ت) کی آوازیں ادا کر پاتے ہیں۔ لیکن اس شعر کے دوسرے مصرعے کو پڑھتے ہوئے ہماری زبان کا سرا صرف ایک بار اوپر کے دانتوں کو چھوتا ہے کیونکہ ہمیں اس میں صرف ایک بار ''ت'' بولنا ہے۔ پہلے مصرعے کی آوازیں ادا کرتے ہوئے ہمارے دونوں ہونٹ صرف ایک بار ملیں گے، جب ہم ''بھ'' کی آواز ادا کریں گے لیکن دوسرے مصرعے میں ہمیں تین بار دونوں ہونٹوں کو ملانا پڑے گا تا کہ ہم ''میم'' (م) اور بے (ب) کا تلفظ کر سکیں۔

اس طرح کی کچھ اور مثالیں دیکھیے: ''ٹ'' کی آواز ادا کرنے کے لیے ہمیں زبان کو موڑ کر اس کا سرا تالو سے لگانا پڑتا ہے۔ جب ہم ''ش'' کی آواز نکالتے ہیں تو ہماری زبان اور تالو کے درمیان ایک چھوٹا سا خلا ہوتا ہے جس سے ہماری سانس گزرتی ہے لیکن جب ہم ''چ'' بولتے ہیں تو ہماری زبان کا درمیانی حصہ ایک لمحے کے ذرا سے حصے کے لیے تالو سے چپک جاتا ہے

کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہم ''چ'' کی آواز ادا نہیں کر سکتے[۲]۔ گفتگو کرتے ہوئے ہمارے ہونٹ کبھی گول ہو جاتے ہیں (مثلاً خور، خون اور جھوم وغیرہ بولتے ہوئے)، کبھی پھیل جاتے ہیں (مثلاً جھیل یا چیل بولتے ہوئے)، کبھی ہماری زبان ذرا سی اکڑ جاتی ہے (مثلاً ''اُو'' بولتے ہوئے) اور کبھی ہماری زبان ڈھیلی پڑ جاتی ہے (مثلاً ''اَ'' بولتے ہوئے)[۳]۔

پھر یہ کہ جب ہم گفتگو کرتے ہوئے ایک آواز ادا کر رہے ہوتے ہیں تو ہماری زبان اگلی آواز کی ادائی کے لیے بالکل تیار ہوتی ہے[۴] اور ہم گفتگو کرتے ہوئے مسلسل مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں اور اس کے لیے اپنی زبان کو حرکت دیتے ہیں، زبان کو منھ میں مختلف مقامات سے ٹکراتے ہیں، کبھی سانس کو ایک لمحے کے ذرا سے حصے کے لیے روکتے ہیں، کبھی ہونٹوں کو ملاتے ہیں اور کبھی انھیں گول کر لیتے ہیں، لیکن ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

کسی زبان کو بولتے ہوئے جو آوازیں ہمارے منھ سے ادا ہوتی ہیں ان آوازوں کو ادا کرنے کا انداز (جن میں سے کچھ کا ذکر سطورِ بالا میں ہوا) اور ان آوازوں کے مخرج (مقام) کی نشان دہی نیز ان آوازوں سے متعلق دیگر خصوصیات جس علم میں بیان کی جاتی ہیں اسے صوتیات کہتے ہیں۔ لفظ صوتیات مرکب ہے صوت اور یات کا۔ صَوت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں آواز، یعنی جسے انگریزی میں ساونڈ (sound) کہتے ہیں اسے عربی میں صوت کہا جاتا ہے اور فارسی میں آواز۔ اردو میں آواز اور صوت دونوں لفظ مستعمل ہیں۔ ''یات'' کا لاحقہ اردو میں کسی علم یا فن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا صوتیات آوازوں کا علم ہے۔

کسی زبان کو بولتے ہوئے جو آوازیں ہمارے منھ سے نکلتی ہیں وہ ایک مسلسل تار کی شکل میں ہوتی ہیں لیکن جو شخص اس زبان کو سمجھتا اور جانتا ہے وہ ان آوازوں کو الگ الگ کر کے پہچان لیتا ہے۔ البتہ ان آوازوں کا تحریری شکل یا حروف یعنی لکھی ہوئی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا[۵]۔ یہی وجہ ہے کہ ان پڑھ شخص بھی اپنی زبان کو سن کر سمجھ لیتا ہے کیونکہ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس زبان کی مفرد آوازوں کو الگ الگ کر کے شناخت کر سکے اور سمجھ سکے کہ ان مفرد آوازوں کے ملنے سے کیا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ دراصل یہی مفرد آوازیں مل کر لفظ بناتی ہیں اور لفظ مل کر جملہ

بناتے ہیں[6]۔ یہ آوازیں جو بظاہر مل کر بامعنی لفظ بنا دیتی ہیں بذاتِ خود انفرادی طور پر بے معنی ہوتی ہیں لیکن یہ آوازیں صوتی اکائیاں ہیں۔ یہی آوازیں یا صوتی اکائیاں مل کر بامعنی لفظ کی مجموعی آواز بنتی ہیں[7]۔

☆ صوتِ تکلم (speech sound)

صوتیات سے متعلق مباحث میں جو اصطلاحات بار بار آتی ہیں ان میں صوتِ تکلم بھی ہے جسے انگریزی میں speech sound کہا جاتا ہے۔ لسانیات کی اصطلاح میں تکلم (speech) سے مراد ہے گفتگو، بات۔ صوتِ تکلم وہ آواز ہوتی ہے جو گفتگو میں استعمال ہو۔ گفتگو کا عمل کیسے ہوتا ہے؟ اس طرح کہ ہم سانس اندر لیتے ہیں، پھیپھڑوں میں ہوا لے جاتے ہیں اور یہ سانس منھ سے خارج کرتے ہوئے آوازیں نکالتے ہیں جو گفتگو میں استعمال ہوتی ہیں، یہی آوازیں اصواتِ تکلم (speech sounds) کہلاتی ہیں[8]۔ اندازہ ہے کہ دنیا میں پانچ ہزار سے لے کر آٹھ ہزار تک زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان میں دو سو سے تین سو تک اصواتِ تکلم پائی جاتی ہیں[9]۔ لیکن ہر صوت (یعنی آواز) ہر زبان کی گفتگو میں استعمال نہیں ہوتی، مثلاً ق اور غ کی آوازیں انگریزی میں استعمال نہیں ہوتیں لہٰذا یہ انگریزی کی اصواتِ تکلم نہیں ہیں۔ جو آواز جس زبان کے کسی بامعنی لفظ میں استعمال ہوتی ہے وہ آواز اس زبان کی صوتِ تکلم ہوتی ہے۔

☆ صوتیات (Phonetics)

لسانیات کی ایک اہم شاخ فنیٹکس (Phonetics) ہے جسے اردو میں صوتیات کہا جاتا ہے اور، جیسا کہ سطورِ بالا میں ذکر ہوا ہے، صوت کے معنی ہیں ''آواز''۔ ''یات'' کا لاحقہ چونکہ اردو میں علم و فن کے لیے آتا ہے لہٰذا صوتیات کے معنی ہوئے آوازوں کا علم۔

صوتیات کی ایک تعریف یہ ہے:

> Phonetics is the study of sounds made in the production of human languages.[10]

اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا جا سکتا ہے:

انسانی زبانوں میں گفتگو میں جو آوازیں نکالی جاتی ہیں، ان کا مطالعہ صوتیات ہے۔

ایک اور تعریف یہ ہے:

Phonetics is the study of how speech sounds are made, transmitted and received. [11]

یعنی صوتیات کا علم آوازوں (یعنی اصوات) کا مطالعہ کرتا ہے کہ آوازیں کیسے بنتی ہیں اوران کی ترسیل کیسے ہوتی ہے اور انھیں سنا اور سمجھا کیسے جاتا ہے۔صوتیات کی تعریف کئی کتابوں میں ملتی ہے اوران سب کا خلاصہ بیان کیا جائے تو وہ کچھ یوں ہوگا کہ صوتیات کا کام یہ ہے کہ وہ ''سائنسی انداز'' میں بیان کرے کہ کسی زبان کے الفاظ میں کون کون سی اصواتِ تکلم پائی جاتی ہیں [۱۲]۔

نیز یہ کہ صوتیات کا علم یہ بھی بتاتا ہے کہ کسی زبان کی اصوات (اعضائے تکلم کی مدد سے) کیسے ادا کی جاتی ہیں، پھر یہ کہ ان اصوات کے بولے جانے میں عضویاتی طور پر کیا عمل ہوتا ہے یعنی کون کون سے عضو (مثلاً زبان، ہونٹ، دانت، مسوڑھے وغیرہ) اصوات کے ادا کرنے میں کام کرتے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں [۱۳]۔

صوتیات میں ''اصواتِ تکلم کا سائنسی مطالعہ'' اور اصواتِ تکلم کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا بھی آجاتا ہے جس میں صوتیے (vowels)، مصمتے (consonants)، آواز کا اُتار چڑھاؤ اور اس کی تلحین (intonation) وغیرہ بھی شامل ہیں [۱۴]۔

☆ صوتیات کے شعبے

صوتیات کو تین ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو یہ ہیں [۱۵]:

(۱) تلفیظی صوتیات (articulatory phonetics)

(۲) ترسیلی یا سمعیاتی صوتیات (acoustic phonetics)

(۳) سمعی صوتیات (auditory phonetics)

ان کی مختصراً وضاحت یوں کی جاسکتی ہے:

(۱) تلفیظی صوتیات (articulatory phonetics)

اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ گفتگو میں اصواتِ تکلم کو خاص انداز میں بنانے اور ادا کرنے میں کون کون سے اعضائے تکلم (speech organs) کام کرتے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں (مثلاً زبان، دانت، تالو، مسوڑھے، حلق اور ہونٹوں وغیرہ کا کسی صوتِ تکلم یعنی آواز کے بنانے اور ادا کرنے میں کیا کام ہوتا ہے)۔ لسانیاتی مطالعات میں صوتیات کی اسی شاخ پر عموماً زیادہ اظہار خیال کیا جاتا ہے اور اس کا عضویات اور علمِ تشریح ابدان سے بھی تعلق ہے۔

(۲) ترسیلی یا سمعیاتی صوتیات (acoustic phonetics)

اردو کی بعض کتابوں اور لسانیات کی اصطلاحات کی اردو فرہنگوں میں acoustic اور audiotry دونوں کا ایک ہی ترجمہ یعنی ''سمعی'' کیا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ acoustic طبیعیات کی اصطلاح بھی ہے اور اس کا تعلق آواز کی طبعی یعنی فزیکل (physical) خصوصیات اور آواز کی ترسیل سے ہے۔ گوپی چند نارنگ[۱۶] اور بعض دیگر ماہرین اسے سمعیاتی صوتیات کہتے ہیں لہٰذا ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

سمعیاتی صوتیات کا سروکار آوازوں کی طبعی خصوصیات سے ہے یعنی جب آوازیں قائل (یعنی بولنے والے) (speaker) کے منھ سے نکلتی ہیں اور ہوا کی لہروں پر سفر کرتی ہوئی سامع (یعنی سننے والے) (listener) کے کان تک پہنچتی ہیں تو ترسیل کے اس عمل میں ان کی طبعی حالت یا خاصیتیں کیا ہوتی ہیں۔ اس کا طبیعیات (یعنی فزکس) سے بھی تعلق ہے۔

(۳) سمعی صوتیات (auditory phonetics)

سامع یعنی سننے والے کے کان اور دماغ پر آواز کے پہنچنے کے بعد جو اثرات مرتب ہوتے ہیں سمعی صوتیات ان سے بحث کرتی ہے۔ اس کا اعصابیات (neuroscience) سے بھی تعلق ہے۔

☆ آواز کی اکائی: صوتیہ یا فونیم (phoneme)

ہر زبان میں چھوٹی چھوٹی آوازیں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، مثلاً

''ب'' کی آواز اور اور ''پ'' کی آواز۔ اس فرق کی اہمیت یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں اس ایک آواز کی جگہ بدل دی جائے تو لفظ کا مفہوم بدل جاتا ہے، مثلاً:

باب اور باپ

لفظوں کے اس جوڑے میں آخری آواز بدل دی جائے یعنی ب کی آواز کی بجائے پ کی آواز ادا کی جائے تو مفہوم بدل جاتا ہے۔ گویا آواز کی تبدیلی سے مفہوم بدلتا ہے۔ اسی طرح ''الف'' کی آواز اور ''ی'' کی آواز کو لیجیے۔ مثلاً:

مال اور میل

میں درمیانی آواز بدلنے یعنی ''الف'' کی بجائے ''ی'' بولنے سے مفہوم بدل جاتا ہے۔ لسانیات کی زبان میں ان مختصر ترین، مفرد اور ممتاز آوازوں کو (جن کے بدلنے سے لفظ کا مفہوم بدل جاتا ہے) صوتیہ یا فونیم (phoneme) کہتے ہیں۔ گویا ''ب'' اور ''پ'' کی آوازیں صوتیے یا فونیم ہیں۔ اسی طرح ''الف'' اور ''ی'' کی آوازیں بھی صوتیے ہیں۔

صوتیہ یا فونیم (phoneme) صوتیات کی اہم اصطلاح ہے اور اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

A phoneme is a minimal unit of sound [۱۷]

یعنی صوتیہ (فونیم) آواز کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ جو گفتگو ہم کرتے ہیں ان میں بہت سی آوازیں ایک ساتھ ہمارے منھ سے نکل رہی ہوتی ہیں لیکن ان سب آوازوں کو بہت چھوٹے چھوٹے اور تنہا ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ آواز کے اس چھوٹے سے چھوٹے یعنی مختصر ترین، الگ اور تنہا ٹکڑے کو (جسے مزید نہ توڑا جا سکے) ''صوتیہ'' یا فونیم (phoneme) کہتے ہیں۔ صوتیہ آواز کا وہ مختصر ترین قطعہ یا ٹکڑا (segment) ہے جو دوسرے صوتیوں سے الگ اور ممتاز ہوتا ہے۔

آسان لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ آواز کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا یا کوئی مختصر ترین، اکیلی اور منفرد آواز جو کسی بامعنی لفظ میں آئے وہ صوتیہ ہے۔ جن اصواتِ تکلم (speech sounds) کا

ہم نے اس باب کے ابتدا میں ذکر کیا تھا وہ بھی صوتیے ہی ہوتے ہیں۔ صوتِ تکلم یا صوتیے کو لسانیات کی کتابوں میں کبھی sound segment (یعنی قطعہ صوت یا آواز کا ٹکڑا) یا کبھی کبھی صرف segment یعنی ٹکڑا یا قطعہ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ لسانیات کی ایک اصطلاح tract (یعنی جسم کا کوئی حصہ یا عضو یا جسمانی نظام کا کوئی قطعہ) کا ترجمہ بھی اردو میں "قطعہ" کیا جاتا ہے (مثلاً vocal tract یعنی قطعہ صوت) لہٰذا ہم نے یہاں احتیاطاً segment کے ساتھ "ٹکڑا" بھی لکھا ہے اور یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں "سگمنٹ" کے اسی آسان ترجمے یعنی "ٹکڑا" کو رواج دیا جائے۔

اصواتِ تکلم یا صوتیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں: مصوتے اور مصمتے۔ لیکن صوتیوں کی قسموں کی تفہیم سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کوئی بھی صوتیہ گفتگو کے دوران میں کس طرح ادا کیا جاتا ہے (اس عمل کو تلفیظ کہتے ہیں)۔ اس کے بعد ہم صوتیوں کی قسموں پر بات کریں گے کیونکہ مصوتے اور مصمتے کی تعریف میں ان کے ادا کرنے کے عمل (یعنی تلفیظ) کا بھی ذکر ناگزیر ہوتا ہے۔

☆ تلفیظ (articulation)

صوتیات کی ایک عام اور اہم اصطلاح تلفیظ (articulation) ہے۔

تلفظ اور تلفیظ میں تھوڑا سا فرق ہے۔ تلفظ (pronunciation) سے مراد ہے وہ انداز جس میں الفاظ میں موجود صوتیوں یا اصواتِ تکلم کو ہم ادا کرتے ہیں اور جس طرح وہ سامع کو سنائی دیتے ہیں لیکن تلفیظ (articulation) سے مراد ہے صوتیوں کی آواز کو ادا کرنے کے لیے اعضائے تکلم (speech organs) (یعنی ہونٹ، دانت، مسوڑھے یا زبان وغیرہ) کا استعمال۔ تلفیظ کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ کسی خاص صوتیے مثلاً "م" یا "ج" یا "ت" کی آواز کو ادا کرنے کے لیے ہم کون سے اعضائے تکلم (مثلاً ہونٹ، زبان، دانت وغیرہ) استعمال کرتے ہیں اور اس عمل میں کیا کرتے ہیں[۱۸]، مثلاً ایک لمحے کے ذرا سے حصے میں سانس روکتے ہیں یا نہیں اور ہمارے منھ کے خلا، ہونٹ اور زبان وغیرہ کی کیفیت کوئی آواز ادا کرتے وقت کیا ہوتی ہے۔

صوتیاتی مباحث میں صوتیے کی دو قسموں (یعنی مصوتہ اور مصمتہ) کی تعریف اور وضاحت کے لیے تلفیظ (articulation) کی اصطلاح کی مدد لی جاتی ہے۔مصوتوں اور مصمتوں کی تعریف بیان کرتے ہوئے تین اصطلاحات اور بھی استعمال ہوتی ہیں اور وہ ہیں منھ کا خلا یا جوفِ دہن (oral cavity)،صوتی قطعہ (vocal tract) اور تنگی (constriction) ۔لہٰذا ان اصطلاحات کو بھی دیکھ لیا جائے تاکہ مصوتے اور مصمتے کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

☆ جوفِ دہن (oral cavity)

جوفِ دہن کو آسان زبان میں منھ کا خلا کہہ لیجیے۔انسان کے منھ میں حلق سے لے کر ہونٹوں تک جو خالی جگہ ہوتی ہے اسے جوفِ دہن یا منھ کا خلا کہتے ہیں۔جب ہم کسی صوت تکلم کی تلفیظ کرتے ہیں (یعنی کسی آواز کو خاص طریقے سے بنا کر ادا کرتے ہیں) تو سانس ہمارے پھیپھڑوں سے نکل کر حلق سے ہوتی ہوئی اسی جوفِ دہن سے گزرتی ہے[19]۔

☆ صوتی قطعہ (vocal tract)

آسان الفاظ میں اس کا نام آواز کا راستہ یا صوتی راستہ سمجھ لیجیے۔حلق سے لے کر منھ کے خلا اور ناک کے خلا کو ملا کر صوتی قطعہ (vocal tract) کہتے ہیں۔پھیپھڑے سے آنے والی سانس جب آلۂ صوت (sound box) (جسے حنجرہ یعنی larynx بھی کہتے ہیں) سے ہوتی ہوئی اس راستے یعنی صوتی قطعے سے گزرتی ہے تو ہم اسے اعضائے تکلم کی مدد سے کسی خاص آواز کی شکل دیتے ہیں[20]۔

☆ تنگی (constriction)

آواز کے جس راستے یا صوتی قطعے کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس میں بولتے وقت یعنی کسی صوتیے کی تلفیظ کے وقت کچھ بندش یا رکاوٹ یا سکیڑ پیدا ہوتی ہے جسے اصطلاحاً تنگی (constriction) کہتے ہیں[21]۔جیسے حرف ''ش'' کی آواز ادا کرنے کے لیے زبان کے درمیانی حصے کو ذرا سا اوپر اُٹھا کر تالو کے قریب کرنا پڑتا ہے اور زبان اور تالو کے درمیان بننے والی تنگ جگہ

میں سے سانس گزرتی ہے تو ہم ''شین'' کی آواز بول پاتے ہیں۔اسی قسم کی تنگی یا سکیڑ یا کھنچاؤ کا نام اصطلاح میں ''تنگی'' ہے۔

☆ صوتیہ (phoneme) کیسے بنتا ہے؟

جب ہم سانس اندر لیتے ہیں تو ہوا پھیپھڑوں میں جاتی ہے۔اسی سانس کو ہم باہر نکالتے ہیں تو وہ پہلے آلۂ صوت یا حنجرے (یعنی آواز کے ڈبے یا ساونڈ بکس (sound box)) سے گزرتی ہے۔آلۂ صوت میں صوتی تار (vocal cords) لگے ہوتے ہیں (جن کو لسانیات کی بعض کتابوں میں صوتی ڈھکنے (vocal folds) بھی لکھا گیا ہے)۔ہوا کے گزرنے سے ان صوتی تاروں یا ڈھکنوں میں ارتعاش یا جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے اور اس طرح آواز پیدا ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کسی تنگ جگہ مثلاً بانسری سے ہوا گزرنے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔آواز پیدا ہونے کے اس عمل کو صدا سازی یا فونیشن (phonation) کہتے ہیں۔اب یہ آواز حلق سے ہوتی ہوئی جب ہمارے صوتی قطعے (vocal tract) یعنی آواز کے راستے (جس میں منھ کا خلا اور ناک کا خلا بھی شامل ہے) سے گزرتی ہے تو ہم اس میں اعضائے تکلم کی مدد سے ایک طرح کی رکاوٹ یا تنگی (constriction) پیدا کرتے ہیں، مثلاً زبان کی نوک کو اوپر کے دانتوں کی جڑ سے لگاتے ہیں اور ''د'' کی آواز پیدا ہوتی ہے۔یا اپنی زبان کے درمیانی حصے کو تالو کی چھت سے لگا دیتے ہیں تو ''چ'' پیدا ہوتی ہے۔''ٹ'' کی آواز بنانے کے لیے ہم اپنی زبان کو موڑ کر اس کی نوک کو تالو کی چھت سے لگاتے ہیں۔

یہ سارا عمل تلفیظ (articulation) کہلاتا ہے اور نتیجے میں صوتِ تکلم (speech sound) پیدا ہوتی ہے، یہی صوتِ تکلم صوتیہ یا فونیم (phoneme) بھی کہلاتی ہے[۲۲]۔

☆ صوتیے کی قسمیں: مصوتے اور مصمتے

صوتیے یا فونیم (phoneme) دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) مصوتے (vowels)

(۲) مصمتے (cnsonants)۔

☆ **مصوتہ** (vowel)

صوتیات میں مصوتے یا واول (vowel) کی تعریف یوں بیان کی جاتی ہے:

مصوتہ (vowel) وہ صوت ہے جس کی تلفیظ (articulation) میں صوتی راستے یا صوتی قطعے (vocal tract) میں بالکل ذرا سی یا نہ ہونے کے برابر تنگی (constriction) پیدا ہوتی ہے۔[۲۳]

اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ جب ہم ''آ'' کی آواز ادا کرتے ہیں تو ہماری زبان، دانت، تالو اور ہونٹ وغیرہ میں نہ کوئی اتصال ہوتا ہے اور نہ ہماری سانس رکتی ہے۔ اس طرح اوپر دی گئی تعریف کی رو سے ''آ'' کی آواز مصوتہ یعنی واول (vowel) ہے۔ اسی طرح اے، او، ای وغیرہ بولتے ہوئے ہمارے صوتی قطعے میں نہ کے برابر رکاوٹ یا تنگی پیدا ہوتی ہے، گویا اے، او اور ای بھی مصوتے ہیں۔ البتہ اس دوران میں سانس برابر باہر آتی رہتی ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے تجربے کے طور پر ''آ'' بولنا شروع کیجیے اور اسے طول دیتے جایئے، جب آپ کی سانس ٹوٹے گی تو آواز بھی بند ہونے لگے گی۔ اس دوران میں صوتی قطعے اور جوفِ دہن میں کوئی رکاوٹ یا تنگی بھی نہیں ہو گی۔[۲۴]

☆ **مصمتہ** (consonant)

مصمتے کی تعریف: مصمتہ وہ صوت ہے جس کی تلفیظ میں صوتی قطعے میں کوئی رکاوٹ یا تنگی پیدا ہوتی ہے اور بسا اوقات صوتی راستہ یا صوتی قطعہ بھی جزوی یا مکمل طور پر بند ہو جاتا ہے۔[۲۵]

یعنی مصوتے کے برعکس جب ہم مصمتے کو ادا کرتے ہیں تو جوفِ دہن یعنی منھ کے خلا میں میں کہیں سکیڑ یا ٹکراو یا بندش پیدا ہوتی ہے مثلاً ''م'' کی آواز نکالنے کے لیے آپ کو دونوں ہونٹ ملانے پڑیں گے، سانس بھی ایک لمحے کے ذرا سے حصے کے لیے رکے گی۔ گویا ''م'' کی آواز مصمتہ ہے۔ اسی طرح ''ت'' کی آواز اس وقت تک نہیں بن سکتی جب تک آپ کی زبان کی

نوک آپ کے اوپر کے دانتوں کی جڑ سے نہ ٹکرائے جس کا مطلب یہ ہے کہ ''ت'' کی آواز بھی مصمتہ ہے۔

☆ مصوتے سے متعلق دو غلط فہمیوں کا ازالہ

اوّل تو اردو میں مصوتے یعنی واول (vowel) کی عام (بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بالکل غلط) تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ مصوتہ اسے کہتے ہیں جو حروف کو جوڑتا ہے [کذا]۔ دوسرے یہ کہ اسی غلط تعریف کی بنیاد پر اردو میں غلط طور پر تین حروف یعنی الف، واو اور ''یا'' (ی / ے) کو مصوتہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس پر لاحول ہی پڑھنی چاہیے کیونکہ حروف کو جو چیز جوڑتی ہے وہ حرف ہی ہوتا ہے اور ''ا''، ''و'' اور ''ی'' حروف ہی ہیں یعنی آوازوں کی محض لکھی ہوئی شکلیں ہیں، بذاتِ خود آوازیں نہیں ہیں۔ آواز وہ ہوتی ہے جو ہم منھ سے ادا کرتے ہیں۔ حروف آواز نہیں ہوتے۔ حروف تو آوازوں کو ظاہر کرنے والی تحریری علامات ہیں، صوتیے یا فونیم (مصوتے یا مصمتے) نہیں ہیں۔ جبکہ مصوتہ (vowel) آواز ہوتی ہے۔ آوازوں کی بات کرتے ہوئے لکھی ہوئی زبان کو بھول جانا چاہیے۔ صوتیات کا لکھی ہوئی زبان سے بس اتنا سا تعلق ہے کہ صوتیے کو کبھی تحریر میں ظاہر کرنا پڑتا ہے اور اس کام کے لیے حروفِ تہجی ہیں جو محض آوازوں کی علامت ہیں۔

دوسرے لفظوں میں ''الف''، ''واو'' اور ''ی'' مصوتے نہیں ہیں بلکہ مصوتوں کو لکھی ہوئی صورت میں ظاہر کرنے کے لیے مقررہ شکلیں یا علامات ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنیاد شاید وہ دوسرا نام ہے جو اردو میں مصوتوں کے لیے بعض اوقات استعمال کیا جاتا ہے اور وہ نام ہے: حروفِ علت۔ یہ حروفِ علت جو انگریزی میں پانچ (۵) بتائے جاتے ہیں یعنی a,e,i,o,u (اے، ای، آئی، او اور یو) مصوتے نہیں ہیں بلکہ محض مصوتوں (vowels) یا ان کی آوازوں کو ظاہر کرنے کا ایک تحریری طریقہ ہیں۔ انگریزی میں پانچ (۵) مصوتے نہیں ہیں اور نہ اردو میں تین (۳) مصوتے ہیں۔ انگریزی میں گیارہ (۱۱) بنیادی اور ممتاز مصوتے ہیں (بعض کے نزدیک بارہ (۱۲) اور بعض کے خیال میں تیرہ (۱۳))[۲۶]۔ اردو کے بنیادی اور ممتاز مصوتوں کی تعداد دس (۱۰) ہے۔ مسعود حسین خان، گوپی چند نارنگ، نصیر احمد خان، عبدالسلام اور محبوب علی خاں اس تعداد یعنی دس (۱۰) پر متفق

ہیں [27]۔ اگرچہ اردو کے مصوتوں کی تعداد گیان چند جین گیارہ (۱۱) بلکہ تیرہ (۱۳) بتاتے ہیں [28]۔ عصمت جاوید اردو میں گیارہ مصوتے بتاتے ہیں لیکن انھوں نے اس میں ایک نکی یا ناک سے ادا ہونے والا (یعنی انفی یا nasalised) مصوتہ بھی شامل کرلیا ہے [29] (انفی مصوتوں کا تعارف اگلے باب میں پیش ہوگا)۔

مختصراً یہ کہ:

(۱) مصوتوں کو حروفِ علت یا حروفِ علت کو مصوتے نہیں سمجھنا چاہیے۔ حروفِ علت مصوتے نہیں ہیں بلکہ مصوتوں کو ظاہر کرنے والی تحریری علامات ہیں۔

(۲) اردو کے بنیادی مصوتوں کی تعداد تین نہیں دس (۱۰) ہے (جن کی تفصیل فونیمیات کے باب میں پیش ہوگی)۔

☆ دو اہم باتیں

اس ضمن میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

ا۔ حروف محض آواز کی علامتیں ہیں یا تحریری شکلیں ہیں، آوازیں نہیں ہیں۔

اوپر دی گئی مثالوں میں جو حروف لکھے گئے ہیں، مثلاً ''میم'' یا ''ت'' وغیرہ، ان سے مراد وہ آوازیں یا صوتیے ہیں جن کو یہ حروف ظاہر کرتے ہیں۔ ان صوتیوں کو بول کر یا سن کر ہی سمجھنا ممکن ہے، ان کی تحریری شکل پر نہ جائیے۔ یہ تحریری شکل ''حرف'' کہلاتی ہے اور تحریری شکل صوتیہ (مصوتہ یا مصمتہ) نہیں ہوتی۔ اسی لیے ''آ'' مصوتہ تو ہے مگر آواز کی صورت میں یعنی جب اسے زبان سے بول کر ادا کیا جائے تب۔ لکھی ہوئی شکل میں ''آ'' محض حرف ہے اور حرف مصوتے یا مصمتے نہیں ہوتے بلکہ آوازوں کی علامت ہوتے ہیں۔ اسی لیے الف، آ، و، ی (اور انگریزی میں a, e, i, o. u وغیرہ) مصوتے یعنی واول نہیں ہیں۔ اسی طرح ا (الف)، و (واو) اور ی (یا) اردو کے مصوتے نہیں ہیں حروفِ تہجی ہیں۔ اردو کے بنیادی مصوتے دس ہیں۔ الف، واو اور ی کو حروف علت کا نام دے کر انھیں مصوتے سمجھنا غلط ہے بلکہ بہتر ہوگا کہ اب ہم اردو

ہیں مصوتوں کو حروفِ علت کہنا چھوڑ دیں تاکہ اس اُلجھن سے بچا جا سکے جو حروف کو آواز سمجھنے کی غلط فہمی کا موجب ہے۔

۲۔ اکیلا مصمتہ ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا

دل چسپ بات یہ ہے کہ چند ایک کو چھوڑ کر کوئی مصمتہ (consonant) اس وقت تک نہیں ادا کیا جا سکتا جب تک اس کے ساتھ کوئی مصوتہ (vowel) نہ ہو۔ مصمتے یعنی consonant کا انگریزی نام خود اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ اکیلا نہیں ادا کیا جا سکتا[۳۰]۔ consonant دو اجزا سے مل کر بنا ہے اور وہ ہیں: con یعنی ملا ہوا، اور sonant یعنی آواز[۳۱]۔ گویا مصمتے یعنی کونسونٹ کی آواز کسی مصوتے یعنی واول سے ملی ہوئی ہی ہوتی ہے۔

اس بات کو صوتیات کی زبان میں یوں کہیے کہ مصوتے (vowel) کی تلفیظ (articulation) اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس سے پہلے یا اس کے بعد کوئی مصوتہ (vowel) نہ لگا ہوا ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم لفظ ''آب'' میں جب ''ب'' کی آواز نکالتے ہیں (جو مصمتہ ہے) تو اس سے پہلے ''آ'' بولنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر ''با'' بولا جائے تو ''ب'' کے بعد ''الف'' بولنا پڑتا ہے۔ اگر صرف ''ب'' بولنے کی کوشش کی جائے تو منھ سے جو آواز نکلے گی وہ ''بَ'' کی طرح سنائی دے گی اور یہاں ''ب'' کے اوپر زبر ہے اور زبر ایک مصوتہ یعنی واول ہے جو اردو کے دس مصوتوں میں شامل ہے۔ اس طرح یہاں ''بَ'' یا ''با'' یا ''اب'' میں ''ب'' کا مصمتہ درحقیقت زبر یا الف کی مدد سے ادا کیا گیا ہے اور الف، زبر اور ی اردو کے دس مصوتوں میں شامل ہیں۔ ان دس مصوتوں سے متعلق مزید گفتگو ان شاء اللہ اگلے ابواب میں پیش کی جائے گی۔

البتہ چند مصمتے ایسے ہیں جو بغیر کسی مصوتے کے ادا کیے جا سکتے ہیں مثلاً س اور ش[۳۲]۔ اسی طرح چیک زبان میں اور بعض افریقی زبانوں میں ایسے مصمتے ہیں جو بغیر کسی مصوتے کی مدد کے ادا ہو سکتے ہیں[۳۳]۔ لیکن ان کو استثنائی مثالوں میں رکھنا چاہیے اور عمومی طور پر یہی بات درست ہے کہ مصمتے کی ادائی کے لیے اس کے ساتھ (چاہے آگے چاہے پیچھے) کوئی مصوتہ ہوتا ہے۔

حواشی:

۱۔ ایڈرین اکماجین و دیگر(Adrain Akmajian Et al)، Linguistics: An Introduction to Language and Communication، (کیمبرج (میساچوسٹس): ایم آئی ٹی پریس،۲۰۱۰ء)،ص ۶۷[چھٹا ایڈیشن]۔

۲۔ تفصیلات مختلف کتابوں میں عام طور پر دست یاب ہیں،مثلاً جن کے حوالے اس باب میں آ رہے ہیں۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایڈرین اکماجین و دیگر، Linguistics: An Introduction to Language and Communication محولہ بالا،ص ۶۷۔

۵۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر(Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language، میلبرن: تھامسن پبلشنگ،۲۰۰۵ء،ص ۲۰۹[پانچواں ایڈیشن]۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ سہیل بخاری،اردو کی زبان(کراچی: فضلی سنز،۱۹۹۷ء)،ص ۲۲۔

۸۔ آر ایل ٹراسک (R.L.Trask)، Language: The Basics، (لندن: روٹلج،۲۰۰۴ء)[دوسرا ایڈیشن]،ص ۲۔

۹۔ میکائیل ایشبی و دیگر(Michael Ashby Et al)، Introducing Phonetic Science، (دہلی: کیمبرج یونی ورسٹی پریس،۲۰۰۵ء)،ص ۲۔

۱۰۔ ایڈورڈ فنیگن(Edward Finegan)، Language: Its Structture and Use، (فورٹ ورتھ: ہارکوٹ بریس،۱۹۹۹ء)ص ۹۷[تیسرا ایڈیشن]۔

۱۱۔ ڈیوڈ کرسٹل، The Cambridge Encyclopedia of Language، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس،۱۹۹۵ء)،ص ۱۶۰

۱۲۔ آیا بوڈ اومولارا ڈینیل (Iyabode Omolara Daniel)، Introductory Phonetics and Phonology of English (نیوکاسل اپ اون ٹائن: کیمبرج اسکالرز پبلشنگ،۲۰۱۱ء)، ص ۲۔۱

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ مارٹن جے بال و دیگر(Martin J. Ball Et al)، Methods in Clinical Phonetics (لندن: ووہر پبلشرز،۲۰۰۱ء،ص ۱۔

۱۵۔ اس کی تفصیلات مختلف کتابوں میں دست یاب ہیں۔ہم نے بالخصوص Ulrike Gut کی کتاب

Introduction to English Phonetics and Phonology (فرینکفرٹ: پیٹر لینگ، ۲۰۰۹ء)، سے لی ہیں، دیکھیے: ص ۷۔۶

۱۶۔ دیکھیے گوپی چند نارنگ کی کتاب: اردو زبان اور لسانیات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۳۱ وبعدہٗ۔

۱۷۔ صوتیے یا فونیم (phoneme) کی تعریف اور اس سے متعلق مباحث مختلف کتابوں سے لیے گئے ہیں، مثلاً میکائیل ایشبی ودیگر (Michael Ashby Et al)، محولہ بالا، بالخصوص باب ۹؛ نیز لارنس ڈی شریبرگ ودیگر (Lawrence D. Shriberg Et al)، Clinical Phonetics (بوسٹن: ایلن اینڈ بیکن، ۲۰۰۳ء)، بالخصوص تیسرا باب [تیسرا ایڈیشن]؛ نیز جن دیگر کتب کے حوالے یہاں صوتیات کے ضمن میں آئے ہیں ان سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۱۸۔ ایان آر اے میک کے (Ian R.A. Mackay)، Phonetics: The Science of Speech Production، (آسٹن (ٹیکساس): پروایڈ، ۱۹۸۷ء)، ص ۴؛ نیز میکائیل ایشبی ودیگر، محولۂ بالا، ص ۳۶۔

۱۹۔ روز جولیٹ اینیان وو (Rose-Juliet Anyanwu)، Fundamentals of Phonetics, Phonology and Tonology (فرینکفرٹ: پیٹر لینگ، ۲۰۰۸ء)، ص ۴۸، ۴۲، ۴۱۔

۲۰۔ لارنس ڈی شریبرگ ودیگر (Lawrence D. Shriberg Et al)، محولۂ بالا، تیسرا باب؛ نیز ایڈریان اکماجین (Adrian Akmajian)، Linguistics: An Introduction to Language and Communication، محولۂ بالا، ص ۵۹۹ [چھٹا ایڈیشن]۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۸۳۔

۲۲۔ تفصیلات کئی کتابوں میں درج ہیں، مثلاً محولہ بالا چند کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں مائیکل ایشبی، این میک کے اور لارنس ڈی شریبرگ کی محولۂ بالا کتابیں صوتیات کے تکنیکی، طبی و عضویاتی معاملات کے لیے بطور خاص مفید ہیں۔

۲۳۔ روز جولیٹ اینیو (Rose-Juliet Anyanwu)، محولۂ بالا، ص ۴۸؛ نیز لارنس شریبرگ و دیگر (Lawrence D. Shriberg Et al)، Clinical Phontecis، محولۂ بالا، ص ۲۵۔

۲۴۔ الرائیک گٹ، محولۂ بالا، ص ۷۔۶

۲۵۔ روز جولیٹ اینیان وو، محولۂ بالا، ص ۴۸۔

۲۶۔ ایڈورڈ فنگین نے اپنی کتاب Language: Its Structure and Use میں یہ تعداد تیرہ بتائی ہے محولۂ بالا، ص ۲۳۴۔

۲۷۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: مسعود حسین خان، A Phonetic and Phonological Study

of the Word in Urdu (علی گڑھ،علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۵۱ء)،ص۹؛ نیز گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، محولۂ بالا، ۳۶۵؛نصیر احمد خان، اردو لسانیات (دہلی: اردو محل، ۱۹۹۰ء)، ص ۶۸؛ محبوب علی خان، اردو کا صوتی نظام (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء)، ص ۴۴؛عبدالسلام،عمومی لسانیات (کراچی: رائل بک کمپنی،۱۹۹۳ء)،ص۱۰۹۔

۲۸۔ عام لسانیات،محولۂ بالا،ص۱۱۳۔

۲۹۔ دیکھیے: نئی اردو قواعد (لاہور: کمبائنڈ پبلشرز،۱۹۸۸ء)،ص۳۰۔۲۹

۳۰۔ پال اسکینڈرا (Paul Skandera)، A Manual of English Phonetics and Phonology، (تبنجن (جرمنی): ورلاگ/ نار،۲۰۱۱ء)ص۳۱۔[دوسرا ایڈیشن]

۳۱۔ اوکسفر ڈ کنسائز انگلش ڈکشنری۔

۳۲۔ گیان چند، عام لسانیات، محولۂ بالا،ص۸۶۔

۳۳۔ ایضاً۔

☆......☆......☆

آٹھواں باب: صوتیات (۲)

اصوات، مقامِ تلفیظ اور اندازِ تلفیظ

صوتیات (phonetics) کا علم کسی خاص زبان سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اس میں تمام زبانوں کی آوازوں یعنی صوتیوں (phonemes) کا عمومی مطالعہ کیا جاتا ہے[۱]۔ کسی خاص زبان کی آوازوں (صوتیوں یا phonemes) کا مطالعہ جس علم میں ہوتا ہے اسے فنولوجی (phonology) یعنی علمِ اصوات یا فونیمیات کہتے ہیں[۲] اور فونیمیات کا ذکر ان شاءاللہ اگلے باب میں ہوگا۔

اس باب میں ہم صوتیات کے نقطۂ نظر سے اصواتِ تکلم (speech sounds) کا مطالعہ کریں گے۔

پچھلے باب میں ہم نے دیکھا کہ تلفیظ (articulation) کیا ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ تلفیظی صوتیات (articulatory phonetis) میں کون کون سے اعضائے تکلم (speech organs) استعمال ہوتے ہیں اور کسی آواز یا صوتیے یعنی فونیم (phoneme) کے بننے میں کیا کردار ادا کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ تلفیظ کے انداز اور تلفیظ کے مقام سے کیا مراد ہے اور ان کی کیا اہمیت ہے۔

☆ ہوائی بہاو کا نظامِ کار (airstream mechanics)

دنیا کی بیش تر زبانوں میں گفتگو میں استعمال ہونے والی آوازیں اس طرح بنتی ہیں کہ سانس پھیپھڑوں سے نکل کر صوتی راستے یا صوتی قطعے (vocal tract) سے گزرتی ہے۔ چونکہ ہوا کا یہ بہاو پھیپھڑوں سے باہر کی جانب ہوتا ہے لہذا اسے بیرونی یا برآمدی ہوائی بہاو (egressive

(airstream) کہتے ہیں [3]۔ انگریزی کی تمام اصواتِ تکلم اسی برآمدی ہوائی بہاو کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں [4]۔ اردو کی اصوتِ تکلم کی بھی یہی کیفیت ہے کہ یہ برآمدی ہوائی بہاد سے بنتی ہیں۔

لیکن بعض زبانوں میں بعض آوازیں ایسی بھی ہیں جن کو ادا کرتے وقت سانس باہر خارج کرنے کی بجائے اندر لی جاتی ہے اور اسے اندرونی یا درآمدی ہوائی بہاو (ingressive airstream) کہتے ہیں [5]۔ سندھی اور سرائیکی میں کچھ ایسی اصوات ہیں جو درآمدی ہوائی بہاو سے بنتی ہیں [6]۔

☆ تلفیظ کار (articulators)

کسی بھی صوتِ تکلم کی ادائی کے وقت جب سانس پھیپھڑے سے نکل کر آلۂ صوت (sound box) میں پہنچتی ہے تو اس کے تاروں میں ارتعاش ہوتا ہے جس سے آواز (sound) پیدا ہوتی ہے۔ اس آواز کو مصمتے (consonant) میں ڈھالنے کے لیے اس پر کچھ عمل کرنا ہوتا ہے اور یہ عمل اس وقت ہوتا ہے جب یہ آواز حلق اور ہونٹوں کے درمیانی حصے میں پہنچتی ہے جسے جوفِ دہن یا منھ کا خلا (oral cavity) کہتے ہیں۔ یہاں اعضائے تکلم (speech organs) (ہونٹ، زبان وغیرہ) اس آواز پر کچھ نہ کچھ عمل کرتے ہیں اور یہ عمل اس طرح کا ہوتا ہے کہ کچھ بندش یا تنگی یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں مصمتہ (consonant) بنتا ہے [7]۔ اس عمل میں حصہ لینے والے اعضائے تکلم کو تلفیظ کار (articulator) کہتے ہیں۔

تکنیکی زبان میں تلفیظ کار کی تعریف یوں کی گئی ہے:

Articulator: an anatomic structure capabale of movements that form the sounds of speech.

شریبرگ [8] کی بیان کی گئی تعریف کا ترجمہ کچھ یوں ہوسکتا ہے کہ تلفیظ کار وہ عضویاتی ڈھانچا ہے جو ایسی حرکت کرنے کے قابل ہوتا ہے جس سے اصواتِ تکلم بنتی ہیں۔ سادہ زبان میں یوں کہیے کہ جو اعضائے تکلم (speech organs) اصواتِ تکلم (speech sounds) کے بننے میں حرکت کرتے ہیں انھیں تلفیظ کار (articulator) کہتے ہیں۔

البتہ ہر زبان کا اپنا صوتی نظام ہوتا ہے۔ کچھ زبانوں میں کچھ تلفیظ کار زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور دوسری زبانوں میں ان کا استعمال کم ہوتا ہے[9]۔

تلفیظ کاروں میں حسبِ ذیل اعضائے تکلم شامل ہیں:

(الف) زبان (tongue):

زبان یا جیبھ مختلف قسم کی حرکات کر سکتی ہے اور تلفیظ میں ان حرکات سے بہت مدد ملتی ہے۔ ان حرکات کی وضاحت کے لیے زبان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے[10]۔

(۱) جسمِ زباں (body of the tongue): اس سے مراد زبان کا پورا لوتھڑا یا جسم ہے اور اس کا ذکر خاص طور پر مصوتوں (vowel) کی تلفیظ کے ضمن میں آتا ہے[11] (یہ ذکر اگلے باب میں آ رہا ہے)۔

(۲) نوکِ زباں (tip of the tongue): اس سے مراد زبان کا سرا یا اس کی نوک ہے۔ یہ تلفیظ میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور انگریزی کی عام گفتگو کے تقریباً پچاس فی صد مصمتے اسی کی مدد سے ادا کیے جاتے ہیں[12]۔ مثلاً انگریزی کے نیچے لکھے ہوئے جملے میں جو حروف خط کشیدہ کیے گئے ہیں ان کی ادائی میں نوکِ زباں کا منھ کے خلا میں کہیں نہ کہیں اتصال ضرور ہوتا ہے[13]۔ ذیل کے جملے کو با آوازِ بلند پڑھتے ہوئے ان خط کشیدہ حروف کی آواز پر غور کیجیے:

The underlined letters in this sentence are produced with the tip of the tongue making contact somewhere in the mouth.

ان خط کشیدہ حروف کی صحیح تلفیظ منھ کے خلا میں نوکِ زباں کے کہیں نہ کہیں اتصال کے بغیر ممکن نہیں۔

(۳) زبان کا پھل یا تیغہ (blade of the tongue): یہ زبان کا وہ حصہ ہے جو نوکِ زباں کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے۔ زبان کے اسی حصے سے مثلاً ''ش'' کی

آواز کی تلفیظ ممکن ہوتی ہے[۱۴]۔ جب ہم ''ش'' بولنا چاہتے ہیں تو ہماری زبان اُٹھتی ہے اور اس کا پھل تالو سے بہت قریب ہو جاتا ہے اگرچہ تالو سے ملتا نہیں ہے۔ تالو اور زبان کے پھل کے درمیان جو ذرا سا خلا رہ جاتا ہے ہماری سانس اس خلا سے گزرتی ہے اور ''ش'' کی آواز بنتی ہے۔ اگر ہم زبان کے پھل کو تالو سے بالکل چپکا دیں تو ''ش'' کی آواز نکالنا ممکن نہیں ہوگا بلکہ جو آواز بنے گی وہ ''چ'' کی آواز ہوگی۔

(۴) عقبِ زباں (dorsum): یہ زبان کا پچھلا حصہ ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے ''ک'' کی آواز پیدا ہوتی ہے[۱۵]۔ زبان کا پچھلا حصہ اٹھ کر تالو کے بالکل پچھلے حصے کو چھوتا ہے تو ''ک'' کی تلفیظ ہوتی ہے۔

(ب) ہونٹ (lips)

اوپر اور نیچے کا ہونٹ بعض مصمتوں اور مصوتوں کی تلفیظ میں عمل کرتے ہیں، مثلاً پ اور ب جیسے مصمتوں کی تلفیظ میں باہم ملنے کے علاوہ بعض مصوتوں مثلاً ''اُو'' کی تلفیظ میں ہم انھیں گولائی کی شکل میں سکیڑ لیتے ہیں[۱۶]۔ بعض مصوتوں مثلاً ''اَے'' کی تلفیظ کے وقت ہمارے ہونٹ پھیل جاتے ہیں۔

☆ مفعولی تلفیظ کار

مذکورہ بالا تلفیظ کاروں کو فاعلی (active) تلفیظ کار کہا گیا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ اعضائے تکلم ایسے ہیں جو مفعولی (passive) تلفیظ کار کہلاتے ہیں اور ان میں دانت، تالو یا حنک (palate)، حلق نیز اوپر کے دانتوں کی جڑ یا مسوڑھا یا لثہ (alveolus)، (جس سے لثوی alveolar کا لفظ بنا ہے) شامل ہیں۔ ان کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

☆ مصمتے اور ان کی تلفیظ (consonants and their articulaton)

پچھلے باب میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ صوتیے یا فونیم (phoneme) دو طرح کے ہوتے ہیں، مصمتے اور مصوتے۔ یہاں ہم دیکھیں گے کہ ان کی تلفیظ کیسے ہوتی ہے۔ پہلے مصمتوں کی

تلفیظ کو لیتے ہیں۔ مصمتے کی تعریف بھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ مصمتہ وہ صوتیہ یعنی فونیم ہوتا ہے جس کی تلفیظ میں صوتی راستے میں رکاوٹ یا بندش یا تنگی پیدا ہوتی ہے۔

مصمتوں کی تلفیظ کو واضح کرنے یا ان کی تعریف بیان کرنے میں دو اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں اور وہ ہیں: مقامِ تلفیظ اور اندازِ تلفیظ ۔ان اصطلاحات کی مدد سے ہم مصوتوں کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

☆ مقامِ تلفیظ (place of articluation)

یہ صوتی قطعے (vocal tract) میں وہ جگہ ہے جہاں سے کسی خاص صوتیے (phoneme) کی تلفیظ ہوتی ہے [17]۔ مقامِ تلفیظ دراصل ہمارے منھ میں حلق اور ہونٹوں کے درمیانی حصے میں کوئی مقام ہوتا ہے جہاں پر کوئی آواز یا صوتِ تکلم (speech sound) بنتی ہے [18]۔ آسان لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ یہ تلفظ کا مخرج ہوتا ہے۔

مقامِ تلفیظ کا ذکر اور اس کی وضاحت بالعموم ان تلفیظ کاروں کے نام سے منسوب کرکے کی جاتی ہے جہاں یہ آوازیں بنتی ہیں [19]۔

لیکن اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ جو مصمتے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہیں (یعنی ب، پ اور م) اور ہونٹوں اور دانتوں کے اتصال سے بنتے ہیں (یعنی ف اور واو) ان کو چھوڑ کر باقی مصمتوں کی ادائی میں زبان ایک اہم کردار ادا کرتی ہے اور عام طور پر فاعلی تلفیظ کار زبان ہی ہوتی ہے جب کہ اس عمل میں حصہ لینے والے دوسرے تلفیظ کار کو مفعولی تلفیظ کار کہا جاتا ہے [20] لیکن اس کے باوجود جب مقامِ تلفیظ کا ذکر ہوتا ہے تو اس کا نام زبان کی بجائے دوسرے تلفیظ کاروں (جو مفعولی ہوتے ہیں) کے نام پر رکھا جاتا ہے [21]، مثلاً دندانی، لثوی اور حنکی وغیرہ۔ ان کی تفصیل یہاں درج کی جارہی ہے [22]۔ یاد رہے کہ جن آوازوں یا اصواتِ تکلم (speech sounds) کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے وہ سب مصمتے (consonants) ہیں اور ظاہر ہے کہ مصمتہ بھی صوتیے یا فونیم (phoneme) کی ایک قسم ہے (صوتیوں کی دوسری قسم مصوتہ (vowel) ہے۔ مصوتوں کا

ذکر اسی باب میں آگے چل کر ہوگا، ان شاء اللہ)۔

☆ **مصمتے** (consonant)

(۱) دولبی (bilabial)

یہ وہ مصمتی آواز ہوتی ہے جو دونوں ہونٹوں کے ملنے سے بنتی ہے، مثلاً: ب، پ، م، بھ، پھ، مھ۔

(۲) لب دندانی (labiodental)

اس مصمتے یا آواز کی تلفیظ میں نچلا ہونٹ اور اوپر کے دانت بطور تلفیظ کار کام کرتے ہیں اور اوپر کے اگلے دانت نیچے کے ہونٹ کو ہلکا سا چھوتے ہیں۔ ان میں یہ آوازیں شامل ہیں: ف، و۔

(۳) دندانی (dental)

ان مصمتی آوازوں کی تلفیظ میں نوکِ زباں فاعلی تلفیظ کار کے طور پر کام کرتی ہے اور اوپر کے اگلے دانت مفعولی تلفیظ کار کے طور پر برسرِ کار آتے ہیں۔ ان میں یہ آوازیں شامل ہیں: ت، تھ، د، دھ (اردو میں ''ط'' کا تلفظ بالعموم ''ت'' ہی کی طرح کیا جاتا ہے، لہٰذا اسے الگ سے پیش نہیں کیا گیا)۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ انگریزی میں ''تھ'' کی آواز وجود نہیں رکھتی اور جسے ہم اردو والے اپنی دانست میں انگریزی الفاظ میں ''تھ'' بولتے ہیں، مثلاً تھینک یو (thank you) میں، وہ انگریزی میں ہے ہی نہیں۔ انگریزی میں اس کا تلفظ زبان کی نوک کو اوپر کے دانتوں سے لگا کر نہیں کیا جاتا بلکہ زبان کی نوک کو اوپر اور نیچے کے اگلے دانتوں کے بیچ میں لا کر اس کا تلفظ کیا جاتا ہے۔ یہی صورت ''ذ'' کے تلفظ کی ہے جسے اردو میں نوکِ زبان اور اوپر کے دانتوں کی مدد سے بولا جاتا ہے لیکن اس کا بھی درست تلفظ انگریزی میں اوپر اور نیچے کے اگلے دانتوں کے درمیان زبان کی نوک کو لا کر کیا جاتا ہے مثلاً لفظ دیٹ (that) میں ٹی (t) اور ایچ (h) کے ملنے سے بننے والی آواز۔ ایسی آوازوں کو جن کی تلفیظ دانتوں کے درمیان زبان لا کر کی جائے بین دندانی (interdental)

کہتے ہیں۔

(۴) لثوی (alveolar)

لثہ کہتے ہیں مسوڑھے کو۔ اس کا انگریزی نام alveolas ہے۔ اسی سے alveolar یعنی لثوی (یا مسوڑھے سے منسوب و متعلق) کا لفظ بنا۔ لثوی آواز وہ مصمتہ ہوتا ہے جو اوپر کے اگلے دانتوں کی جڑ سے ذرا اوپر مسوڑھے پر زبان کی نوک لگنے سے بنتا ہے یا بعض مصمتوں کی صورت میں نوکِ زباں اور مسوڑھے کے درمیان ذرا سے خلا میں سے سانس کے گزرنے سے۔

یہ آوازیں لثوی ہیں: ن، ل، س، ر، ز، رھ، نھ، لھ۔ (اردو میں عام طور پر ''ظ''، ''ض'' اور ''ذ'' کا تلفظ بھی ''ز'' کی طرح کیا جاتا ہے، گو عربی میں یہ خاصا مختلف ہے۔ اسی طرح ''ص'' کا تلفظ بھی عربی میں مختلف ہے لیکن اردو میں یہ بالعموم ''س'' ہی کی طرح بولا جاتا ہے لہٰذا ان آوازوں کو یہاں الگ سے پیش نہیں کیا گیا)۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ انگریزی کی بعض کتابوں میں ''ڈ'' اور ''ٹ'' کی آوازوں کو بھی لثوی مانا گیا ہے[۲۳] کیونکہ انگریزی میں ان کی تلفیظ اسی مخرج سے ہوتی ہے لیکن اردو میں ''ٹ'' اور ''ڈ'' کی تلفیظ میں ہم زبان کو موڑ کر مسوڑھوں سے خاصا اوپر تالو تک لے جاتے ہیں اور اسی لیے اردو میں ان کا مقامِ تلفیظ تالو یا حنک (palate) کو مانا گیا ہے اور ان معکوسی (retroflex) آوازیں کہا جاتا ہے۔ اس کا ذکر اگلی سطور میں دیکھیے۔

(۵) حنکی (palatal) اور معکوسی (retroflex)

حنک کہتے ہیں تالو کو۔ یہ اوپر کے دانتوں کے مسوڑھوں کے پیچھے کا حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جن آوازوں یا صوتیوں کی تلفیظ مسوڑھوں سے ذرا پیچھے واقع حصے سے زبان کے ٹکرانے سے کی جاتی ہے انھیں حنک سے منسوب کیا جاتا ہے اور حنکی آواز کہا جاتا ہے۔ حنکی آوازیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک میں فاعلی تلفیظ کار زبان کی نوک کے پیچھے واقع حصہ یعنی زبان کا پھل (blade) ہوتا ہے اور مفعولی تلفیظ کار تالو، مثلاً: چ، ج، ش، ژ، جھ، چھ۔ یہ آوازیں حنکی (palatal) کہلاتی ہیں۔ اس میں زبان کا پھل اٹھ کر تالو سے ٹکراتا ہے یا تالو اور زبان کے درمیان ذرا سا خلا

ہوتا ہے جس میں سے سانس گزرتی ہے اور ''ش'' اور ''ژ'' کی آوازیں اسی طرح ادا کی جاتی ہیں۔ جبکہ باقی آوازوں (یعنی ج، چ، جھ اور چھ) میں زبان کا پھَل اٹھ کر تالو سے چپک جاتا ہے اور دونوں کے درمیاں کوئی خلا نہیں رہتا اور اسی لیے سانس وہاں سے نہیں گزر سکتی۔

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض اوقات، بقول گیان چند کے ''زیادہ باریکی'' پیدا کرنے کے لیے تالو اور نرم تالو کو مزید حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور اس طرح اوپری مسوڑھے اور حلق کے کوے کی درمیانی جگہ کے سات حصے ہوجاتے ہیں اور ان کے الگ الگ نام ہیں[۲۴]۔ انگریزی کی بعض کتابوں میں لثوی اور حنکی کے درمیان ایک اور حصہ post-alveolar یعنی عقبی لثوی یا پس لثوی بھی مانا گیا ہے[۲۵] جو لثوی حصے (یعنی اوپری مسوڑھے) کے فوراً بعد ہوتا ہے۔ اردو کی بعض کتابوں میں بھی بعض مصمتوں کا مقامِ تلفیظ یا مخرج یہی حصہ مانا گیا ہے اور اسے حنکی لثوی کہہ کر بعض مصمتوں (مثلاً ج، چ) کو اس کا مقامِ تلفیظ قرار دیا گیا ہے۔ ہم یہاں اتنی باریکی میں نہیں گئے۔

دوسری حنکی آواز معکوسی (retroflex) کہلاتی ہے اس میں فاعلی تلفیظ کار زبان کی نوک ہوتی ہے جو اوپر اٹھ کر اور مڑ کر تالو کو چھوتی ہے۔ مفعولی تلفیظ کار اس میں بھی تالو ہوتا ہے، جیسے: ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ، ڑھ۔ ان آوازوں (ٹ اور ڈ وغیرہ) کو وضاحتاً بعض کتابوں میں ''حنکی معکوسی'' بھی کہا گیا ہے[۲۶]۔

(۶) غِشائی (velar)

منھ میں تالو کا عقبی حصہ جو حلق کے قریب ہوتا ہے نرم تالو یا غِشا کہلاتا ہے۔ اس کا انگریزی نام velum ہے۔ جو آواز نرم تالو یا غشا سے عقبِ زبان کے چھونے سے بنتی ہے اسے غشائی (velar) کہتے ہیں، مثلاً: ک، کھ، گ، گھ، ہ۔ ان کی تلفیظ میں زبان کی جڑ کے قریب کا حصہ اوپر اٹھ کر نرم تالو کو چھوتا ہے۔

(۷) لہاتی (uvular)

حلق کے کوّے کو ''لہات'' کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کا نام uvula ہے۔ اس سے

منسوب آواز یا صوتیے کو لہاتی (uvular) کہا جاتا ہے۔ بعض نے اسے "لہوی" بھی کہا ہے [۲۷]۔ اس میں عقبِ زبان فاعلی اور لہات مفعولی تلفیظ کار ہوتے ہیں۔ اس میں یہ آوازیں شامل ہیں: ق، خ، غ۔

(۸) حلقی (glottal)

یہ مصمتی آواز حلق میں بنتی ہے۔ اس میں صوتی تار (vocal folds) تلفیظ کار ہوتے ہیں۔ اسے حنجری یا گلوئی آواز بھی کہتے ہیں (حنجرہ سے مراد ہے ساونڈ بکس (sound box))۔ اس میں یہ آوازیں شامل ہیں: ح، ع (اگرچہ اردو میں اکثر "ح" کو "ہ" کی طرح اور "ع" کو "الف" کی طرح ادا کیا جاتا ہے)۔

☆ مقامِ تلفیظ اور مصمتوں کا جدول

مقاماتِ تلفیظ اور ان مقامات سے ادا کیے جانے والے مصمتوں کا جدول اس طرح بنایا جا سکتا ہے [۲۸]:

مقامِ تلفیظ	فاعلی تلفیظ کار	مفعولی تلفیظ کار	مصمتے کی مثالیں
دولبی (bilabial)	دونوں ہونٹ	کوئی نہیں	ب، پ، م، بھ، پھ، مھ
لب دندانی (labiodental)	نچلا ہونٹ	اگلے اوپری دانت	ف، و
دندانی (dental)	نوکِ زباں	اگلے اوپری دانت	ت، تھ، د، دھ
لثوی (alveolar)	زبان (نوک/پھل)	اوپری مسوڑھا	ر، رھ، ز، س، ل، لھ، ن، نھ
حنکی (palatal)	زبان کا پھل	تالو	چ، ج، ژ، ش، جھ، چھ
معکوسی (retroflex)	نوکِ زباں	تالو	ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ، ڑھ
غشائی (velar)	عقبِ زباں	نرم تالو	ک، کھ، گ، گھ، ہ
لہاتی (uvular)	عقبِ زباں	لہات (کوا)	ق، خ، غ
حلقی (glottal)	صوتی تار	کوئی نہیں	ح، ع

☆ اندازِ تلفیظ (manner of articulation)

تلفیظ کے ضمن میں مقامِ تلفیظ کے ساتھ دوسرا اہم نکتہ اندازِ تلفیظ ہے۔ تلفیظ کی وضاحت کے لیے مقامِ تلفیظ کے ساتھ اندازِ تلفیظ (manner of articulation) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ دراصل مصمتوں کو سمجھنے کے لیے مقامِ تلفیظ کافی نہیں کیونکہ بعض آوازیں ایک ہی مقامِ تلفیظ سے بننے کے باوجود مختلف ہوتی ہیں اور انھیں ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز کرنے کے لیے ان کے مختلف اندازہائے تلفیظ کو دیکھا جاتا ہے [۲۹]۔

اندازِ تلفیظ (manner of articulation) سے مراد ہے: وہ انداز جس میں تلفیظ کار (articulator) ہوائی بہاو (airstream) کو استعمال کر کے اسے کسی صوتِ تکلم میں ڈھالتے ہیں [۳۰]۔ دوسرے لفظوں میں اندازِ تلفیظ کا تعلق اس امر سے ہے کہ کوئی آواز بنائی کیسے جاتی ہے، یعنی آواز بنانے کا ذریعہ اور طریقہ [۳۱]۔ گویا مقامِ تلفیظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آواز یا صوتِ تکلم ''کہاں'' بن رہی ہے اور اندازِ تلفیظ بتاتا ہے کہ آواز ''کیسے'' بنتی ہے [۳۲]۔

مختلف مصمتوں کی تلفیظ کے جو مختلف انداز ہیں انھیں مختلف نام دیے گئے ہیں، جو یہ ہیں [۳۳]:

(ا) بندشی (stops)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بندشی آوازیں (stops) وہ مصمتے ہیں جن کی تلفیظ میں صوتی قطعہ (vocal tract) مکمل طور پر بند ہو جاتا ہے اور سانس ایک لمحے کے ذرا سے حصے کے لیے رکتی ہے جس سے اس مقام یا مخرج پر (جہاں سے تلفیظ ہو رہی ہوتی ہے) ہوا کا ہلکا سا دباو بنتا ہے۔ جب ایسے مصمتوں کی تلفیظ کی جاتی ہے تو اس بندش یا دباو کے ہٹنے کی وجہ سے آواز ایک ہلکے سے جھٹکے یا دھکے (انفجار یعنی plosion) سے آواز نکلتی ہے۔ اسی لیے انگریزی میں اس آواز کا ایک نام plosive بھی ہے۔ اسے اردو میں فجاری آواز یا فجاریہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں یہ ہیں:

ب، پ، ت، ٹ، ج، چ، د، ڈ، ع، ق، ک، گ، بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، کھ، گھ۔

(۲) صفیری (fricatives)

صفیر کے لفظی معنی ہیں سیٹی، پرندے کی آواز۔ صفیری آوازوں کی تلفیظ میں سیٹی جیسی یا سرسراہٹ سے مشابہ آواز سنائی دیتی ہے، اسی لیے ان کا نام صفیری آوازیں ہے۔ اس کی مثالیں یہ ہیں: ح، خ، س، ز، ش، ژ، غ، ف، و، ہ۔ صفیری آوازوں میں سے س، ز، ش اور ژ کی تلفیظ میں زبان کی نوک کو اوپر کے اگلے دانتوں کی جڑ کے پاس لایا جاتا ہے اور اس سے صوتی قطعے میں رکاوٹ یا تنگی ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن سانس کا راستہ مکمل طور پر بند نہیں ہوتا اور ذرا سا خلا باقی رہتا ہے جس سے سانس گزرتی ہے اور ایک سرسراہٹ جیسی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح یہ مصمتے بنتے ہیں جن کو صفیری آوازیں کہتے ہیں۔ صفیری آوازوں میں ف اور واو بھی شامل ہیں اور ان کی تلفیظ میں زبان کی نوک کی بجائے اوپر کے دانت اور نیچے کا ہونٹ استعمال ہوتے ہیں۔ چونکہ اس میں بھی سرسراہٹ جیسی آواز پیدا ہوتی ہے لہٰذا ان کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔

(۳) انفی (nasal)

انف کے لفظی معنی ہیں ناک۔ انفی کا مطلب ہوا ناک کا یا ناک سے متعلق و منسوب (nasal)۔ پس جن آوازوں کی تلفیظ میں ہم سانس کو منھ کی بجائے ناک کے راستے سے خارج کرتے ہیں انھیں انفی (یعنی ناک کی یا ناک سے متعلق) کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں یہ ہیں: م، ن، مھ، نھ۔

(۴) پہلوئی (lateral)

پہلوئی یعنی پہلو کا یا پہلو سے متعلق و منسوب۔ یہ وہ مصمتہ ہوتا ہے جس کی تلفیظ میں جس میں زبان کی نوک اوپر کے مسوڑھے سے ٹکراتی ہے لیکن زبان کی دونوں اطراف یا زبان کے دونوں پہلو اٹھے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ نیچے ہوتے ہیں۔ اس صورت میں سانس زبان کے دونوں پہلوؤں سے ہو کر گزرتی ہے۔ اسی لیے اس کو پہلوئی کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں یہ ہیں: ل، لھ۔

(۵) تکریری (flapped)

تکریری یعنی مکرر یا بار بار آنے والا۔ ان آوازوں کی تلفیظ میں زبان مقامِ تلفیظ کو دستک دے کر ہٹ جاتی ہے۔ اردو میں اس کی مثال ''ڑ'' کی آواز ہے جس میں مقامِ تلفیظ

اوپری مسوڑھا ہوتا ہے[۳۴]۔ محی الدین قادری زور نے آلات سے تصویر لے کر بتایا ہے کہ بعض صورتوں میں مثلاً بعض الفاظ کی ابتدا میں ''ر'' آنے پر زبان دوبار پیچ کھاتی ہے اگر چہ یہ پیچ اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ ایک ہی بار محسوس ہوتا ہے[۳۵]۔ اسی لیے اسے تکریری آواز کہتے ہیں۔ بعض لکھنے والوں نے اسے ملفوفی آواز کا نام دیا ہے[۳۶]۔ کچھ کے ہاں اس کا نام تھپک دار آواز بھی ملتا ہے[۳۷]۔ ان سب اردو الفاظ کے لیے انگریزی میں flapped کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

تکریری آوازوں کی مثالیں یہ ہیں: ر، رھ، ڑ، ڑھ۔

☆ اندازِ تلفیظ کا جدول

اگر اندازِ تلفیظ کا جدول بنایا جائے تو کچھ یوں ہوگا[۳۸]۔

اندازِ تلفیظ	مصمتے کی مثالیں
بندشیہ	ب، پ، ت، ٹ، ج، چ، د، ڈ، ع، ق، ک، گ، بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، کھ، گھ
صفیری	ح، خ، س، ز، ش، ژ، ف، و، ہ، غ
انفی	م، ن، مھ، نھ
پہلوئی	ل، لھ
تکریری	ر، رھ، ڑ، ڑھ

☆ مقامِ تلفیظ اور اندازِ تلفیظ کا مشترک جدول

اگر مصمتوں (consonants) کے مقامِ تلفیظ اور اندازِ تلفیظ دونوں کو شامل کر کے کوئی جدول بنایا جائے تو ایک ایسا جدول بنے گا جس میں دائیں سے بائیں اور اوپر سے نیچے دونوں سمتوں میں بنے ہوئے کالموں کو دیکھنا ہوگا اور کسی مصمتے کے اندازِ تلفیظ اور مقامِ تلفیظ دونوں کو بیک وقت سمجھنے کے لیے دونوں کالموں (یعنی افقی کالم اور عمودی کالم) کے نقطۂ اتصال پر جا کر اسے پڑھنا ہوگا۔ مثلاً مقامِ تلفیظ میں حنکی کے کالم اور اندازِ تلفیظ میں بندشی کے کالم کو ملا کر

دیکھیں تو دونوں جس خانے میں ملیں گے وہاں ''چ'' لکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقامِ تلفیظ کے لحاظ سے ''چ'' کی آواز ایک ایسا مصمتہ ہے جو حنکی ہے یعنی زبان کے درمیانی حصے کے تالو سے لگنے سے بنتا ہے۔ نیز یہ اندازِ تلفیظ کے لحاظ سے یہ بندشیہ ہے یعنی سانس کے ذرا دیر کو بند ہونے سے اس کی تلفیظ ہوتی ہے۔ اسی طرح دیگر مصمتوں کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے[۳۹]۔

مقامِ تلفیظ / اندازِ تلفیظ	بندشی	صفیری	انفی	پہلوئی	تکریری
دولبی	ب، پ، بھ، پھ		م، مھ		
لب دندانی		ف، و			
دندانی	ت، د، تھ، دھ				
لثوی		س، ز	ن، نھ	ل، لھ	ر، رھ
حنکی	چ، ج، جھ، چھ	ش، ژ			
معکوسی	ٹ، ڈ، ٹھ، ڈھ				ڑ، ڑھ
غشائی	ک، گ، کھ، گھ	ہ			
لہاتی	ق	خ، غ			
حلقی	ع	ح			

☆ مصوتے اور ان کی تلفیظ[۴۰] (vowels and their articulation)

مصمتوں (consonants) کی تلفیظ کے بعد اب ہم مصوتوں (vowels) کی تلفیظ کی طرف آتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ مصمتوں (consonants) کی انفرادیت اور شناخت میں دو امر اہم ہوتے ہیں، ایک مقامِ تلفیظ اور دوسرا اندازِ تلفیظ۔

لیکن مصوتوں (vowels) کی تلفیظ کی وضاحت اور تفہیم کے لیے مقامِ تلفیظ اور اندازِ تلفیظ کی اصطلاحات استعمال نہیں ہوتیں اور ان کے لیے مختلف خصوصیات زیرِ غور لائی جاتی ہیں

کیونکہ مصوتوں کی تلفیظ مختلف انداز سے ہوتی ہے اور اسے بیان کرنے کے لیے دیکھا جاتا ہے کہ صوتی قطعے (vocal tract) اور اعضائے تکلم (speech organs) خاص طور پر زبان اور ہونٹ کس حالت میں ہوتے ہیں اور کس طرح مل کر مصوتے کی تلفیظ میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں اہم امر یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ زبان کے مختلف حصے کسی مصوتے کی تلفیظ کے وقت اُٹھے ہوئے ہوتے ہیں یا دبے ہوئے؟ ہونٹ مدوّر (یعنی گول) ہوتے ہیں یا نہیں؟ مصوتہ کشیدہ ہے یا ڈھیلا؟ ایک اہم بات یہ ہے کہ مصوتوں کی تلفیظ میں صوتی قطعہ کبھی بھی مکمل طور پر بند نہیں ہوتا اور اس میں تنگی یا کھنچاو (constriction) اتنا نہیں ہوتا کہ سانس کے بہاو میں رکاوٹ پیدا ہو۔ اس کی وضاحت کے لیے مختلف مصوتوں (مثلاً آ، اے، او، ای وغیرہ) کو با آوازِ بلند گا کر دیکھیے۔ مثلاً ''آ'' کو خوب کھینچ کر دیر تک ادا کیجیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس کی اور دیگر مصوتوں کی تلفیظ میں سانس روکنی نہیں پڑتی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مصوتوں کی تلفیظ میں وہ تلفظِ کار حرکت نہیں کرتے جو مصمتوں کی تلفیظ میں کرتے ہیں اور صوتی راستہ یا صوتی قطعہ کبھی بھی مکمل طور پر بند نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مصوتوں کو اکیلا یا الگ سے بولنا ممکن ہے لیکن کوئی مصمتہ آپ اس وقت تک نہیں بول سکتے جب تک اس کے ساتھ کوئی مصوتہ نہ ہو (اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے لہٰذا یہاں تکرار سے گریز کیا جاتا ہے)۔

مصمتوں کی تلفیظ کو شناخت کرنا آسان ہوتا ہے کیونکہ اس میں آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ مثلاً آپ کی زبان کی نوک دانتوں کی جڑ کو چھو رہی ہے اور ''ت'' کی آواز بن رہی ہے، یا دونوں ہونٹ مل رہے ہیں اور ''م'' کی آواز بن رہی ہے، اسی طرح آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ کی زبان مڑ کر اوپر اٹھتی ہے اور اس کی نوک تالو سے لگتی ہے تو ''ڈ'' کی آواز آتی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں مصوتوں کی تلفیظ کو شناخت کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ مصوتوں کی تلفیظ میں تلفیظ کار ایک دوسرے کو نہیں چھوتے بلکہ قریب بھی نہیں آتے اور سانس کا راستہ تنگ بھی نہیں ہوتا۔

مصوتوں کی درجہ بندی میں چار سوال اہم ہوتے ہیں:

۱۔ کسی خاص مصوتے کی تلفیظ میں زبان اونچی ہے یا نیچی؟ مثلاً بعض مصوتوں کی تلفیظ

میں زبان زیادہ اُٹھتی ہے اور بعض میں کم۔ اس کیفیت کو اصطلاحاً زبان کی اونچائی کہا جاتا ہے اور انگریزی میں اس کے لیے tongue hieght کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

۲۔ مصوتے کی تلفیظ میں زبان کا کون سا حصہ کتنا اونچا یا نیچا ہے؟ مثلاً جب ہم ''ای'' (یہ بھی مصوتہ ہے) کہتے ہیں تو زبان کا اگلا حصہ ذرا سا اوپر اٹھ جاتا ہے اور پچھلا حصہ تھوڑا سا نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ زبان کی اس حالت کہ اس کا کون سا حصہ (اگلا، درمیانی یا پچھلا حصہ) اٹھا ہوا ہے، کو حرکتِ زباں یا tongue advancement کہتے ہیں۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی خاص مصوتے کی تلفیظ میں زبان کا بلند ترین حصہ کون سا ہے۔

۳۔ مصوتہ کشیدہ (کھنچا ہوا) ہے یا ڈھیلا؟ مثلاً ''ای'' اور ''اُو'' بولتے وقت زبان سخت یا اکڑی ہوئی یا کشیدہ ہوتی ہے (اسے انگریزی میں اصطلاحاً tense کہتے ہیں) لیکن جب ہم ''اِو'' یا ''اُو'' بولتے ہیں تو زبان سخت یا اکڑی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ نرم اور ڈھیلی ہوتی ہے (اس انگریزی میں اصطلاحاً lax کہتے ہیں)۔

۴۔ مصوتے کی تلفیظ کے وقت ہونٹوں کی وضع کیا ہے؟ مثلاً ''او'' بولتے وقت ہونٹ گول یا مدوّر ہو جاتے ہیں۔ اسے انگریزی میں rounded کہتے ہیں۔ لیکن ''اے'' بولتے ہوئے ہونٹ غیر مدور یا unrounded ہوتے ہیں۔

خلاصہ اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ مصوتے کی تلفیظ چار کیفیات سے طے ہوتی ہے:

۱۔ زبان کی اونچائی (tongue height)

۲۔ زبان کے حصوں کی حرکت (بلند ترین حصہ) (tongue advancement)

۳۔ زبان کی کشیدگی یا کھنچاو (tenseness)

۴۔ ہونٹوں کی وضع (lip position)

☆ مصوتوں کی محرّف ہندسی شکل

ماہرِ لسانیات اور یونی ورسٹی کالج لندن میں صوتیات کے پروفیسر ڈینیئل جونز (۱۸۸۱ء۔۱۹۶۷ء) کو صوتیات کی تاریخ میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے لفظ

فونیم (phoneme) یا صوتیہ اس مفہوم میں استعمال کیا تھا جس مفہوم میں یہ آج رائج ہے (یعنی آواز کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی)۔ ڈینیئل جونز نے آٹھ (۸) بنیادی اور دس (۱۰) ثانوی مصوتے طے کیے تھے اور زبان کے حصوں اور ان کے اوپر اٹھنے یا نیچے بیٹھنے کے لحاظ سے ایک چار ضلعی محرف شکل وضع کی تھی۔ یہ شکل آج بھی پوری دنیا میں زبان کے حصوں اور حرکت کے تناظر میں مصوتوں کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اسے ٹریپ زیئم (trapezium) کہتے ہیں۔
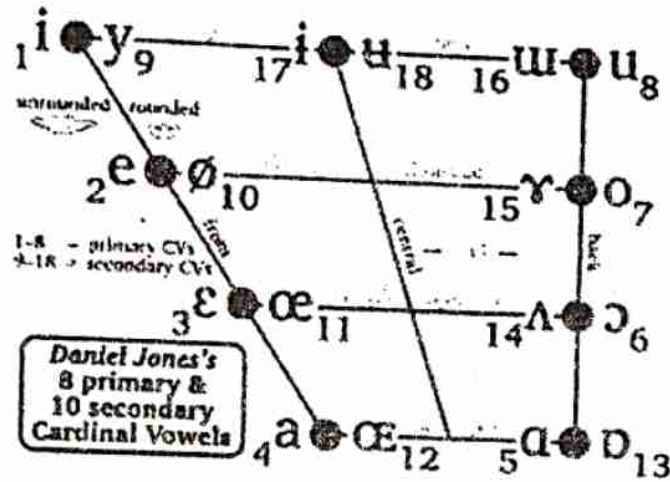
ڈینیئل جونز کی وضع کردہ محرف ہندسی شکل جو ٹریپ زینم کہلاتی ہے اور جس میں اساسی مصوتوں کی تلفیظ کے وقت زبان کے حصوں کی اونچائی اور حرکت دکھائی گئی ہے۔

اس کی تفہیم اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جب ہم ''ای'' بولتے ہیں (جو ایک مصوتہ ہے) تو ہماری زبان کا اگلا حصہ اوپر اٹھ جاتا ہے۔ ٹریپ زیئم میں اسے سب سے اوپر (زبان کی اونچائی) رکھا گیا ہے اور بائیں طرف (زبان کا اگلا حصہ) رکھا گیا ہے۔ جب ہم ''او'' بولتے ہیں
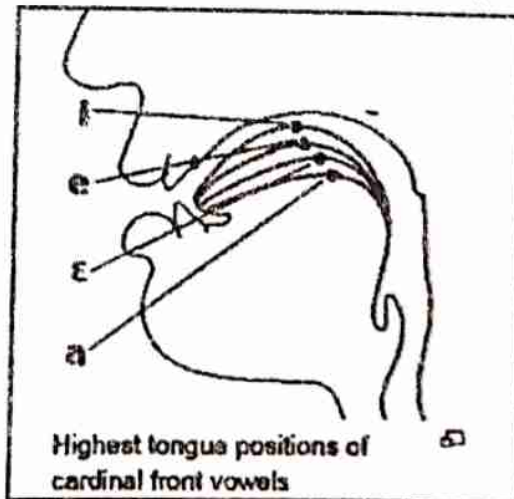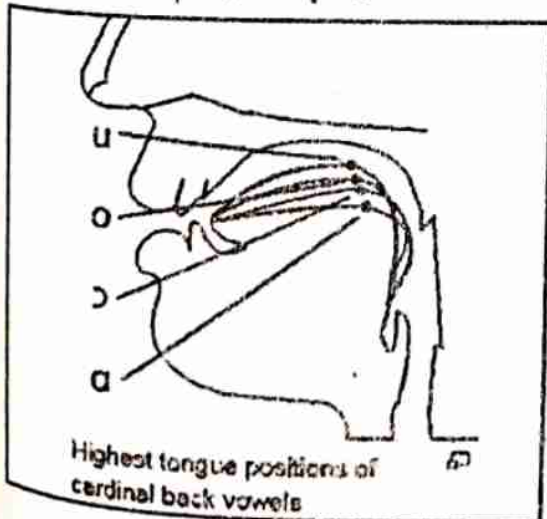
مصوتوں کی تلفیظ میں زبان کے مختلف حصوں کی اونچائی

تو زبان کا پچھلا حصہ اوپر اٹھ جاتا ہے اسی لیے ٹریپ زیئم میں اسے سب سے اوپر لیکن دائیں طرف (زبان کا پچھلا حصہ) رکھا گیا ہے۔ باقی مصوتے بھی اسی طرح اس شکل میں ظاہر کیے گئے ہیں۔

☆ مصوتوں کا جدول[۴۱]

لیکن مختلف زبانوں میں مصوتوں کی تعداد مختلف ہے۔ اردو کے مصوتوں کی تفصیل ان شاء اللہ اگلے باب میں پیش کی جائے گی۔ سرِ دست اردو کے دس (۱۰) اساسی مصوتوں کو ایک جدول کے ذریعے ذیل میں ظاہر کیا جا رہا ہے۔ اس جدول میں کسی بھی مصوتے کی تلفیظ کی مذکورہ بالا چار کیفیات دیکھی جا سکتی ہیں اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی مصوتہ بالائی ہے یا زیریں (یعنی زبان زیادہ اُٹھتی ہے یا کم)، اگلا ہے درمیانی ہے یا پچھلا (یعنی زبان کا کون سا حصہ بلند ترین ہوتا ہے)، کشیدہ ہے یا (یعنی زبان سخت ہوتی ہے یا نرم) ڈھیلا اور مدور ہے یا غیر مدور (یعنی ہونٹ گول ہوتے ہیں یا کھنچے ہوئے):

مصوتہ (vowel)	زبان کی اونچائی (tongue height)	زبان کا بلند ترین حصہ (tongue advancement)	زبان کی کشیدگی (tenseness)	ہونٹوں کی وضع (lip position)
اِی (یائے معروف)	بالائی	اگلا	کشیدہ	غیر مدور
اِ (زیر یا کسرہ)	زیریں بالائی	اگلا	ڈھیلا	غیر مدور
اے (یائے مجہول)	وسطی	اگلا	کشیدہ	غیر مدور
اَے (یائے لین)	زیریں وسطی	اگلا	ڈھیلا	غیر مدور
اَ (زبر یا فتحہ)	وسطی	درمیانی	ڈھیلا	غیر مدور
آ (الف ممدودہ)	زیریں	درمیانی	کشیدہ	مدور
اُو (واو معروف)	بالائی	پچھلا	کشیدہ	مدور
اُ (پیش یا ضمہ)	زیریں بالائی	پچھلا	ڈھیلا	مدور
او (واو مجہول)	بالا وسطی	پچھلا	کشیدہ	مدور
اَو (واو لین)	زیریں وسطی	پچھلا	کشیدہ	مدور

اردو کے صوتیوں کا مزید ذکر اگلے باب میں فونیمیات کے ذیل میں ہوگا، ان شاء اللہ۔

حواشی:

۱۔ گیان چند جین، عام لسانیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص ۸۹۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔

۳۔ میکائیل ایشبی و دیگر (Michael Ashby Et al)، Introducing Phonetic Science، (دہلی: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۰۵۔

۴۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language، میلبرن: تھامسن پبلشنگ، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۵ [پانچواں ایڈیشن]۔

۵۔ میکائیل ایشبی، (Michael Ashby Et al)، Introducing Phonetic Science، محولۂ بالا، ص ۱۰۵۔

۶۔ طارق عبدالرحمٰن، An Introductoin to Linguistics (لاہور: وین گارڈ، ۱۹۹۷ء)، ص ۲۲۔

۷۔ تفصیلات: میکائیل ایشبی و دیگر Introducing Phonetic Science، محولۂ بالا، ص ۱۲۰۔۱۱۸؛ نیز لارنس ڈی شریبرگ و دیگر (Lawrence D. Shriberg Et al)، Clinical Phonetics، (بوسٹن: ایلن اینڈ بیکن، ۲۰۰۳ء)، ص ۶۳ [تیسرا ایڈیشن]؛ ایان آر اے میک کے (Ian R.A. Mackay)، Phonetics: The Science of Speech Production، (آسٹن (ٹیکساس)، پرو ایڈ، ۱۹۸۷ء)، ص ۸۸ [دوسرا ایڈیشن]۔

۸۔ لارنس ڈی شریبرگ و دیگر (Lawrence D. Shriberg Et al)، Clinical Phonetics، محولۂ بالا، ص ۲۲۔

۹۔ روز جولیٹ اینیان وو (Rose-Juliet Anyanwu)، Fundamentals of Phonetics, Phonology and Tonology (فرینکفرٹ: پیٹر لینگ، ۲۰۰۸ء)، ص ۴۱۔

۱۰۔ لارنس ڈی شریبرگ و دیگر (Lawrence D. Shriberg Et al)، Clinical Phonetics، محولۂ بالا، ص ۲۱۔۲۰

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ایضاً ص ۲۲۔۲۱

۱۷۔ میکا ئیل ایشی، Introducing Phonetic Science ، محولہ ٔ بالا، ص ۳۶۔

۱۸۔ لارنس ڈی شریبرگ، Clinical Phonetics ، محولہ ٔ بالا، ص ۸۴۔

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ ایان آر اے میک کے (Ian R.A. Mackay)، Phonetics: The Science of Speech Production، محولہ ٔ بالا، ص ۸۹۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ اس کی تفصیل مختلف کتابوں میں موجود ہے اور یہاں اس ضمن میں بالخصوص ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

روز جولیٹ اینیان وو (Rose-Juliet Anyanwu)، Fundamentals of Phonetics, Phonology and Tonology ، محولہ ٔ بالا، حصہ اول، بابِ دوم؛ نیز لارنس ڈی شریبرگ، Clinical Phonetics، محولہ ٔ بالا، بابِ پنجم؛ میکا ئیل ایشی، Introducing Phonetic Science، محولہ ٔ بالا بابِ سوم۔ نیز اردو کی مخصوص آوازوں کے ضمن میں محبوب علی خان کی کتاب اردو کا صوتی نظام (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء)، فصلِ دوم، اور عبدالسلام کی عمومی لسانیات (کراچی: ۱۹۹۳ء) بابِ سوم، سے مدد لی گئی ہے۔

۲۳۔ مثلاً: روز جولیٹ اینیان وو (Rose-Juliet Anyanwu)، Fundamentals of Phonetics, Phonology and Tonology ، محولہ ٔ بالا، ص ۴۳۔

۲۴۔ عام لسانیات، محولہ ٔ بالا، ص ۸۴۔

۲۵۔ مثلاً: میکا ئیل ایشی، Introducing Phonetic Science، محولہ ٔ بالا، ص ۳۸۔

۲۶۔ مثلاً: محبوب علی خان نے اردو کا صوتی نظام میں اردو کے مصمتوں کا صوتی نقشہ دیا ہے اس میں انھیں حنکی معکوسی لکھا گیا ہے، محولہ ٔ بالا، ص ۷۷۔

۲۷۔ مثلاً: الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحات لسانیات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء)، ص ۴۷۷۔

۲۸۔ اس جدول کی تیاری میں ان کتب سے مدد لی گئی: محبوب علی خان، اردو کا صوتی نظام، محولہ ٔ بالا؛ عبدالسلام، عمومی لسانیات، محولہ ٔ بالا؛ روز جولیٹ اینیان وو (Rose-Juliet Anyanwu)، Fundamentals of Phonetics, Phonology and Tonology، محولہ ٔ بالا، گیان چند جین، عام لسانیات، محولہ ٔ بالا؛ میکا ئیل ایشی، Introducing Phonetic Science، محولہ ٔ بالا۔

۲۹۔ وکٹوریا فرامکن، An Introduction to Language، محولہ ٔ بالا، ص ۲۱۸۔

۳۰۔ ایشی، محولہ ٔ بالا، ص ۵۲۔

۳۱۔ شریبرگ، محولہ بالا، ص ۸۳۔

۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ ان کی تفصیل محولہ بالا اردو اور انگریزی کتب سے لی گئی ہے اور شریبرگ، وکٹوریا فرامکن اور ایشی کی محولہ بالا کتب سے بطورِ خاص مدد لی گئی ہے۔

۳۴۔ گیان چند، عام لسانیات، محولہ بالا، ص ۹۶۔

۳۵۔ بحوالہ گیان چند، عام لسانیات، محولہ بالا، ص ۹۶۔

۳۶۔ عام لسانیات، محولہ بالا، ص ۹۷۔۹۶

۳۷۔ اس جدول کی تیاری میں محولہ بالا کئی کتب سے مدد لی گئی ہے، بالخصوص محبوب علی خان، اردو کا صوتی نظام، محولہ بالا؛ عبدالسلام، عمومی لسانیات؛ روز جولیٹ اینیان وو (Rose-Juliet Anyanwu)، Fundamentals of Phonetics, Phonology and Tonology؛ گیان چند جین، عام لسانیات؛ میکائیل ایشی، Introducing Phonetic Science۔

۳۸۔ اس جدول کی تیاری میں محولہ بالا کتب نیز نصیر احمد خان کی اردو لسانیات (دہلی: اردو محل، ۱۹۹۰ء) سے مدد لی گئی۔

۳۹۔ ایضاً۔

۴۰۔ اس عنوان کے تحت یہاں کی گئی بیشتر گفتگو کے لیے محولہ بالا نیز بالخصوص درج ذیل کتابوں سے کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے: روز جولیٹ اینیان وو (Rose-Juliet Anyanwu)، Fundamentals of Phonetics, Phonology and Tonology، محولہ بالا؛ نیز لارنس ڈی شریبرگ، Clinical Phonetics، محولہ بالا؛ میکائیل ایشی، Introducing Phonetic Science، محولہ بالا۔ نیز اردو کی مخصوص آوازوں کے ضمن میں محبوب علی خان کی کتاب اردو کا صوتی نظام، محولہ بالا؛ عبدالسلام کی عمومی لسانیات، محولہ بالا، نصیر احمد خان کی اردو لسانیات اور گیان چند، عام لسانیات، محولہ بالا سے مدد لی گئی ہے۔

۴۱۔ اس جدول کی تیاری میں محولہ بالا انگریزی کتب کے علاوہ اردو کے مصوتوں کے ضمن میں حاشیہ ۴۰ میں مذکور اردو کتب سے بطورِ خاص مدد لی گئی ہے۔

☆......☆......☆

نواں باب: فونیمیات (۱)

اردو کے مصوتے اور مصمتے

پچھلے دو ابواب میں صوتیات (phonetics) پر گفتگو ہوئی۔ اس باب میں ہم علمِ اصوات یا فونیمیات (phonology) اور اس کے بنیادی تصورات سے متعلق گفتگو کریں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ اردو کے مصوتے اور مصمتے کتنے اور کون کون سے ہیں۔

☆ علمِ اصوات یا فونیمیات (phonlogy)

آوازوں کے علم سے متعلق ایک اور اصطلاح جو لسانیات میں استعمال ہوتی ہے وہ علمِ اصوات ہے جسے اردو میں فونیمیات بھی کہا جاتا ہے اور جس کا انگریزی نام فنولجی (phonology) ہے (اگرچہ اردو میں اسے فونولوجی بھی لکھا جاتا ہے لیکن انگریزی میں اس کا درست تلفظ فَنولَجی ہے)۔ فون (phone) کا لفظ یونانی زبان سے انگریزی میں آیا ہے اور اس کا مفہوم ہے آواز یا ساونڈ (sound)[۱]۔ لوجی یا لجی (-logy) کسی علم کا نام ظاہر کرنے کے لیے لاحقے کے طور پر آتا ہے اور یہ بھی یونانی زبان سے انگریزی میں پہنچا ہے[۲]۔ گویا فنولجی (phonology) کا مطلب ہوا آوازوں کا علم یعنی علمِ اصوات۔ اسی کو فونیمیات کہتے ہیں۔

گویا بظاہر تو لگتا ہے کہ صوتیات یا فونیٹکس (phonetics) کا مفہوم بھی ''آوازوں کا علم'' یا علمِ اصوات (فونیمیات) ہی ہے اور فونیٹکس اور فنولجی دونوں ایک ہی علم ہیں، لیکن علمِ اصوات اور صوتیات میں تھوڑا سا فرق ہے۔

علمِ اصوات یا فونیمیات (phonlogy) کی ایک تعریف یہ ہے:

Phonolgy is the study of sound systems of language, that is, the structure and function of sounds in language. [۳]

اس کا ترجمہ کچھ یوں ہوسکتا ہے: علمِ اصوات زبان کے نظامِ صوت کا مطالعہ ہے یعنی زبان میں آوازوں کا ڈھانچا اور زبان میں آوازوں کے کام یا وظائف۔

علمِ اصوات (فونیمیات) کی تعریف عموماً اسی طرز پر یا الفاظ کے کچھ ردوبدل کے ساتھ ملتی ہیں اور ان سب کے مفہوم اور تشریح کا خلاصہ کیا جائے تو وہ یہی ہوگا کہ علمِ اصوات یا فونیمیات کا کام یہ ہے کہ کسی زبان میں پائے جانے والے صوتی نظام کی خصوصیات اور امتیازات کو واضح کرنے کی کوشش کرے اور پھر یہ بھی واضح کرے کہ اس زبان کے حقیقی تکلم میں ان اصوات کو کیسے برتا جاتا ہے[۴] یعنی کسی زبان میں عام گفتگو میں آوازوں کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ فونیمیات اور صوتیات میں فرق

فونیمیات یا فنولجی (phonology) اور صوتیات (phonetics) یا فونیٹکس لسانیات کی دو ایسی شاخیں ہیں جو آواز یا صوت سے متعلق ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں کے وظائف کچھ مختلف ہیں۔ صوتیات یا فونیٹکس کا علم تو یہ دیکھتا ہے کہ کسی زبان میں کون کون سی آوازیں ہیں اور ان کو کس طرح اعضائے تکلم کے ذریعے بنایا جاتا ہے اور کس طرح ادا کیا جاتا ہے (یعنی ان کی تلفیظ یا articulation کیسے ہوتی ہے)۔ علم صوات آواز کی چھوٹی سے چھوٹی اکائی (جسے صوتیہ یا فونیم (phoneme) کہتے ہیں) اور اس کی تلفیظ سے متعلق ہے۔

جبکہ فونیمیات کا کام ہے کسی خاص زبان میں آواز کی بڑی اکائیوں مثلاً صوت رکن یعنی سلیبل (syllabale) میں آوازوں کی خصوصیات یا الفاظ کی آوازوں کے اتار چڑھاو سے بحث اور ان کی تفہیم[۵]۔ گویا صوت رکنوں کے علاوہ تلحسین (intonation) یعنی گفتگو میں آوازوں کے اتار چڑھاو کا مطالعہ اور ان میں موجود اصواتِ تکلم کو جانچنا صوتیات کا نہیں بلکہ فونیمیات کا کام ہے۔

صوتیات یا فونیٹکس کا علم دیگر سائنسی علوم مثلاً علمِ تشریحِ ابدان(anatomy) عضویات(physiology) اعصابیات(neurology) اور طبیعیات(physics) پر گہرا دارومدار رکھتا ہے[۶] جیسا کہ صوتیات کے ذیلی شعبوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ صوتیات آوازوں کے مجسم یا مادّی اظہار سے بحث کرتی ہے جبکہ فونیمیات یا فنولجی کا علم آوازوں کے مجرد اور نفسیاتی عوامل کو زیر بحث لاتا ہے[۷]۔ صوتیات کی خصوصیت اس کا نیچرل سائنس کے طریقے کا استعمال ہے جبکہ فونیمیات سماجی علوم یعنی سوشل سائنس یا ہیومینٹز (Humanities) کے طریقے استعمال میں لاتا ہے[۸]۔

صوتیات اور فونیمیات میں امتیاز اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے کہ صوتیات (یعنی فونیٹکس) تو ان تمام ممکنہ آوازوں کا جائزہ لیتی ہے جو انسانی اعضائے تکلم ادا کر سکتے ہیں لیکن فونیمیات (یعنی فنولجی) کا علم یہ دیکھتا ہے کہ کسی خاص زبان کے بولنے والے ان ممکنہ آوازوں میں سے کون کون سی آوازیں اپنی بامعنی گفتگو میں کس کس طرح استعمال کرتے ہیں[۹]۔

اس بات کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ صوتیات یہ بتائے گی کہ کون کون سی آوازیں انسانی تکلم میں استعمال ہوتی ہیں، وہ کیسے بنتی اور ادا ہوتی ہیں اور اعضائے تکلم اس عمل میں کیا کیا کام کس طرح کرتے ہیں (یعنی ان کی تلفیظ کیسے ہوتی ہے)۔ لیکن اگر کسی خاص زبان مثلاً انگریزی یا اردو کے الفاظ یا صوت رکنوں (یعنی سلیبل) کا جائزہ لینا ہو کہ اردو یا انگریزی الفاظ کے صوت رکنوں کی ساخت کیا ہوتی ہے اور اس میں مصوتے اور مصمتے کس کس ترتیب سے آنے ممکن ہیں تو یہ کام اردو کے علمِ اصوات یا اردو فونیمیات (Urdu phonology) اور انگریزی کے علمِ اصوات (English phonolgy) کا ہے۔

گویا صوتیات یا فونیٹکس کا علم کسی ایک یا کسی خاص زبان کے لیے نہیں بلکہ اس میں تمام زبانوں کی آوازوں کا عمومی مطالعہ کیا جاتا ہے[۱۰]۔ جبکہ فونیمیات یا فنولجی وہ علم ہے جو کسی خاص زبان کے صوتیوں کو دریافت اور متعین کر کے ان کی ذیلی اقسام کا مطالعہ کرے[۱۱]۔

☆ صوتیے کا وجود اور اقلی تخالفی جوڑے (minimal pairs)

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کوئی صوتیہ یا فونیم (phoneme) کسی خاص زبان (مثلاً اردو یا انگریزی) میں وجود رکھتا ہے یا نہیں؟

کسی زبان میں کسی صوتیے کے وجود کو معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو ایسے الفاظ لیے جاتے ہیں جن کے تلفظ میں صرف ایک آواز (یعنی ایک فونیم یا ایک صوتیے) کی تبدیلی سے مفہوم بدل جاتا ہے، مثلاً انگریزی کے ان دو الفاظ کو دیکھیے:

cap اور cab

پہلا لفظ (کیپ) ''ٹوپی'' کے معنی میں ہے اور دوسرا لفظ (کیب) ''گاڑی'' کے معنی میں ہے۔ ان میں ایک آواز (فونیم پی p اور فونیم بی b) کی تبدیلی سے مفہوم بدل گیا۔ آواز کے اس تضاد یا تخالف سے یہ واضح ہو گیا کہ انگریزی میں پ (p) اور ب (b) دو الگ الگ منفرد آوازیں یعنی صوتیے یا فونیم (phoneme) ہیں[12]۔ اس طرح کے دو الفاظ کے جوڑے کو، جس میں ہر لفظ کے معنی مختلف ہوں نیز ان میں صوتیوں یا فونیم کی تعداد یکساں ہو اور ان میں ایک صوتیہ یا فونیم ٹھیک اسی مقام پر مختلف ہو، انگریزی میں minimal pair اور اردو میں اقلی تخالفی جوڑا کہتے ہیں کیونکہ اس میں الفاظ کے جوڑے میں اقل (یعنی قلیل ترین) آواز کی تبدیلی سے جو تضاد یا تخالف (contrast) پیدا ہوتا ہے اس سے صوتیے کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔

گویا اقلی تخالفی جوڑے کے لیے تین شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے، اول یہ کہ اس میں صرف ایک آواز یا ایک صوتیہ (فونیم) مختلف ہو اور وہ ایک ہی مقام پر مختلف ہو یعنی یا ابتدا میں یا درمیان میں یا آخر میں[13]۔ مثال کے طور پر اوپر ہم نے کیپ (cap) اور کیب (cab) کو دیکھا کہ اس جوڑے میں آواز آخر میں بدل رہی ہے۔ اگر ہم اس کی بجائے ابتدا کی مثال لیں تو انگریزی میں یہ پٹ (pit) اور بٹ (bit) کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ یہاں پی (p) اور بی (b) ابتدا میں آئے ہیں[14] اور یہ بھی ایک اقلی تخالفی جوڑا مانا جائے گا جس سے ان دونوں منفرد صوتیوں یعنی

فونیموں (پ p اور ب b) کی انگریزی میں موجودگی کی تصدیق ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ بعض کتب میں minimal pair کو minimal contrast بھی کہا گیا ہے[۱۵] (لہٰذا اسے مختلف یا نئی اصطلاح سمجھ کر الجھنے کی ضرورت نہیں ہے)۔

دوسری شرط جو اقلی تخالفی جوڑے بنانے کے لیے ضروری ہے یہ ہے کہ لفظ کی آواز میں صوتیوں کی تعداد یکساں ہو[۱۶]، جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا کہ دونوں لفظوں (یعنی cab اور cap نیز pit اور bit) میں تین تین صوتیے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اقلی تخالفی جوڑا بنانے کے لیے لازم ہے کہ کسی ایک صوتیے کی تبدیلی سے جو لفظ بنیں وہ با معنی ہوں اور مفہوم کے لحاظ سے باہم الگ الگ ہوں یعنی دونوں اپنا الگ الگ مفہوم رکھتے ہوں[۱۷] (جیسا کہ اوپر دی گئی انگریزی الفاظ کی مثالوں سے بھی ظاہر ہے)۔

گویا اقلی تخالفی جوڑے کی تین شرائط مختصراً یوں بیان کی جاسکتی ہیں:

۱۔ لفظوں کے اس جوڑے میں صرف ایک صوتیہ یا فونیم مختلف ہو اور فونیم کا یہ اختلاف ایک ہی مقام پر ہو یعنی اگر ایک لفظ میں پہلا فونیم لیا جائے تو دوسرے لفظ میں بھی پہلا ہی فونیم لیا جائے اور اگر ایک لفظ میں دوسرا فونیم لیا جائے تو دوسرے لفظ میں بھی دوسرا ہی فونیم لیا جائے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

۲۔ دونوں لفظوں میں صوتیوں یا فونیم کی تعداد یکساں ہو، مثلاً تین تین یا چار چار۔

۳۔ فونیم یعنی صوتیے کی تبدیلی سے بننے والا لفظ بامعنی ہو اور مختلف مفہوم رکھتا ہو۔

خواہ وہ فونیم (صوتیہ) اس زبان کے صرف ایک لفظ میں آتا ہو لیکن اس ایک لفظ کا بامعنی ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس کا ابتدا میں آنا ضروری نہیں ہے، مثلاً اردو کے بعض فونیم کسی لفظ کی ابتدا میں نہیں آتے لیکن وہ اردو کے فونیم ہیں، مثلاً ''ڑ'' یا ''ڑھ''۔ لیکن اردو کے اقلی تخالفی جوڑوں سے ان کا وجود ثابت ہوتا ہے، جیسے:

آڑا ۔ آرا

چڑھنا ۔ چرنا

ان اقلی تخالفی جوڑوں سے ''ڑ'' اور ''ڑھ'' کے اردو کے فونیم ہونے کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ ''ر'' سے تخالف کے بعد یہ ایک بامعنی لفظ میں آئے ہیں اور ان جوڑوں میں اس فونیم کی جگہ وہی ہے یعنی تین آوازوں والے لفظ میں یہ درمیانی آوازیں ہیں۔

اقلی تخالفی جوڑوں کے علاوہ بعض اوقات اقلی تخالفی گروہ بھی بنائے جاتے ہیں جنھیں اقلی تخالفی سیٹ (minimal set) کہتے ہیں [۱۸]۔ مثال کے طور پر انگریزی کے ان الفاظ کو دیکھیے:

big, pig, rig, fig, dig, wig

یہ مثال انگریزی کے مصمتوں (consonants) کے لیے ہے۔ مصوتوں (vowels) کے لیے بھی اسی طرح کے اقلی تخالفی جوڑے یا سیٹ بنائے جاتے ہیں [۱۹]۔ اس طرح کے جوڑے یا سیٹ بنانے سے الگ الگ اور منفرد صوتیوں کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر لفظ میں مصوتوں کی تعداد یکساں ہوتی ہے، ان میں کسی ایک مصوتے کو ایک ہی مقام پر بدلا جاتا ہے اور ان میں سے ہر لفظ کا الگ الگ مفہوم ہوتا ہے (گویا جوڑے ہوں یا سیٹ وہ تینوں شرائط پوری کرتے ہیں)۔ انگریزی میں صوتیوں کی تعداد پر اختلاف ہے اور یہ بیالیس (۴۲) سے چوالیس (۴۴) تک بتائی جاتی ہے [۲۰]۔

☆ اردو اور اقلی تخالفی جوڑے

اب ہم اقلی تخالفی جوڑے کے ضمن میں اردو کی مثالوں کو دیکھتے ہیں۔

مثلاً ایک اقلی تخالفی جوڑا ''بار۔ پار'' ہے۔ اس میں ایک آواز بدلی گئی اور ایک ہی مقام (ابتدا) پر بدلی گئی، دونوں میں تین تین آوازیں تھیں اور ایک آواز کے ایک ہی مقام پر بدلنے سے ایک نیا لفظ بنا جو بامعنی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اردو میں ''ب'' اور ''پ'' دو الگ اور منفرد صوتیے ہیں۔ اگر ان دو صوتیوں کو ابتدا کی بجائے آخر میں رکھا جائے، جیسے ''آب۔ آپ'' تب بھی دو مختلف المعنی لفظ بنتے ہیں۔

''اُجڈ'' اور ''اُجڑ'' اردو میں دو الگ الگ بامعنی لفظ ہیں۔ ان میں آوازں یا فونیم کی تعداد یکساں ہے (یعنی دونوں میں تین تین آوازیں ہیں) اور اس جوڑے میں آخری فونیم بدلنے سے مفہوم بدلتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں ''ڑ'' اور ''ڈ'' دو الگ الگ فونیم ہیں۔ یہ مشق

صرف مصمتوں کے ساتھ نہیں بلکہ مصوتوں کے ساتھ بھی کی جا سکتی ہے اور مصوتوں کے وجود کی تصدیق کی جا سکتی ہے، مثلاً ''کال'' اور ''کیل'' سے معلوم ہوتا ہے کہ الف (ا) اور یاے معروف (ی) اردو میں دو الگ الگ فونیم (مصوتے) ہیں۔ (مصوتے بھی فونیم یعنی صوتے ہوتے ہیں اور مصمتے بھی فونیم ہوتے ہیں، اور اس کا ذکر پچھلے باب میں گزر چکا ہے)۔

اگر اردو میں اقلی تخالفی گروہ (سیٹ) کی مثال لی جائے تو مثلاً حسبِ ذیل اقلی تخالفی سیٹ (minimal set) بن سکتا ہے:

بال، پال، تال، تھال، ٹال، جال، چال، چھال، خال، دال، ڈال، ڈھال، رال، سال، کال، کھال، گال، لال، مال، نال[۲۱]۔

☆ اردو کے صوتیوں یا فونیم (phonemes) کی تعداد

اردو میں صوتیوں یا فونیموں (phonemes) کی تعداد کے ضمن میں اچھا خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔

نصیر احمد خان کہتے ہیں کہ اردو میں اٹھاون (۵۸) صوتیے ہیں جن میں سے سینتیس (۳۷) مصمتے (consonants) ہیں، دس (۱۰) مصوتے ہیں، ایک نیم مصوتہ (semi-vowel) ہے اور دس (۱۰) فوق قطعاتی صوتیے ہیں[۲۲]۔ یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ نصیر احمد خان نے اڑتالیس (۴۸) قطعاتی یا قطعہ دار (segmental) اور دس (۱۰) فوق قطعاتی یا غیر قطعہ دار (supra-segmental) یعنی غیر فونیمیاتی دونوں کو ملا کر کُل اٹھاون (۵۸) صوتیے بتائے ہیں۔

فوق قطعاتی صوتیے سرِ دست ہمارے دائرے سے خارج ہیں لیکن وضاحتاً عرض ہے کہ دراصل قطعہ دار یا قطعاتی صوتیے (segmental phonemes) وہ صوتیے ہوتے ہیں جنھیں اکائیوں (segments) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور جنھیں ہم سہولت کے لیے حروفِ تہجی کی مدد سے ظاہر کرتے ہیں، جیسے ب، پ، وغیرہ۔ لیکن کچھ صوتیے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اکائی کی شکل میں موجود نہیں ہوتے اور وہ محض صوتیوں کے استعمال کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں[۲۳]، مثلاً اگر کسی صوتیے کو کھینچ کر (طوالت یا length کے ساتھ) یا خاص تان (tone) میں ادا کیا جائے تو لفظ کا

مفہوم بدل جاتا ہے، جیسے لفظ ''جی'' کو اگر کھینچ کر سوالیہ انداز میں بولا جائے (یعنی جی ای؟) تو مفہوم بدل جاتا ہے۔ بس استعمال کی یہی کیفیت غیر قطعہ دار یا فوق قطعاتی یا غیر فونیمیاتی صوتیے کہلاتی ہے لیکن چونکہ صوتیات میں اندازِ تلفیظ اور مقامِ تلفیظ کے مباحث میں طوالت (length) اور تان (tone) کو زیر بحث نہیں لایا جاتا اور یہ منفرد اور ممتاز صوتیے نہیں مانے جاتے اور لسانیات کی ایک اور شاخ عروضیات (prosody) کے ذیل میں آتے ہیں) لہٰذا انھیں یہاں زیر بحث نہیں لایا گیا۔ (یہاں ضمنی طور پر یہ وضاحت بھی کر دی جائے کہ لسانیات میں عروضیات شاعری کے عروض سے الگ ایک تصور ہے۔)

بہر حال بات ہو رہی تھی اردو صوتیوں کی تعداد کی۔ نصیر احمد خان نے یہ تعداد اڑتالیس (۴۸) بتائی ہے۔ ان کے خیال میں اردو میں سینتیس (۳۷) مصمتے، دس (۱۰) مصوتے اور ایک نیم مصوتہ (semi-vowel) ہے (لیکن دس (۱۰) فوق قطعاتی صوتیوں کو ملا کر انھوں نے اس تعداد کو اٹھاون (۵۸) کر دیا ہے) [۲۴]۔ محبوب عالم خان کے مطابق اردو میں تریسٹھ (۶۳) صوتیے ہیں جن میں سے دو فوق قطعاتی ہیں اور ان کو نکال دیا جائے تو اردو میں یہ تعداد اکسٹھ (۶۱) ٹھہرتی ہے، بقول ان کے اردو میں اکتالیس (۴۱) مصمتے اور دس (۱۰) مصوتے ہیں لیکن وہ انفی مصوتوں (nasalised vowels) (ان کا ذکر آگے آ رہا ہے) کو بھی شمار کرتے ہیں اور اگر انفی مصوتوں کو چھوڑ کر صرف اساسی مصوتے شمار کیے جائیں تو محبوب علی خان کے نزدیک اردو میں اکیاون (۵۱) صوتیے ہیں [۲۵]۔

مسعود حسین خان اردو لسانیات کے بڑے ناموں میں سے ہے، مسعود صاحب نے اردو کے مصمتوں کی تعداد ایک نیم مصوتے سمیت سینتیس (۳۷) لکھی ہے [۲۶] اور ایک اور جگہ اردو کے مصوتوں کی تعداد دس (۱۰) بتائی ہے [۲۷]۔ اس طرح یہ کُل سینتالیس (۴۷) ہو جاتے ہیں۔ مسعود صاحب کی یہ تحریر دیگر مطبوعات میں بھی شامل ہوئی (مثلاً دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے تحقیقی جریدے اردوے معلّٰی، لسانیات نمبر، شمارہ ۵۔۴، ۱۹۶۱ء، نیز اردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ عبدالستار دلوی)۔ مسعود صاحب پر شوکت سبزواری صاحب نے خاصے اعتراضات کیے [۲۸]۔

دراصل مسعود صاحب نے متشابہ الصوت آوازوں (ذ۔ظ۔ض نیز ث،ص،ط اور ح) کو ''زائد حروف'' قرار دیا اور کہا کہ یہ ''اردو حروفِ تہجی اور نظام درس کے لیے پیرِ تسمہ پا'' بنے ہوئے ہیں اور صوتی لحاظ سے ''مردہ لاشیں'' ہیں[۲۹]۔ گویا ان کے خیال میں ''ت''، ''س''، ''ز'' اور ''ہ'' کافی ہیں اور بقیہ حروف (ط، ظ، ث، ذ، ص، ض، ح) غیر ضروری ہیں۔ لیکن شوکت سبزواری نے ان حروف کے اردو املا میں وجود کا دفاع کیا ہے، مختصراً یہ کہ بقول ان کے عربی میں یہ آوازیں الگ ہیں اور اردو میں کم از کم املا کی حد تک تو ان کا جواز ہے ورنہ اردو کے ہزاروں الفاظ جو عربی سے آئے ہیں اپنا اصل املا کھو کر اردو میں نامانوس ہو جائیں گے[۳۰]۔

بہرحال، سبزواری صاحب نے کہا کہ اردو میں پینتیس (۳۵) مصمتے اور دس (۱۰) مصوتے ہیں، اس طرح گویا ان کے نزدیک اردو میں مجموعی طور پر پینتالیس صوتیے ہیں[۳۱]۔ ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ اردو میں باسٹھ (۶۲) صوتیے ہیں جن میں سے بیالیس (۴۲) مصمتے ہیں، دس (۱۰) مصوتے ہیں اور دس (۱۰) انفی مصوتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ نیم مصوتہ محض انگریزی کے ڈبلیو (w) کی تقلید ہے اور کچھ نہیں ہے[۳۲]۔

اقتدار حسین کے مطابق اردو میں چھپن (۵۶) صوتیے ہیں جن میں پینتالیس (۴۵) مصمتے، ایک نیم مصوتہ اور دس (۱۰) مصوتے شامل ہیں[۳۳]۔ سرمد حسین کے مطابق اردو میں چھتیس (۳۶) مصمتے، دس (۱۰) مصوتے اور دس (۱۰) انفی مصوتے ہیں، اس طرح کل تعداد چھپن (۵۶) ہو جاتی ہے[۳۴]۔ خلیل صدیقی کا اردو لسانیات پر خاصا کام ہے لیکن انھوں نے صوتیات پر اپنی کتاب میں اردو کے مصوتوں کا جو ذکر کیا ہے اس میں اردو کے تمام مصوتے شامل نہیں ہیں اور اس میں زیادہ تر ڈینیئل جونز سے استفادہ کیا گیا ہے جو انگریزی کے آٹھ (۸) بنیادی مصوتوں کے تصور پر مبنی ہے[۳۵] (کچھ گڑبڑ کاتب صاحب نے کی ہے اور ایک مصوتہ چھوڑ گئے ہیں)۔ خلیل صدیقی صاحب نے ابواللیث صدیقی اور سہیل بخاری کی تحریروں کی بنیاد پر اردو کے مصمتوں اور مصوتوں کا خاکہ پیش کیا ہے[۳۶]۔ لیث صاحب کا ذکر ہو چکا۔ سہیل بخاری نے اردو کے چونتیس (۳۴) مصمتے، چودہ (۱۴) مصوتے اور دس (۱۰) انفی مصوتے بتائے ہیں[۳۷]۔ اس

طرح یہ کُل اٹھاون (۵۸) صوتیے بنتے ہیں۔

عصمت جاوید کے مطابق اردو میں گیارہ (۱۱) مصوتے ہیں [۳۸] لیکن ان میں انھوں نے ''آں'' کو بھی شامل کرلیا ہے جو دراصل انفی مصوتہ ہے۔اسی طرح انھوں نے ث، ص، ذ، ض، ظ، ط اور ح کو مصمتوں میں شمار نہیں کیا اور واضح طور پر یہ بھی نہیں بتایا کہ اردو میں کل کتنے مصمتے اور صوتیے ہیں [۳۹]۔محی الدین قادری زور کا شمار اردو میں جدید اور سائنسی لسانیات اور صوتیات کے بانیوں میں ہوتا ہے اور بجا طور پر ہوتا ہے۔ان کی کتاب Hindustani Phonetics اردو صوتیات پر سائنسی تحقیق کی بنیاد پر لکھی گئی پہلی کتاب تھی۔اس میں انھوں نے اردو میں کُل پندرہ (۱۵) مصوتے بتائے ہیں جن میں سے نو (۹) مصوتے اور چھے (۶) دہرے مصوتے (diphthongs) ہیں (ص ۴۷)۔قادری زور صاحب کے مطابق اردو میں پینتالیس (۴۵) مصمتے ہیں [۴۰]۔گویا ان کے خیال میں اردو میں ساٹھ (۶۰) صوتیے ہیں۔مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق اردو میں دس (۱۰) مصوتے ہیں اور اڑتیس (۳۸) مصمتے ہیں اور اس طرح صوتیوں کی کل تعداد اڑتالیس (۴۸) بنتی ہے [۴۱]۔گیان چند جین نے اپنی کتاب ''عام لسانیات'' میں اردو کے مصوتوں کی تعداد باقاعدہ جدول بنا کر چودہ (۱۴) لکھی ہے [۴۲]۔گو جین صاحب نے مصمتوں کا چارٹ (جو بقول ان کے گوپی چند نارنگ کے چارٹ سے خاصا مماثل ہے) اردو کے مصمتوں کی امتیازی خصوصیات ظاہر کرنے کے لیے دیا ضرور ہے [۴۳] لیکن وہ واضح طور پر اردو مصمتوں کی تعداد نہیں بتاتے۔ عبدالسلام نے اردو کے مصوتوں کی تعداد دس (۱۰) بیان کی ہے [۴۴] لیکن انھوں نے اردو کے مصمتوں کی خاصی تفصیل دینے کے باوجود ان کی تعداد واضح طور پر کہیں نہیں بتائی۔

گوپی چند نارنگ نے ایک جگہ اردو کے مصمتوں کی تعداد ایک جگہ چونتیس (۳۴) لکھی ہے اور واو (و) کو اردو کے مصمتوں میں شمار نہیں کیا [۴۵] لیکن دوسری جگہ ایک جدول میں پینتیس (۳۵) لکھی ہے اور واو (و) کو مصمتوں میں شمار کرلیا ہے [۴۶]۔بلکہ دوسری جگہ (یعنی اردو لسانیات مرتبہ فضل الحق) میں شامل اپنے مقالے میں اردو کی بنیادی آوازوں کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے سینتیس (۳۷) مصمتے درج کیے ہیں جن میں سے ''ق'' اور اور ''ژ'' کو بریکٹ میں لکھا

گیا ہے (نجانے کیوں) اور اردو کی پندرہ (۱۵) ہائیہ (aspirated) آوازوں میں سے صرف دس (۱۰) کو لیا گیا ہے [۴۷]۔ گوپی چند نارنگ صاحب کا بھی خیال ہے کہ اردو میں دس (۱۰) مصوتے ہیں [۴۸]۔ انھوں نے اردو میں دو نیم مصوتے ''ی'' اور ''و'' بھی بتائے ہیں [۴۹]۔

اردو کے صوتیوں کو شمار کرتے وقت کچھ ماہر انفی مصوتوں کو شامل کرتے ہیں کچھ نہیں کرتے۔ اسی طرح کچھ فوق قطعاتی صوتیوں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اردو کے صوتیوں کی تعداد کے بارے میں ان ماہرین کی آرا پر مبنی کوئی جدول بنایا جائے تو وہ کچھ یوں ہوگا:

ماہر	مصمتے consonants	مصوتے vowels	نیم مصوتے semi - vowels	انفی مصوتے nasalised vowels	فوق قطعاتی صوتیے supra-segmental phonemes	کل صوتیے total phonemes
نصیر احمد خان	۳۷	۱۰	۱	ـ	۱۰	۵۸
محبوب علی خان	۴۱	۱۰	ـ	۱۰	۲	۶۳
مسعود حسین خان	۳۶	۱۰	۱	ـ	ـ	۴۷
شوکت سبزواری	۳۵	۱۰	ـ	ـ	ـ	۴۵
ابواللیث صدیقی	۴۲	۱۰	ـ	۱۰	ـ	۶۲
اقتدار حسین خاں	۴۵	۱۰	۱	ـ	ـ	۵۶
سرمد حسین	۳۶	۱۰	ـ	۱۰	ـ	۵۶
سہیل بخاری	۳۴	۱۴	ـ	۱۰	ـ	۵۸
محی الدین قادری	۴۵	۱۵	ـ	ـ	ـ	۶۰
مرزا خلیل بیگ	۳۸	۱۰	ـ	ـ	ـ	۴۸
گوپی چند نارنگ	۳۷	۱۰	۲	ـ	ـ	۴۹

غرض ''شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا'' کی سی کیفیت ہے۔ اس کی بڑی وجہ انفی مصوتوں اور فوق قطعاتی صوتیوں کو شامل کرنا ہے۔ اگر انھیں نکال دیا جائے (اور نکالنا ہی بہتر ہے) تو فرق کم ہو جاتا ہے۔ البتہ مصوتوں کی تعداد کے بارے میں اکثر کا خیال ہے کہ اردو میں دس مصوتے ہیں۔

ہماری ناقص رائے میں فوق قطعاتی صوتیوں کو شمار کرنا بلا وجہ ہے کیونکہ وہ قطعاتی (segmental) اکائیاں نہیں ہیں۔ اسی طرح انفی مصوتوں کو شمار کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ انفی مصوتے دراصل اردو کے اساسی مصوتے ہی ہیں جن کی آواز انف یعنی ناک سے نکلتی ہے، مثلاً لفظ ''کانٹا'' میں نون غنہ ہے اور اس کا درست تلفظ ''کاں ٹا'' ہے۔ یہ نون غنہ صرف اس لفظ میں آنے والے پہلے الف کی آواز کا ناک سے نکلنا ظاہر کر رہا ہے اور یہ آواز (ں) کوئی اضافی مصوتہ یا مصمتہ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر فوق قطعاتی اور انفی صوتیوں کو نکال دیا جائے تو ان ماہرین کی رائے کے مطابق اردو کے صوتیوں کا جدول کچھ یوں بنے گا:

ماہر	مصمتے consonants	مصوتے vowels	نیم مصوتے semi-vowels	کُل صوتیے total phonemes
نصیر احمد خان	۳۷	۱۰	۱	۴۸
محبوب علی خان	۴۱	۱۰	ـــ	۵۱
مسعود حسین خان	۳۶	۱۰	۱	۴۷
شوکت سبزواری	۳۵	۱۰	ـــ	۴۵
ابواللیث صدیقی	۴۲	۱۰	ـــ	۵۲
اقتدار حسین خاں	۴۵	۱۰	۱	۵۶
سرمد حسین	۳۶	۱۰	ـــ	۴۶
سہیل بخاری	۳۴	۱۴	ـــ	۴۸
محی الدین قادری	۴۵	۱۵	ـــ	۶۰
مرزا خلیل بیگ	۳۸	۱۰	ـــ	۴۸
گوپی چند نارنگ	۳۷	۱۰	۲	۴۹

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے صوتیوں کی تعداد کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ فرق کیوں ہے تاکہ یہ طے کیا جا سکے کہ اردو میں صوتیوں کی صحیح مجموعی تعداد کیا ہے۔ سر دست یہ ہمارے دائرے سے خارج ہے۔

☆اردو کے اساسی مصوتے (cardinal vowels)

محی الدین قادری زور، گیان چند جین، سہیل بخاری اور شان الحق حقی کو چھوڑ کر سبھی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اردو میں دس (۱۰) اساسی مصوتے (cardinal vowels) ہیں۔

ان دس مصوتوں کی تفصیل یہ ہے (اضافی مصوتوں کا ذکر آگے آ رہا ہے):

مصوتہ	مثالیں
زیر	اِس، دِن، دِل، پِل
زبر	اَب، بَن، پَل، گَل
پیش	اُس، بُن، پُل، دُھن
الف ممدودہ (آ)	آنا، آپ، تاب، جانا
واوِ معروف	اُون، سُور، خُون، دُھوم
واوِ مجہول	بونا، چور، سونا، موٹا
واوِ لین	پَودا، فَوج، غَور، گَون
یائے معروف	پِیلا، جِھیل، چِیل، گِیلا
یائے مجہول	دینا، کھیل، لینا، بیل (پودا)
یائے لین	بَیٹھنا، خَیر، بَیل (جانور)

☆اردو کے کچھ اضافی مصوتے

دراصل اردو میں تین مصوتے ایسے بھی ہیں جن کی حیثیت کا ہنوز حتمی طور پر تعین نہیں ہو سکا ہے اور چند ہی لغت نویس انھیں برتتے ہیں۔ یہ تین مصوتے فتحۂ مجہول، کسرۂ مجہول اور ضمۂ مجہول ہیں۔ ان تینوں کو شان الحق حقی نے اردو لغت بورڈ کی لغت میں اور اپنی مرتبہ فرہنگِ تلفظ میں بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً ''شہر'' اور ''صحرا'' جیسے الفاظ میں فتحہ (یعنی زبر) لکھا تو جاتا ہے لیکن ان الفاظ کا تلفظ زبر سے نہیں کیا جاتا، یہ خفیف ساز بر حقی صاحب کے نزدیک فتحۂ مجہول ہے۔ اسی طرح لفظ

''سہرا'' میں زیر یا کسرہ تو ہے مگر یہ اس کسرے سے مختلف ہے جو مثلاً ''دِل'' جیسے الفاظ میں ہے۔ چنانچہ اسے کسرۂ مجہول کا نام دیا گیا ہے۔ اور وہ پیش یا ضمہ جو ''شہرت'' جیسے الفاظ میں ہے اس پیش سے الگ ہے جو مثلاً ''سُن'' جیسے لفظوں میں سنائی دیتا ہے[۵۰]۔ اسے ضمۂ مجہول کہا گیا۔

ان تینوں مصوتوں کو اوکسفرڈ کی اردو بہ انگریزی لغت میں بھی شامل کیا گیا ہے اور ان کے لیے اعراب بھی طے کیے گئے ہیں[۵۱] تا کہ اردو کے بعض الفاظ کا صحیح تلفظ پیش کیا جا سکے کیونکہ اردو کے بعض الفاظ میں موجود ان مصوتوں کے درست تلفظ کی تحریر میں نشان دہی کے لیے ان تینوں اضافی مصوتوں کو شامل کرنا ضروری ہے، مثلاً لفظ ''شہرت'' کے تلفظ میں ضمہ (پیش) اس طرح کا تلفظ نہیں رکھتا اور یہ واو کا تلفظ بھی نہیں ہے بلکہ یہ واو اور پیش کے درمیان کا ایک تلفظ ہے جسے ضمۂ مجہول کہنا چاہیے۔ یہی صورت فتحہ (یعنی زبر) اور کسرہ (یعنی زیر) کے ضمن میں در پیش ہوتی ہے۔ بہر حال، ان تینوں مصوتوں کو چھوڑ کر اردو میں دس بنیادی مصوتے ہیں۔

☆انفی مصوتے (nasalised vowels)

اسی طرح نکّی یعنی ناک سے ادا کیے جانے والے مصوتے جن کو انفی مصوتے (انف عربی میں ناک کو کہتے ہیں) بھی کہا جاتا ہے (اور جنھیں انگریزی میں nasalised vowel یا nasal vowel کہتے ہیں) کو بھی بنیادی مصوتوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔

انفی مصوتوں کے ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ وہ عمومی مصوتے ہوتے ہیں جن کی آواز ناک سے نکلتی ہے اور بس۔ کیونکہ نون غنہ کوئی الگ سے صوتیہ نہیں ہے، یہ محض ایک مصوتہ ہے جو ناک سے بولا جاتا ہے۔ کچھ صوتیے ایسے ہوتے ہیں جن کی تلفیظ مین سانس منہ سے خارج ہوتی ہے لیکن کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کی تلفیظ میں سانس منہ اور ناک دونوں سے خارج ہوتی ہے۔ تلفیظ میں ناک سے سانس خارج ہونے کے اس عمل کو انفیانا (nasalisation) کہتے ہیں اور ایسے صوتیے انفی (nasal) کہلاتے ہیں[۵۲]۔

مثلاً لفظ ''ماں'' میں الف کی آواز ناک سے نکل رہی ہے اور اس لفظ کے آخر میں لکھا نون غنہ (ں) کوئی الگ سے آواز نہیں ہے۔ یہ اردو املا کی مجبوری ہے کہ انفیت (nasalisation)

کی نشانی کے طور پر استعمال ہونے والے اس حرف (نون غنے) کو مصوتے کے بعد لکھا جاتا ہے (مثلاً لفظ ماں میں الف کے بعد)۔ ورنہ اصولاً تو اس نون غنے کو مصوتے (مثلاً الف) کے اوپر لکھا جانا چاہیے۔ بین الاقوامی صوتیاتی حروفِ تہجی (آئی پی اے IPA) میں بھی انفیت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی علامت (جو اردو کے مد سے مشابہ ہے) مصوتے کے اوپر بنائی جاتی ہے جسے انگریزی میں tilde کہتے ہیں۔ اس کی شکل کچھ یوں ہوتی ہے: ~

یعنی اگر لفظ ''ماں'' کو آئی پی اے میں لکھا جائے تو اسے یوں لکھنا ہوگا:

mã

یہی وجہ ہے کہ اردو املا میں بسا اوقات بعض الفاظ کے املا میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور بعض پرانی کتابوں اور لغات میں بعض الفاظ مثلاً پاؤں، چھاؤں اور گاؤں وغیرہ کا املا پانْو، چھانْو اور گانْو لکھا جاتا تھا، یعنی نون غنہ یا انفیت کی علامت مصوتے (یعنی الف) کے فوراً بعد لکھی جاتی تھی اور اس کی وضاحت کے لیے اس کے اوپر اردو کی گنتی کا آٹھ (۸) کا عدد الٹا لکھا جاتا تھا یعنی یوں ۷ ۔ کچھ کتابوں میں اس کی بجائے ایک ننھا منا سا ہلال (ں) بنایا جاتا تھا۔ کچھ لوگ مثلاً رشید حسن خان اسی طرح لکھنے کے حامی تھے[۵۳] اور ان کی کتابوں میں نون غنہ اسی طرح واضح طور پر بنایا جاتا تھا۔ اور یہ املا (پانْو، چھانْو وغیرہ) بالکل درست ہے کیونکہ ان الفاظ میں انفیت الف کے بعد ہے نا کہ ان الفاظ کے آخر میں، یعنی ہم جب لفظ گاؤں بولتے ہیں تو یہ آواز سنائی دیتی ہے:

''گ اں وْ''

لیکن اس کا املا گاؤں کرنے سے بظاہر اس کی آواز یوں ہو جاتی ہے:

''گ اوں''

لیکن ہم ''گ اوں'' نہیں بولتے ۔ آئی پی اے میں یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور اس لفظ (گانْو یا گاؤں) کو آئی پی اے میں یوں لکھا جائے گا:

ga:õ

آئی پی اے کا ذکر ان شاء اللہ اگلے باب میں ہوگا۔

حواشی:

۱۔ کنسائز اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری، گیارھواں ایڈیشن، ۲۰۰۶ء۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ لارنس شریبرگ ودیگر (Lawrence D.Shriberg Et al)، Clinical Phonetics (بوسٹن: ایلن اینڈ بیکن، ۲۰۰۳ء) ص ۸ [تیسرا ایڈیشن]۔

۴۔ ایا بوڈ اومولارا ڈینیل، (Iyabode Omolara Daniel)، Introductory Phonetics and Phonology of English (ٹائین، کیمبرج اسکالرز پبلشنگ، ۲۰۱۱ء) محولہ بالا، ص ا۔

۵۔ الرائیک گٹ (Ulrike Gut)، Introduction to English Phonetics and Phonology، (فرینکفرٹ: پیٹر لینگ، ۲۰۰۹ء)، ص ۶۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ جان جے اوہالا (John J. Ohala)، The Relation Between Phonetics and Phonology، مشمولہ The Handbook of Phonetic Sciences، (مدیران ولیم جے ہارڈ کاسل ودیگر) (William J. Hardcastle Et al)، (اوکسفرڈ: ولی بلیک ویل، ۲۰۱۳ء)، ص ۶۵۵ [دوسرا ایڈیشن]

۸۔ ایضاً۔

۹۔ ڈیوڈ کرسٹل، The Cambridge Encyclopedia of Language، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۶۰۔

۱۰۔ گیان چند، عام لسانیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص ۸۹۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔

۱۲۔ اقلی تخالفی جوڑے اور صوتیے کے ضمن میں مختلف کتابوں میں تفصیل موجود ہے مثلاً: وکٹوریا فرامکن ودیگر An Introduction to Language، محولہ بالا، ص ۲۴۶؛ نیز لارنس ڈی شریبرگ و دیگر، Clinical Phonetics، محولہ بالا، ص ۷، ۱۲؛ ایان آر اے میک کے، Phonetics: The Science of Speech Production، محولہ بالا، ص ۱۸۱۔

۱۳۔ میکائیل ایشبی ودیگر، Introducing Phonetic Science، (دہلی: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۳۶۔

۱۴۔ ایان آر اے میک کے، Phonetics: The Science of Speech Production، (آسٹن: پرو ایڈ، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۸۱۔

۱۵۔ مثلاً: لارنس ڈی شریبرگ و دیگر، Clinical Phonetics، محولۂ بالا، ص ۷۔
۱۶۔ اکماجین و دیگر، Linguistics: An Introduction to Language and Communication، (کیمبرج: ایم آئی ٹی پریس، ۲۰۱۰ء)، ص ۹۶۔
۱۷۔ ایضاً۔
۱۸۔ جارج یول (George Yule)، The Study of Language (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء) [دوسرا ایڈیشن]، ص ۵۷۔
۱۹۔ ایضاً۔
۲۰۔ شری برگ، محولۂ بالا، ص ۸
۲۱۔ یہ مثال ابواللیث صدیقی کی کتاب ادب اور لسانیات (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء، ص ۲۵۷) اور گیان چند کی کتاب عام لسانیات (محولۂ بالا، ص ۱۷۰) سے ماخوذ ہے۔
۲۲۔ اردو لسانیات (دہلی: اردو محل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۶۶۔
۲۳۔ محبوب عالم خان، اردو کا صوتی نظام (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۳۲۔
۲۴۔ اردو لسانیات، محولۂ بالا، ص ۷۰۔۶۶؛ نیز یہی بات نصیر صاحب نے اپنی کتاب اردو ساخت کے بنیادی عناصر (دہلی: اردو محل بلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۹۰) میں بھی لکھی ہے۔
۲۵۔ اردو کا صوتی نظام، محولۂ بالا، ص ۶۷۔۱۷
۲۶۔ مقالاتِ مسعود (دہلی: ترقیٔ اردو بیورو، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۳۔۱۲
۲۷۔ A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu (علی گڑھ: شعبۂ اردو علی گڑھ یونی ورسٹی، ۱۹۵۴ء)، ص ۹۔ اس کا اردو ترجمہ اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ کے عنوان سے مرزا خلیل احمد بیگ نے کیا۔ (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۸۶ء)، ص ۲۸۔
۲۸۔ اردو لسانیات، محولۂ بالا، ص ۶۵۔۵۹
۲۹۔ مقالاتِ مسعود، محولۂ بالا، ص ۱۴۔
۳۰۔ سبزواری، اردو لسانیات، محولۂ بالا، ص ۶۵۔۵۹
۳۱۔ اردو لسانیات، محولۂ بالا، ص ۷۱۔۶۷
۳۲۔ ادب اور لسانیات، محولۂ بالا، ص ۲۷۳، ۲۶۰۔
۳۳۔ صوتیات اور فونیمیات (دہلی: ترقیٔ اردو بیورو، ۱۹۹۴ء) ص ۸۳۔
۳۴۔ اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت (کراچی: اوکسفرڈ، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۲۔۲۹
۳۵۔ آواز شناسی (ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۳ء)، ص ۹۰۔

۳۶۔ ایضاً،ص ۱۲۴۔

۳۷۔ اردوزبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۵،۱۴۔

۳۸۔ نئی اردو قواعد (لاہور: کمبائنڈ پبلشرز، ۱۹۸۸ء)، ص ۳۰۔۲۹۔

۳۹۔ ایضاً،ص ۳۴۔۳۲۔

۴۰۔ (حیدرآباد دکن: مکتبۂ ابراہیمیہ، سن ندارد)، ص ۶۴۔۶۳

۴۱۔ Urdu Grammar: History and Structure (دہلی: باہری پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء)، ۱۵۔۱۴

۴۲۔ محولۂ بالا،ص ۱۱۳۔

۴۳۔ ایضاً،ص ۱۹۱۔

۴۴۔ عمومی لسانیات (کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۰۹۔

۴۵۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو (دہلی: آزاد کتاب گھر، ۱۹۶۴ء)، ص ۲۳۔

۴۶۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، مشمولہ اردو لسانیات (مرتبہ فضل الحق) (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۸۱ء) ص ۱۹۵ [اشاعتِ دوم، بعد نظرِ ثانی]۔

۴۷۔ ایضاً،ص ۲۰۱۔۲۰۰۔

۴۸۔ ایضاً،ص ۱۹۵؛ نیز اردو زبان اور لسانیات (لاہور: سنگِ میل، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۵۷۔۳۵۶

۴۹۔ اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، مشمولہ اردو لسانیات (مرتبہ فضل الحق)، محولۂ بالا، ص ۱۹۶۔

۵۰۔ فرہنگِ تلفظ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء)، ص ل؛ نیز اردو لغت تاریخی اصول پر، جلد اول (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۷ء)، دیکھیے: تلخیصات و اشارات، ص الف ج۔

۵۱۔ اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت، محولۂ بالا، ص اکتیس۔

۵۲۔ عبدالسلام، عمومی لسانیات، محولۂ بالا، ص ۸۴؛ نیز گیان چند، عام لسانیات، محولۂ بالا، ص ۱۱۶۔

۵۳۔ اردو املا (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء) ص ۲۴۵۔۲۴۱۔

☆......☆......☆

دسواں باب: فونیمیات (۲)

صوت رکن، صوت رکنی ساخت اور صوتیاتی حروفِ تہجی

اس باب میں ہم فونیمیات کے چند اہم موضوعات مثلاً صوت رکن (سلیبل)، صوت رکنی تحریر اور صوتیاتی حروفِ تہجی (آئی پی اے) سے متعلق کچھ عرض کریں گے[۱]۔

☆ صوت رکن (syllable)

صوت رکن یا سلیبل (syllable) کے وجود پر تو ماہرینِ لسانیات متفق ہیں لیکن اس پر اتفاق نہیں ہے کہ صوت رکن ہے کیا[۲]۔ کیونکہ آج تک کوئی ایسی جامع و مانع تعریف پیش نہیں کی جاسکی جس پر سب متفق ہوسکیں[۳]۔ صوت رکن کی کوئی متفقہ تعریف نہ ہونے کے باوجود کسی زبان کے بولنے والے یہ بتا سکتے ہیں کہ اس زبان کے کسی لفظ کا صُوت رکنی ڈھانچا کیا ہے یا اس میں کتنے صوت رکن ہیں[۴]۔ یوں تو صوت رکن کی کچھ تعریفیں متعین کی بھی گئی ہیں اور صوتیات میں کئی ایسے شعبے ہیں جہاں مباحث میں صوت رکن کی اصطلاح کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے لیکن ان سب مواقع پر کسی ایک تعریف کا مکمل اطلاق نہیں ہوسکتا اور، جیسا کہ ہوگن (Haugen) نے آج سے کوئی ساٹھ سال پہلے کہا تھا، صوت رکن لسانیاتی تشریح کے ضمن میں ایک طرح سے سوتیلا بچہ ہے[۵]۔

آواز کے چھوٹے سے چھوٹے جز و یا مفرد اکائی، جسے اردو میں صوتیہ اور انگریزی میں فونیم (phoneme) کہتے ہیں، کا تصور تو بہت بعد کی پیداوار ہے لیکن صوت رکن کا شعور خاصا قدیم ہے[۶]۔ قدیم ہندوستان میں بھی صوت رکنوں کا شعور موجود تھا اور دوسری صدی عیسوی کے

قواعد داں پتن جلی (Patanjali) نے بھی اس پر بحث کی ہے[7]۔ البتہ صحیح معنوں میں صوت رکن کا تعارف انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں کرایا گیا اور اس کا سائنسی مطالعہ کوئی ایک صدی سے جاری ہے لیکن آج بھی کئی لوگ صوت رکن کی ہستی کے منکر ہیں کیونکہ اسے ایک قابلِ پیمائش وجود (measurable entity) کے طور پر پیش کرنا مشکل ہے[8] اور یہ، بقول اٹو جیسپرسن (Otto Jespersen) کے، ایسی ہی منطق ہے کہ ہم سامنے نظر آنے والے پہاڑوں کے وجود سے اس لیے انکار کر دیں کہ دو پہاڑوں کے درمیانی فاصلے کے بارے میں ہم یہ طے نہ کر سکیں کہ کس وادی کا کون سا حصہ کس پہاڑ میں شامل ہے[9]۔

لیکن نسبتہً حالیہ دور میں ماہرین نے صوت رکن کی تعریف کی بحثوں میں زیادہ الجھنے کی بجائے اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ صوت رکن صوتیاتی تشریحات کی ایک اکائی ہے[10]۔ بہر حال، صوت رکن کی ایک تعریف جو بالعموم انگریزی مصادر و منابع میں ملتی ہے کچھ یوں ہے:

A syllable is a phonological unit composed of one or more phonemes.

یعنی صوت رکن ایک صوتیاتی اکائی ہے اور یہ ایک یا ایک سے زیادہ صوتیوں پر مشتمل ہوتا ہے[11]۔

دراصل ہم کسی طویل لفظ کو ایک ساتھ نہیں بولتے بلکہ اسے ٹکڑوں میں بانٹ کر بولتے ہیں، جیسے لفظِ مستقبل کو ہم مُس + تَق + بِل بولتے ہیں۔ یہ تین ٹکڑے دراصل تین صوت رکن یا سلیبل ہیں اور ہر صوت رکن میں کچھ آوازیں (صوتیے) ہیں۔ یعنی لفظ میں صوت رکن ہوتے ہیں اور ہر صوت رکن میں ایک یا ایک سے زیادہ آوازیں ہوتی ہیں۔ گویا صوت رکن چھوٹے سے چھوٹا صوتی ٹکڑا ہے جسے آلاتِ تلفظ ایک ساتھ ادا کر سکیں[12]۔ صوت رکن ایک لفظ بھی ہو سکتا ہے اور ایک لفظ کا حصہ بھی۔ مثلاً لفظ ''لڑکا'' میں پانچ صوتیے یا فونیم ہیں (لام، زبر، ڑے، کاف اور الف، کیونکہ دراصل زیر، زبر، پیش بھی اردو کے صوتیوں میں شامل ہیں، یہ مصوتے (vowel) ہیں گو مختصر ہیں)۔ لیکن اس لفظ میں دو صوت رکن ہیں ایک ''لڑ'' اور دوسرا ''کا''۔ مزید وضاحت کی جائے تو صوت رکن تلفظ کو ظاہر کرنے کی ایسی اکائی ہے جس میں ایک مصوتہ (vowel) آگے یا

پیچھے کے مصمتے (consonant) کے ساتھ (یا بغیر بھی) ہوتا ہے۔ کیونکہ تنہا مصمتہ ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مصوتہ لگانا پڑتا ہے لیکن تنہا مصوتے کو ادا کرنا ممکن ہے۔

اسی لیے اردو کا ایک صوت رکن اگر ایک مصوتے پر مشتمل ہے تب بھی ایک لفظ ہو سکتا ہے، مثلاً ''آ''۔ یہ ایک صوتیہ ہے جو مصوتہ ہے، اور صوت رکن بھی اور لفظ بھی۔ ''لڑکا'' ایک لفظ ہے، اس میں دو صوت رکن ہیں یعنی ''لڑ'' اور ''کا'' اور، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، پانچ صوتیے ہیں جن میں سے دو مصوتے ہیں (زبر اور الف) اور تین مصمتے ہیں (ل، ڑ، ک)۔ یہاں پہلا صوت رکن اس طرح بنا ہے کہ پہلے ایک مصمتہ ہے (ل) پھر ایک مصوتہ ہے (لام پر زبر) اور پھر ایک مصمتہ ہے (ڑ)۔ دوسرے صوت رکن میں پہلے ایک مصمتہ (ک) ہے اور پھر ایک مصوتہ (الف)۔

☆ صوت رکنی تحریر (syllabic writing)

صوت رکنوں میں شامل مصمتوں اور مصوتوں کو تحریری طور بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسے صوت رکنی تحریر (syllabic writing) کہتے ہیں۔ اس میں مصوتے (vowel) کو انگریزی کے حرف وی (v) سے اور مصمتے (consonant) کو سی (c) سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر لفظ ''لڑکا''، جو پانچ صوتیوں (دو مصوتوں اور تین مصمتوں) پر مشتمل ہے، یوں لکھا جائے گا: cvc-cv (درمیانی ڈیش یا چھوٹی افقی لکیر صوت رکنوں کو الگ کرنے کے لیے ہے)

اس میں پہلا صوت رکن ''لڑ'' (cvc) اور دوسرا صوت رکن ''کا'' (cv) ہے۔ صوت رکن کو ذیلی اجزا میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے لیکن سلیبل کی ذیلی اجزا میں تقسیم سرِ دست یہ ہمارا موضوع نہیں ہے لہٰذا اس سے گریز کیا جاتا ہے۔

صوت رکن کی بعض زبانوں میں بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے کیونکہ ان زبانوں کے الفاظ میں بَل یا زور (جسے لسانیات کی اصطلاح میں (stress) کہتے ہیں) ہوتا ہے اور کسی خاص صوت رکن پر زور دینے سے لفظ کا مفہوم تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی کے کچھ الفاظ ایسے ہیں کہ ان کے کسی خاص صوت رکن پر زور دینے سے مفہوم میں اسم اور فعل کا فرق پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً لفظ contest کا تلفظ کرتے ہوئے پہلے صوت رکن یعنی con پر زور دیا جائے اور

اسے ''کون ٹسٹ'' پڑھا جائے تو یہ اسم (یعنی مقابلہ یا نزاع یا بحث) کا مفہوم ادا کرتا ہے اور اگر اس کے پہلے صوت رکن پر زور نہ دیا جائے اور اس کا تلفظ ''کن ٹسٹ'' کیا جائے تو یہ فعل (یعنی مقابلہ ''کرنا'' یا بحث ''کرنا'') کا مفہوم ادا کرتا ہے [۱۳]۔

اردو میں صوت رکن کا مفہوم سے اس طرح کا تعلق تو نہیں ہوتا جس طرح انگریزی میں ہوتا ہے لیکن جب تک صحیح صوت رکن پر زور نہ دیا جائے تلفظ اکھڑا اکھڑا سا معلوم ہوتا ہے [۱۴]۔ یہاں صوت رکنوں سے متعلق اس سے زیادہ تفصیل غیر ضروری ہوگی کیونکہ اس باب کا اصل مقصد اردو کے صوت رکنوں کی ساخت، ان کی خصوصیات اور ان میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینا اور ضمنی طور پر یہ دیکھنا ہے کہ اردو میں بعض الفاظ کے ابتدائی حروف کے تلفظ میں جو اختلافات ہیں (اور جو ''سکونِ اول کا مسئلہ'' کے نام سے معروف ہیں) ان کو لسانیات اور صوتیات کی روشنی میں کیسے دیکھا جائے۔

☆اردو الفاظ کی صوت رکنی تحریر

اردو فونیمیات میں صوت رکن یا سلیبل کا اہم کردار ہوتا ہے بلکہ کسی بھی زبان کی صوتی ساخت کو سمجھنے کے لیے اس کے صوت رکنوں اور ان کی ساخت و ترتیب کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔

کچھ اردو الفاظ کو صوت رکنی تحریر میں یہاں پیش کیا جا رہا ہے تا کہ صوت رکنوں کی ساخت اور ان میں مصوتوں اور مصمتوں کی ترتیب واضح ہو سکے۔ مصمتے یعنی کونسوننٹ (consonant) کے لیے سی (c) اور مصوتوں یعنی واول (vowel) کے لیے وی (v) لکھا جاتا ہے۔ علامات کے درمیان میں موجود چھوٹی افقی لکیر یا ڈیش دراصل صوت رکنوں کو الگ کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ نصیر احمد خان نے اردو الفاظ کو صوت رکنی تحریر میں لکھا ہے [۱۵] اور ہم نے یہاں ان سے خاصی مدد لی ہے۔ یاد رہے کہ زیر، زبر اور پیش بھی مصوتے ہیں اور انھیں وی (v) سے ظاہر کیا جاتا ہے:

۱۔ یک صوت رکنی الفاظ (monosyllabic words)

یک رکنی صوتی ساخت رکھنے والے چند اردو الفاظ یہ ہیں:

آ v

او v

آپ vc

کو cv

بات cvc

سچ cvc [س (مصمتہ)، زبر (مصوتہ)، چ (مصمتہ)]

شرط cvcc [ش (مصمتہ)، زبر (مصوتہ)، ر (مصمتہ)، ط (مصمتہ)]

۲۔ دو صوت رکنی الفاظ (disyllabic words)

دو صوت رکنی ساخت والے چند اردو الفاظ:

آئی (آ + ئی) v-v

آدھا (آ + دھا) v-cv

لڑکا (لڑ + کا) cvc-cv

عورت (عو + رت) cv-cvc

صدا (صَ + دا) cv-cv [ص (مصمتہ)، زبر (مصوتہ)، د (مصمتہ)، الف (مصوتہ)]

مزدور (مز + دور) cvc-cvc

۳۔ سہ صوت رکنی الفاظ (trisyllabic words)

سہ صوت رکنی ساخت رکھنے والے چند اردو الفاظ یہ ہیں:

بہنوئی (بہ + نو + ئی) cvc-cv-v

رضامند (رَ + ضا + مند) cv-cv-cvcc

شرمندہ (شر+من+دہ)	cvc-cvc-cv
بےوقوف (بے+وَ+قوف)	cv-cv-cvc
خوب صورت (خوب+صو+رت)	cvc-cv-cvc
سلامی (سَ+لا+می)	cv-cv-cv

۴۔ چہار صوت رکنی الفاظ (four-syllable words)

اردو میں الفاظ کی چار رکنی ساخت کی مثالیں:

چمچہ گیری (چم+چہ+گی+ری)	cv-cv-cv-cv
مچھر دانی (مچ+چھر+دا+نی)	cv-cvc-cv-cv

(یہاں پہلے صوت رکن میں مچھ نہیں بلکہ مچ ہی آئے گا کیونکہ اردو میں جب ہائیہ آواز مشدد ہوتی ہے تو اس کا پہلا جز و غیر ہائیہ ہوتا ہے، جیسے: مکھی کو ہم مکھ+کھی نہیں بلکہ مک+کھی بولتے ہیں)

پاگل خانہ (پا+گل+خا+نہ)	cv-cvc-cv-cv

ہم نے دیکھا کہ اردو میں چار صوت رکن والے الفاظ بہت کم ہیں اور جن کی ہم نے مثالیں اوپر دی ہیں درحقیقت وہ بھی مرکبات ہیں۔ بلکہ تین صوت رکن رکھنے والے الفاظ کی فہرست میں بھی کچھ مرکبات شامل ہیں۔ یہی صورت پانچ رکنی الفاظ کی ہے کہ ''ستم ظریف'' (سِ+تم + ظ + ریف) بھی دراصل ایک لفظ نہیں ہے۔عبدالسلام صاحب نے ایک ترکیب ''نا قابلِ دست اندازیٔ پولیس'' دی ہے اور بتایا ہے کہ اس میں گیارہ سلیبل یا صوت رکن ہیں [۱۶]۔

☆ مصمتی خوشے (Consonantal Clusters)

اردو میں بعض الفاظ کے ابتدائی حروف کے تلفظ کا مسئلہ دراصل مصمتی خوشوں (consonantal clusters) سے جڑا ہوا ہے (انگریزی کے جدید لسانیاتی مطالعوں میں اس کا ایک نام consonantal blends بھی ملتا ہے)۔لہٰذا بہتر ہوگا کہ پہلے مصمتی خوشوں کے بارے میں کچھ عرض کر دیا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ کچھ طالب علم اس اصطلاح سے واقف نہ ہوں۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں صوتیے یا فونیم (phoneme) دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک مصوتے (vowels) اور دوسرے مصمتے (consonants)۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب دو یا دو سے زیادہ مصمتے ایک ساتھ اس طرح آئیں کہ ان کے درمیان کوئی مصوتہ نہ ہو تو ایسی صوتی ساخت کو مصمتی خوشہ کہتے ہیں [۱۷]۔ البتہ اس سے اختلاف بھی کیا گیا ہے اور کہا گیا کہ لفظ میں کسی مصوتے کی مداخلت کے بغیر جو مصمتے برابر برابر آتے ہیں انھیں خوشے تسلیم کرلیا جاتا ہے لیکن بعض ماہرینِ لسانیات نے خوشوں کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق مصمتی خوشے صرف ان مصمتوں کو کہنا چاہیے جو ایک ہی صوت رکن میں لگاتار یعنی کسی درمیانی مصوتے کے بغیر آئیں۔ بصورتِ دیگر ایسی تقسیم کو مصوتوں کا سلسلہ (consonantal sequence) کہنا چاہیے [۱۸]۔ لہٰذا مصمتی خوشوں کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ مختلف مصمتوں کا ایسا سلسلہ ہے جو بغیر کسی صوتی رکاوٹ کے ایک ہی صوت رکن کے ساتھ ادا ہو [۱۹]۔ اور مصمتی خوشوں کی یہی تعریف زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال، دونوں صورتوں میں، یعنی لگاتار مصمتے ایک ہی صوت رکن میں آئیں یا دو رکنوں میں، ان کا ورود ساتھ ساتھ یعنی بغیر کسی درمیانی مصوتے کے ہوتا ہے۔

درجِ ذیل الفاظ میں مصمتی خوشے موجود ہیں اور یہاں ان کی صوت رکنی تحریر میں وضاحت بھی کی جا رہی ہے (ملاحظہ ہو کہ کس طرح صوت رکنی تحریر میں ایک ساتھ یعنی بغیر کسی درمیانی مصوتے کے آنے والے مصمتے انگریزی حرف ''سی'' سے ظاہر ہو رہے ہیں):

سخت　　cvcc　　(وضاحت: س= c، زبر= v، خ= c، ت= c)
(زبر مصوتہ ہے)۔

درخت　　cv-cvcc

وقت　　cvcc

جلد باز　　cvcc-cvc

شرمناک　　cvcc-cvc

☆ اردو کے صوت رکنوں کی ساخت اور خصوصیات

اردو الفاظ کی صوتیاتی بناوٹ پر غور کیا جائے تو یہ خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ اردو میں یک صوت رکنی (mono-syllabic) الفاظ عام ہیں۔ اکیلا مصمتہ تو ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا (اس سے پہلے یا بعد میں کوئی نہ کوئی مصوتہ لگانا پڑتا ہے) لیکن اکیلا مصوتہ نہ صرف ادا ہوسکتا ہے بلکہ اردو میں بعض مصوتے صوت رکن بن جاتے ہیں اور اردو کے بعض مصوتے الفاظ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتے ہیں، یہ مصوتے بھی ہیں، صوت رکن بھی ہیں اور لفظ بھی، مثلاً:

آ v

اے v [۲۰]

۲۔ اردو میں ایسے الفاظ کثرت سے ہیں جو یک صوت رکنی ہیں اور ان کی صوتیاتی ساخت cvc ہے، مثلاً: بات، جان، موڑ، پُل، دِل وغیرہ۔

۳۔ اردو میں ایسے یک صوت رکنی الفاظ بھی ہیں جن کی صوتیاتی ساخت vc ہے، مثلاً: آج، ایک، اُڑ، اَب، وغیرہ۔

۴۔ اردو میں ایسے یک صوت رکنی الفاظ بھی ہیں جن کی صوتیاتی ساخت cv ہے، مثلاً: جو، سے، کا، وغیرہ۔

اردو کا فعلِ امر بھی اسی ضمن یعنی cv میں آسکتا ہے, جیسے: جا، لا، کھا، وغیرہ۔

۵۔ اردو کا صوتیاتی مزاج مصمتی خوشوں کے خلاف ہے لیکن جن زبانوں کے الفاظ سے ہم نے اردو کا خزانہ بھرا ہے ان میں مصمتی خوشے کثرت سے ہوتے ہیں، یعنی عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی۔ یہ عام طور پر ان میں سے بعض زبانوں میں الفاظ کے شروع میں آتے ہیں اور کبھی خاتمے پر بھی آجاتے ہیں [۲۱]۔ بقول مسعود حسین خان خاتمے کے خوشوں کا اردو احترام کرتی ہے (یعنی اردو والے کسی نہ کسی طرح بول لیتے ہیں) لیکن لفظ کی ابتدا میں مصمتی خوشے اردو کے لیے ناقابلِ برداشت ہیں [۲۲]۔ (یعنی ان کا بولنا اردو والوں کے لیے مشکل ہے)۔

اردو الفاظ کے آغاز میں (سوائے ان خالص سنسکرت الفاظ کے جنھیں تت سم کہتے

ہیں) مصمتی خوشے نہیں آتے۔ چند ایسی مثالیں ضرور ہیں جن کی ابتدا میں مصمتی خوشے آتے ہیں مگر ان میں نیم مصوتہ (semi-vowel) پایا جاتا ہے۔ اسے اردو لغات اور قواعد و عروض میں عام طور پر ''یائے مخلوط'' کہہ کر واضح کیا جاتا ہے، اس کی مثالیں یہ ہیں: کیوں، پیار، پیاز، کیا (یعنی انگریزی کے لفظ what کے معنی میں نہ کہ ''کرنا'' کے ماضی ''کِیا'' (did) کے معنی میں جس میں کاف کے بعد زیر یعنی مصوتہ موجود ہے) وغیرہ۔ ان الفاظ کو بولنے میں اردو والے نیم مصوتے کی وجہ سے کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے البتہ ابتدا میں دو مصمتے ایک ساتھ آ جائیں یعنی مصمتی خوشہ بن جائے تو مسئلہ ہوتا ہے (اس کا ذکر آگے آ رہا ہے)۔

اس طرح کی بہت سی مثالیں اور ساختیں ہیں لیکن بخوفِ طوالت ان سے گریز کیا جا رہا ہے۔

☆ اردو صوت رکنوں کی ساخت میں ہونے والی تبدیلیاں

اردو صوت رکنوں کی صوتیاتی ساخت میں ہونے والی تبدیلیوں میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ اردو میں چونکہ ابتدائی مصمتی خوشوں کا وقوع ممکن نہیں لہٰذا سنسکرت (یعنی تت سم) الفاظ میں پائے جانے والے ابتدائی مصمتی خوشے اردو میں توڑ دیے جاتے ہیں۔ یہ اردو کی ایک خاص صفت ہے، مثلاً برہمن (ب ساکن) یا پرچار (پ ساکن) جیسے الفاظ جن میں ابتدائی مصمتی خوشہ ہے یعنی دو ابتدائی مصمتوں کے درمیان کوئی مصوتہ نہیں ہے ان کو اردو میں توڑ کر برہمن (ب مکسور) اور پَرچار (پ مفتوح) بولا جاتا ہے یعنی دو مصمتوں کے درمیان ایک مصوتہ داخل کر دیا جاتا ہے [۲۳]۔ اس طرح ایک صوتیے کا اضافہ ہو جاتا ہے اور ''برہمن'' کے صوت رکنوں کی صوتیاتی ساخت ccvc-cvc کی بجائے cvc-cv-cvc ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ''پرچار'' کی صوتیاتی ساخت ccv-cvc کی بجائے cvc-cvc ہو جاتی ہے۔

۲۔ اردو میں مستعمل کئی عربی اور فارسی الفاظ ایسے ہیں جن کے آخر میں مصمتی خوشہ ہے، مثلاً: نظم، قتل، حکم، صبر، نثر، قبر، وزن، گرم، نرم، ذکر، وغیرہ۔ یعنی ان سب الفاظ کا دوسرا حرف

ساکن ہے (گویا اس پر جزم ہے)۔ ان سب کی صوتیاتی ساخت cvcc ہے۔ پڑھے لکھے لوگ تو اس کا تلفظ شعوری طور پر ٹھیک طرح سے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں خاص طور پر شعر پڑھتے ہوئے (کیونکہ تلفظ کی تبدیلی سے مصرع بحر سے خارج ہوسکتا ہے) لیکن کم پڑھے لکھے لوگ یا عام لوگ کبھی کبھار جلدی میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ آخر کا مصمتی خوشہ قائم نہیں رہتا اور وہ دو آخری مصمتوں کے درمیان ایک مصوتہ داخل کر دیتے ہیں، اور مذکورہ بالا الفاظ کا تلفظ اس طرح ادا ہوتا ہے کہ دوسرے حرف پر جزم کی بجائے زبر لگ جاتا ہے کیونکہ اس طرح بولنا آسان ہے، یعنی نَظَم، قَتَل وغیرہ۔ لیکن اس طرح ان الفاظ کی صوتیاتی ساخت cvcc کی بجائے cv-cvc ہوجاتی ہے[۲۴]۔

۳۔ انگریزی کے کئی الفاظ ایسے ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں ان میں ابتدائی مقام پر مصمتی خوشہ ہے۔ ان کی ساخت میں دو طرح سے تبدیلی ممکن ہے۔ ایک تو یہ کہ ابتدائی مصمتی خوشے کے دو مصمتوں کو ایک ساتھ نہ بول سکنے پر ان سے قبل ایک مصوتے کا اضافہ کر دیا جائے، جیسا کہ بالعموم کراچی والے لفظ school اور smuggling میں کرتے ہیں[۲۵] اور دو مصمتوں یعنی ''س'' اور ''ک'' کو ایک ساتھ اور ''س'' اور ''م'' کو ایک ساتھ نہ بول سکنے پر ابتدا میں زیر کے ساتھ الف کا اضافہ کر کے ان کا تلفظ اِسکول اور اِسمگلنگ کرتے ہیں۔ یہ اہلِ پنجاب کے لیے باعثِ تفنن ہے کیونکہ خود وہ اس طرح کے ابتدائی مصمتی خوشوں میں ایک اور طرح کی تبدیلی کرتے ہیں اور وہ یہ کہ دونوں مصمتوں کو توڑ کر درمیان میں ایک مصوتہ داخل کر دیتے ہیں اور یہ مصوتہ ''س'' اور ''ک'' کے درمیان اور ''س'' اور ''م'' کے درمیان ایک زبر کی صورت میں سنائی دیتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک صحیح تلفظ ''سَکول'' اور ''سَمگلنگ'' ہے۔ کچھ لوگ ایسے مواقع پر زبر کی بجائے زیر کا اضافہ کرتے ہیں اور ان الفاظ کو ''سِکول'' اور ''سِمگلنگ'' بولتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لفظ school کا صحیح تلفظ ان تینوں سے الگ ہے اور اس میں ''س'' اور ''ک'' کی آواز ایک ساتھ اس طرح سنائی دیتی ہے کہ دونوں کے درمیان یا ان سے پہلے کوئی مصوتہ نہیں ہوتا۔

صوتیاتی طور پر یہاں اسکول کے صحیح انگریزی تلفظ کی یک رکنی ساخت ccvc کی بجائے اردو میں دو رکنی یعنی vc-cvc (اِس+کول) یا cv-cvc (سَ+کول) ہو جاتی ہے۔ کچھ اسی طرح کی تبدیلی اردو میں مستعمل انگریزی کے ان تمام الفاظ میں ہوتی ہے جن کی ابتدا میں مصمتی خوشے ہیں اور ان کا پہلا حرف ایس (s) ہے، مثلاً: station,state, stenographer, scout, stool, student وغیرہ۔

لہٰذا یوں دیکھا جائے تو تینوں تلفظ (یعنی سَکول، سِکول، اِسکول) اصل انگریزی تلفظ سے دور اور یکساں غلط اور انگریز کے لیے تینوں یکساں درجے میں باعثِ تفنن ہیں، لیکن اردو کی لسانی اور صوتیاتی مجبوریوں کے پیشِ نظر تینوں درست اور درستی کے ایک ہی درجے پر ہیں۔ کسی ایک کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ کم از کم لسانیاتی یا صوتیاتی بنیادوں پر موجود نہیں ہے۔ ہم اپنی کم علمی یا تعصب کی بنا پر جس کا جتنا جی چاہے مذاق اڑا لیں لیکن یہ علمی رویہ نہیں ہے۔

لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اردو میں اس طرح الف کے اضافے کی صوتیاتی تبدیلیاں بالعموم ان الفاظ کے ساتھ ہوتی ہیں جن کی ابتدا میں آنے والے مصمتی خوشوں کا پہلا حرف ''سین'' ہوتا ہے۔ کیونکہ انگریزی کے کئی دیگر الفاظ جن کے آغاز میں مصمتی خوشے ہیں لیکن ان کا پہلا حرف ''سین'' یا ایس (s) نہیں ہے اردو میں ان کے ساتھ ابتدا میں الف کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔ مثلاً گلاس (glass) اور پلیٹ (plate) کو ہم ''اِگلاس'' یا ''اِپلیٹ'' نہیں بولتے بلکہ اس کے پہلے مصمتے کے بعد ایک مصوتے (زبر یا زیر) کا اضافہ کر کے ''گِلاس'' یا ''گَلاس'' اور ''پِلیٹ'' یا ''پَلیٹ'' بولتے ہیں اور اس پر کوئی نہیں ہنستا۔ خود کراچی والے بھی اسی طرح بولتے ہیں اور انھیں اس پر ''سَکول'' کے برعکس بالکل ہنسی نہیں آتی حالانکہ یہاں ''پلیٹ'' اور ''گلاس'' دونوں کے صوت رکنوں کی ساخت ccvc سے cv-cvc میں تبدیل ہو رہی ہے۔

''اِسکول'' کے تلفظ کے ضمن میں سہیل بخاری تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انگریزی میں یا ہند یورپی زبانوں میں بھی، جن سے انگریزی نے یہ مصمتی خوشوں والے ایسے الفاظ مستعار لیے ہیں، ان لفظوں کا تلفظ کسی زمانے میں کچھ اور ہوگا[۲۶]۔ بقول ان کے انگریزی زبان میں ہند یورپی

زبانوں کے ایسے بہت سے الفاظ رائج ہیں جن میں ابتدائی "سین" ساکن نظر آتا ہے لیکن یورپ کی دوسری زبانوں میں ان سے قبل ایک "ای" (e) یعنی الف مکسور کا اضافہ ملتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی، ہسپانوی اور فرانسیسی کے ایسے الفاظ کی فہرست دی ہے [۲۷]۔ ان الفاظ میں انگریزی کے ہجے میں تو پہلا حرف ایس (s) ہے لیکن ہسپانوی اور فرانسیسی ہجے میں اس سے قبل ای (E) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً Spain اور Espana۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو زبان میں ابتدائی مصمتی خوشوں میں ساکن صفیری (fricative) (یعنی س، ز وغیرہ) آوازوں سے قبل الف مع کسرہ کا اضافہ اردو کی اپنی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ قدیم ہند یورپی کا اصول ہے جو برِ عظیم پاک و ہند کی آریائی زبانوں میں قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے [۲۸]۔ اور جہاں تک school کو "سِکول" یعنی سین مکسور سے بولنے کا سوال ہے تو جدید فارسی میں بھی انگریزی کے بعض الفاظ کے تلفظ میں ایس (s) یا "س" کے بعد زیر کے اضافے کا رجحان ہے، مثلاً stalk (بمعنی تنا) کو جدید فارسی میں سِتاک یا اِستاخ لکھا جاتا ہے [۲۹]۔

پس ثابت ہوا کہ school کو اردو میں سکول، سِکول یا اِسکول جس طرح بھی لکھا اور بولا جائے درست ہے اور یہی بات اسی قبیل کے دوسرے الفاظ کے لیے بھی صحیح ہے۔

لیکن چونکہ لغت اور نصابی کتب میں درست املا اور معیاری املا درج کیا جانا ضروری ہے لہٰذا اسے "اِسکول" وغیرہ (یعنی الف مکسور) کے ساتھ لکھنا اور بولنا چاہیے۔ کیونکہ لغت اور قواعد میں استعمال کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور اردو میں زیادہ تر مثالیں "اِسکول" ہی کی ہیں، مثلاً:

اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے:

ان سے بی بی نے فقط اِسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی [۳۰]

اکبر ہی کا ایک اور شعر ہے:

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اِسکول جا [۳۱]

ابن انشا نے کہا کہ:

کھیلنے دیں انھیں عشق کی بازی کھیلیں گے تو سیکھیں گے
قیس کی یا فرہاد کی خاطر کھولیں کیا اِسکول میاں [۳۲]

عنایت علی خان کہتے ہیں:

مکتبِ فکر ہے اِسکول نہیں ہے صاحب
قومیانے کی اجازت نہیں دی جائے گی [۳۳]

اس لفظ کو ان مصرعوں میں ''اِسکول'' کی بجائے ''سَکول'' پڑھنے سے یہ مصرعے بحر سے خارج ہو جائیں گے۔

☆ مصوتوں کی تحریری شکل اور تلفظ

زبان میں مستعمل آوازوں یا مصوتوں (فونیموں) کو حروفِ تہجی کی شکل میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ گویا حروفِ تہجی آوازوں یا صوتیوں کی علامات ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جو زبان ہم بولتے ہیں اسے تحریری شکل میں ظاہر کیا جائے تو کچھ نہ کچھ کمی یا خامی رہ جاتی ہے اور بعض الفاظ کا تلفظ سو فی صد درست طور پر ظاہر نہیں ہو پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان کا رسم الخط ایسا نہیں ہے جو اس کے تمام الفاظ کے تلفظ کو بتمام و بکمال تحریر میں ظاہر کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں مختلف زبانوں میں رسم الخط کی اصلاح کا رجحان موجود رہا ہے۔

انگریزی زبان کے ہجے کے قوانین خاصے بدنام ہیں اور انگریزی میں بسا اوقات لکھا کچھ جاتا ہے اور پڑھا کچھ اور جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انگریزی کے حروفِ تہجی کی تعداد چھبیس (۲۶) ہے لیکن اس کے صوتیوں یا فونیموں کی تعداد بیالیس (۴۲) سے لے کر چوالیس (۴۴) تک بتائی جاتی ہے [۳۴]۔ گویا یہ رسم الخط اپنی تمام آوازوں کو عمدہ طریقے سے ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔

معروف ادیب جارج برنرڈ شا (George Bernard Shaw) انگریزی ہجے کے

قوانین سے سخت نالاں اور انگریزی کے قوانین ہجے اور حروفِ تہجی میں ترمیم و اضافے کا حامی تھا۔ اس نے اپنی وصیت میں یہ بات شامل کی کہ جو شخص انگریزی کے حروفِ تہجی اور ہجے کے قوانین درست کرے اسے میری جائیداد میں سے کچھ حصہ دیا جائے [۳۵]۔ یہ بات بھی جارج برنرڈ شا سے منسوب ہے کہ انگریزی کے ہجے کے قوانین اتنے بے ضابطہ ہیں کہ انگریزی میں ghoti لکھ کر اسے fish پڑھنا ممکن ہے۔ اس نے اپنی اس بات کی وضاحت یوں کی کہ انگریزی میں کبھی کبھی ایف (f) کی آواز کو gh سے ظاہر کیا جاتا ہے، جیسے ''لاف'' (laugh) میں۔ کبھی او (o) کا حرف آئی (i) کی آواز دیتا ہے، جیسے ''ویمن'' (women) میں۔ اسی طرح ti کے حروف کبھی sh کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں جیسے ''نیشن'' (nation) میں۔ پس انگریزی میں fish کو ghoti لکھنا ممکن ہے [۳۶]۔

مختصراً یہ کہ دنیا میں شاید ہی کوئی رسم الخط ایسا ہو جس میں املا اور ہجے کے مسائل نہ اٹھتے ہوں اور جب ایک زبان کے الفاظ یا اسماے معرفہ کو دوسری زبان کے حروف میں لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی کبھی غلط تلفظ سے بڑی عجیب بلکہ مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اس مسئلے کا حل بین الاقوامی صوتیاتی حروفِ تہجی کی صورت میں نکالا گیا جسے مختصراً ''آئی پی اے'' (IPA) کہا جاتا ہے۔

☆ بین الاقوامی صوتیاتی حروفِ تہجی: آئی پی اے (IPA)

گذشتہ ابواب میں مباحث اور جدولوں میں بھی ہم نے آوازوں کی وضاحت کے لیے اردو کے حروفِ تہجی استعمال کیے ہیں تاکہ طلبہ کو آسانی ہو لیکن اصولاً انھیں آئی پی اے (IPA) میں لکھنا چاہیے تھا۔ آئی پی اے دراصل مخفف ہے International Phonetic Alphabet کا جسے اردو میں بین الاقوامی صوتیاتی حروفِ تہجی کہتے ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی تک یورپی اقوام نے دنیا کے خاصے بڑے حصے کو نوآبادیات بنالیا تھا اور اس کے مقاصد معاشی، تجارتی اور مذہبی (عیسائیت کی تبلیغ) بھی تھے [۳۷]۔ شمالی امریکا،

افریقا، ایشیا اور مشرقِ بعید کے مختلف علاقوں میں درپیش حالات اور حقائق کو بعد میں آنے والوں کے لیے تحریری شکل میں محفوظ کرنا ضروری تھا اور مقامی ناموں اور مقامی زبانوں کے الفاظ کو لکھنے کے لیے ان یورپی اقوام نے اپنی اپنی زبانوں کے حروفِ تہجی استعمال کیے [۳۸]۔ لیکن اس ضمن میں کسی معیاری رسم الخط کی ضرورت تھی نیز اس زمانے میں علم زبان یا فلولوجی (philology) اور زبانوں کی تاریخ سے دل چسپی بڑھ رہی تھی چنانچہ ۱۸۸۶ء میں فرانسیسی ماہر صوتیات پال پیسی (Paul Passy) نے بین الاقوامی صوتیاتی تنظیم (International Phonetic Association) قائم کی اور اس تنظیم نے مختلف ماہرین کے ساتھ مل کر بین الاقوامی صوتیاتی حروفِ تہجی تیار کیے [۳۹]۔ صوتیاتی حروفِ تہجی کا مقصد یہ تھا کہ کسی بھی معلوم یا نامعلوم زبان کو ایک ایسے معیاری رسم الخط یا حروفِ تہجی میں لکھا جائے جس میں اس زبان کے الفاظ کا ٹھیک تلفظ ظاہر ہو سکے اور مختلف زبانیں بولنے والے افراد ان کا درست تلفظ جان سکیں۔ بعد ازاں آئی پی اے میں وقتاً فوقتاً کچھ تبدیلیاں بھی ہوئیں اور اسے بہتر بنایا گیا۔ تنظیم کی کوشش رہی ہے کہ حروفِ تہجی یا تحریر کے ذریعے آواز کی وضاحت یا نمائندگی کے لیے علامات کا ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا جائے جو استعمال میں آسان ہو اور جس میں دنیا کی مختلف زبانوں کی مختلف آوازوں کو جامعیت کے ساتھ ایک معیاری اور یکساں تحریری صورت میں پیش کیا جا سکے [۴۰]۔

دراصل مختلف زبانوں کی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے جب دوسری کسی زبان میں بالخصوص انگریزی میں لکھا جاتا تھا تو صوتیاتی مجبوریوں کی وجہ سے بعض آوازوں کی درست نمائندگی نہیں ہو پاتی تھی اور اس کے لیے پہلے تو انگریزی میں مختلف نشانات کے ساتھ انگریزی میں مستعمل حروفِ تہجی (جو رومن یا لاطینی سے لیے گئے ہیں) ہی کے ذریعے ان آوازوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی جسے ٹرانس لٹریشن (translaiteration) یا نقلِ حرفی کہا جاتا ہے۔ نقلِ حرفی کے نظام کو مشرقی زبانوں کے الفاظ کے درست تلفظ کے دوسری زبانوں میں اظہار کے لیے مختلف اہل علم نے مختلف انداز میں اختیار کیا۔ مستشرقین نے اپنی کتابوں اور دو لسانی لغات میں اپنے اپنے نقلِ حرفی کے نظام وضع کیے اور فرخندہ لودھی نے ان سب کی تفصیل اپنی کتاب [۴۱] میں

دی ہے۔ جس کو یہاں دہرانا مقصود اس لیے نہیں ہے کہ رفتہ رفتہ آئی پی اے (IPA) کے رواج نے ٹرانس لٹریشن یا نقلِ حرفی سے ہمیں بے نیاز کر دیا ہے۔ اب دنیا میں ایک زبان کی آوازوں اور الفاظ کے درست تلفظ کی وضاحت کے لیے آئی پی اے ہی استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں نقلِ حرفی کی بجائے آئی پی اے کا ذکر مطلوب ہے۔

آئی پی اے (IPA) کے بنیادی طور پر رومن حروف پر مبنی ہونے کے باوجود اس میں بعض دیگر مآخذ سے بھی حروف اور علامات لیے گئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی کے برعکس بعض دوسری زبانوں میں آوازوں کی تعداد زیادہ ہے [۴۲]۔ آئی پی اے یا بین الاقوامی صوتیاتی حروف تہجی کئی طرح استعمال ہو سکتے ہیں، مثلاً لغات میں تلفظ ظاہر کرنے کے لیے، لسانیات کی کتابوں یا عملی تحقیق میں آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے، سمعیاتی تلحین (acoustic intonation) کو ظاہر کرنے کے لیے اور تکلم (speech) کے تجزیے کے لیے [۴۳]۔ ان امور میں استعمال کے لیے ضروری تھا کہ آوازوں کی تحریری علامات پر ایک عمومی اتفاق ہو اور علامات کا مفہوم غیر مبہم ہو اور ان میں التباس کا امکان نہ ہو اور آئی پی ان شرائط کو پورا کرتا ہے [۴۴]۔

البتہ وقت کے ساتھ ساتھ صوتیات میں نئی تحقیق اور نئے نظریات کی آمد کے بعد آئی پی اے کی بعض علامات میں تبدیلی ضروری تھی لہٰذا ۱۹۸۹ء میں ان میں کچھ تبدیلی کی گئی۔ بعد ازاں ۲۰۰۵ء میں اس میں مزید تبدیلی کی گئی لیکن اس کے باوجود ان علامات میں تسلسل موجود ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان علامات کے لیے کچھ رہنما اصول طے کیے گئے تھے جن کی بنیاد پر یہ تبدیلی کی گئی [۴۵]۔

اردو کے لیے الگ آئی پی اے بھی تیار کیا گیا ہے اور اس ضمن میں سرمد حسین کا تیار کردہ اردو آئی پی اے جو اوکسفرڈ کی اردو بہ انگریزی لغت میں اختیار کیا گیا ہے، بہتر معلوم ہوتا ہے۔

☆ اردو کے بعض حروفِ تہجی کی دہری حیثیت

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تین مصوتے (vowel) ہیں اور وہ الف (ا)، واو (و) اور ی/ے ہیں۔ یہ اسی قسم کی غلط فہمی ہے جیسی انگریزی کے بارے میں ہے کہ اس میں پانچ

واول یعنی a,e,i,o,u ہیں۔ہم جیسے صوتیات کے طالب علموں کو یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ حروفِ تہجی (یعنی تحریری صورت میں) صوتیے (مصوتے اور مصمتے) نہیں ہیں بلکہ صوتیوں کی تحریری علامت ہیں اور بس۔صوتیے تو وہ ہوتے ہیں جو ہم بولتے ہیں اور ان آوازوں کے نقوش و علامات کے ذریعے اظہار کا نام رسم الخط یا حروفِ تہجی ہے۔

انگریزی کے معیاری لہجے میں چوالیس (۴۴) صوتیے بتائے جاتے ہیں جن میں سے چوبیس (۲۴) مصمتے اور بیس (۲۰) مصوتے ہیں [۴۶]۔کچھ کا خیال ہے کہ انگریزی میں اٹھارہ (۱۸) مصوتے ہیں [۴۷]۔پچھلے صفحات میں ہم نے دیکھا کہ اردو میں دس (۱۰) مصوتے ہیں اور اس تعداد میں بھی کچھ اختلاف ہے۔

یہاں جس نکتے پر زور دینا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ،صوتیوں کی تعداد میں اختلاف سے قطع نظر، ہماری زبان میں (اور انگریزی میں بھی) صوتیوں (مصمتوں اور مصوتوں) کی تعداد حروفِ تہجی کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے اور اسی سے یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ چند مخصوص حروف بہت سے مختلف صوتیوں کی علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔مثلاً انگریزی کے تمام مصوتے انھی پانچ حروف (اے، ای، آئی، او، یو) کی مدد سے واضح کیے جاتے ہیں۔لیکن انگریزی میں مصوتے صرف پانچ نہیں ہیں۔یہ اور بات ہے کہ اسکول کے بچوں کو سمجھانے کے لیے مصوتوں کی تعداد پانچ ہی بتائی جاتی ہے۔جس طرح ہمارے ہاں بعض استاد چھوٹی کلاسوں کے بچوں کو اردو کے تین مصوتے (ا۔و۔ی) بتا دیتے ہیں اور ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اردو کے مصوتوں کو بعض مصنفین ''حروفِ علت'' قرار دیتے ہیں ۔ یہ اصطلاح ہی غلط ہے کیونکہ آواز اور حرف دو مختلف چیزیں ہیں۔اسی طرح اردو میں مصمتوں کو حروفِ صحیح یا حروفِ صحیحہ کہا جاتا ہے۔یہ بھی غلط فہمی پیدا کرنے والی اصطلاح ہے۔اگر ہم اپنے طالب علموں کے دماغ میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں کہ حرف اور صوت دو الگ الگ تصورات ہیں تو ہمیں ''حروف صحیح'' اور ''حروفِ علت'' جیسی فرسودہ اور گمراہ کن اصطلاحات کو ترک کر دینا چاہیے۔

اردو رسم الخط میں بھی اس طرح کے بعض مسائل ہیں جو انگریزی میں ہیں۔ اردو کے مصوتوں کو تحریر میں ظاہر کرنے کے لیے زیر، زبر، پیش اور مد کے علاوہ واو (و) اور ی/ے مستعمل ہیں۔ لیکن گڑ بڑ اس وقت ہوتی ہے جب صوتیوں اور صوتیات کی بات کرتے ہوئے زبان کی تحریری شکل یا الفاظ کی لکھی ہوئی صورت کو ذہن میں رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اردو حروف میں اگر انگریزی کے حرف ''اوٗ'' (o) کی آواز کو ظاہر کرنا ہے تو اس میں ایک الف اور ایک واو (او) لکھنا ہوگا (گویا الف اور واو کو صوتیہ سمجھنے والوں کے حساب سے تو یہاں دو صوتیے آگئے ہیں، اور یہ دہرا مصوتہ (diphthong) ہے مگر ایسا نہیں ہے اور یہ ایک ہی صوتیہ ہے) لیکن انگریزی میں صرف ایک حرف یعنی "o" سے کام چل جائے گا۔

اسی طرح اردو میں ''ای'' ایک مصوتہ ہے لیکن اس کی آواز کو ظاہر کرنے کے لیے اردو رسم الخط میں دو حروف (الف اور ی) لکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن ''ای'' ایک ہی مصوتہ ہے اور الف اور ''ی'' کی لکھی ہوئی شکل بذاتِ خود مصوتہ ہرگز نہیں ہے (''ای'' کی ''آواز'' مصوتہ ہے)۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ واو (حرف ''وٗ'') کی اردو رسم الخط میں دہری حیثیت ہے۔ جب ہم اردو حروف میں ''اوٗ'' (o) کی آواز کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس میں الف کے بعد واو لکھنا ہوتا ہے۔ لیکن جب ''وفا'' اور ''وہاں'' جیسے الفاظ میں واو (و) لکھا جاتا ہے تو وہ مصوتے (vowel) کی نہیں بلکہ مصمتے (conconant) کی آواز دیتا ہے۔ واو (و) کی آواز کو (جو مصمتہ ہے) انگریزی کے حروفِ تہجی میں وی (v) سے ظاہر کیا جاتا ہے اور اس وقت وہ ایک لب دندانی (labiodental) مصمتہ (consonant) ہوتا ہے کیونکہ اس کی تلفیظ میں اوپر کے دانت نیچے کے ہونٹ سے ٹکراتے ہیں اور اس طرح یہ مصمتہ بن جاتا ہے۔ کچھ لوگ ''وقار'' جیسے الفاظ کو انگریزی حروف میں لکھتے وقت اس میں وی (v) کی جگہ ڈبلیو (w) لکھتے ہیں جو بالکل غلط ہے کیونکہ انگریزی میں ڈبلیو (w) مصمتے کی نہیں بلکہ نیم مصوتے (semi-vowel) کی آواز دیتا ہے، مثلاً ''ونڈوٗ'' (window) (یا اس جیسے بعض دیگر الفاظ جن کی ابتدا میں ڈبلیو ہے) بولتے وقت انگریزی کے اہل زبان اوپر کے دانتوں کو نیچے کے ہونٹ سے ملانے کی بجائے ہونٹوں کو گول رکھ

کر ''ونڈو'' کا تلفظ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ مصمتہ نہیں رہتا بلکہ نیم مصوتہ بن جاتا ہے اور یہی انگریزی کا درست تلفظ ہے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اردو کے بعض الفاظ مثلاً ''وفا'' اور ''واحد'' کو انگریزی حروفِ تہجی میں لکھ کر دیکھا جائے یا انھیں صوتیاتی حروفِ تہجی (IPA) میں لکھا جائے تو ان میں وی (v) لکھا جائے گا ڈبلیو (w) نہیں اور اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ واو یہاں مصوتے کے طور پر نہیں بلکہ مصمتے کے طور پر آیا ہے۔ صوت رکنی تحریر میں ''وْ'' کو سی (c) سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

☆ اردو کا نیم مصوتہ

اسی طرح اردو میں ایک نیم مصوتہ یعنی آدھا مصوتہ یا semi-vowel بھی موجود ہے۔ یہ ''ی'' کی وہ آواز ہے جو اپنے سے پہلے آنے والی آواز کے ساتھ اس طرح مل کر نکلتی ہے کہ دونوں آوازیں ضم ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال پیار، پیاز، کیوں اور کیا (What کے معنی میں) جیسے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ میں ''ی'' سے پہلے والے حرف پر ''زیر'' نہیں ہے اور صحیح تلفظ ''پِ یار'' نہیں ہے بلکہ ''پیار'' اس طرح بولا جاتا ہے کہ پ اور ی کی ایک مخلوط یا ملی جلی آواز سنائی دیتی ہے اور اسی لیے معیاری لغات میں (مثلاً اردو لغت بورڈ کی لغت اور فرہنگِ تلفظ میں) اس آواز کو ''یاے مخلوط'' کا نام دیا جاتا ہے۔ البتہ یاد رہے کہ ''کِیا'' (did کے معنی میں) اور ''جِیالا'' جیسے الفاظ میں یاے مخلوط نہیں ہے اور ان الفاظ میں پہلے حرف کے نیچے زیر ہے۔ ڈیوڈ کرسٹل نے نیم مصوتے کی یہ تعریف دی ہے: ''نیم مصوتہ وہ آواز ہوتی ہے جو کسی صوت رکنی کے سرے پر مصمتے کی طرح کام کرتی ہے لیکن اس میں مصمتے کی وہ صوتیاتی خصوصیت (مثلاً تنگی سے تلفیظ ہونا) نہیں ہوتی جو مصمتے کے لیے عام طور پر ضروری ہوتی ہے بلکہ اس کی صوتیاتی خاصیت مصوتے کی طرح ہوتی ہے (یعنی اس کی تلفیظ میں صوتی راستے میں تنگی نہیں ہوتی) اگرچہ اس کا دورانیہ مصوتے سے مختصر ہوتا ہے اور اسی لیے اس طرح کی آوازوں کو بعض اوقات نیم مصوتہ کہنے کی بجائے اس کے لیے ''نیم مصمتہ'' کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے[۴۸]۔

حواشی

۱۔ صوت رکن (سلیبل) پر راقم اپنی کتاب ''لسانیاتی مباحث'' (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۵ء، اشاعتِ ثانی ۲۰۱۹ء) میں کچھ عرض کر چکا ہے۔ یہاں اس کتاب سے بعض مباحث مع حوالہ جات پیش کیے گئے ہیں۔

۲۔ گیان چند، عام لسانیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص ۱۲۹۔

۳۔ عبدالسلام، عمومی لسانیات (کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء)، ص ۳۲۔

۴۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر (Victoria Fromkin and others)، An introduction to language ، (میلبرن (آسٹریلیا): نیلسن تھامسن لرننگ پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۱ [پانچواں ایڈیشن]۔

۵۔ بحوالہ چارلس ای کینز و دیگر (مدیران) (Charles E. Cairns)، تعارف، Handbook of the syllable، (لیڈن: برل، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۔

۶۔ گیان چند، محولہ بالا، ص ۱۲۹۔

۷۔ گیان چند، ایضاً۔

۸۔ چارلس ای کیرنز، محولہ بالا، ص ۱۔

۹۔ بحوالہ ایضاً۔

۱۰۔ منجاری اوہالا (Manjari Ohala)، Syllable in Hindi مشمولہ The syllable: views and facts مرتبہ Harry Van dar Hulst و دیگر، (برلن: Mouton de Gruyter، ۱۹۹۹ء)، ص ۹۳۔

۱۱۔ وکٹوریا فرامکن، محولہ بالا، ص ۲۸۳۔

۱۲۔ عبدالسلام، محولہ بالا، ص ۳۸۔

۱۳۔ اوکسفرڈ کنسائز انگلش ڈکشنری، گیارھواں ایڈیشن، ۲۰۰۶ء۔

۱۴۔ گیان چند، ص ۱۳۰۔

۱۵۔ اردو ساخت کے بنیادی عناصر (دہلی: اردو محل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۲۰۔۱۱۷

۱۶۔ عمومی لسانیات، محولۂ بالا، ص ۴۲۔

۱۷۔ اس کا حوالہ کئی مآخذات میں موجود ہے مثلاً: اقتدار حسین خاں، صوتیات اور فونیمیات (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۴ء)، ص ۸۷۔

۱۸۔ نصیر احمد خان، اردو ساخت کے بنیادی عناصر، محولۂ بالا، ص ۱۲۷۔

۱۹۔ ایضاً۔
۲۰۔ اس طرح کے اردو الفاظ اور اردو کے صوت رکنوں کی ساخت سے متعلق مزید مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو: مسعود حسین خان، اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ (مترجم مرزا خلیل احمد بیگ)، علی گڑھ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۱؛ نیز عبدالسلام، محولہ بالا، ص ۳۸؛ نصیر احمد خان، محولہ بالا، ص ۱۱۷۔
۲۱۔ مسعود حسین خان (مقالاتِ مسعود، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء)، ص ۲۰۔۲۱
۲۲۔ ایضاً۔
۲۳۔ ایضاً، ص ۲۷۔
۲۴۔ عبدالسلام، محولہ بالا، ص ۴۲۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۴۰۔
۲۶۔ سکونِ اول کا مسئلہ (اسکول کے الف کی تحقیق) مشمولہ سہ ماہی اردو نامہ، کراچی، شمارہ ۱۴، اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۶۳ء، ص ۴۶ و بعدہٗ۔
۲۷۔ ایضاً۔
۲۸۔ ایضاً۔
۲۹۔ ایضاً۔
۳۰۔ انتخابِ کلام: اکبرالٰہ آبادی (مرتبہ رؤف پاریکھ)، (کراچی: اوکسفرڈ: ۲۰۰۹ء)، ص ۱۳۱
۳۱۔ ایضاً، ص ۲۸۔
۳۲۔ اس بستی کے اک کوچے میں (لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۴۵ [طبع سوم]
۳۳۔ عنایتیں کیا کیا (لاہور: مشورات، سن ندارد)، ص ۲۴۷۔
۳۴۔ گریگ بروکس (Greg Brooks)، Dictionary of the British Spelling System (کیمبرج: اوپن بک پبلشرز، ۲۰۱۵ء)، ص ۹۔
۳۵۔ وکٹوریا فرامکن، An Introduction to Language، محولۂ بالا، ص ۲۰۸۔
۳۶۔ ایضاً؛ نیز ماریو پی (Mario Pei)، The Story of Language (نیو یارک: نیو امریکن لائبریری، ۱۹۶۶ء)، ص ۳۲۰۔
۳۷۔ ایان میک (Ian R.A. Mackay)، Phonetics: The Science of Speech Production، (آسٹن: پرو ایڈ، ۱۹۸۷ء)، ص ۵۴ [دوسرا ایڈیشن]۔
۳۸۔ ایضاً۔
۳۹۔ ایضاً۔

۴۰۔ ایضاً؛ نیز انٹرنیشنل فونیٹک ایسوسی ایشن (International Phonetic Association)، A Handbook of International Phonetic Association: a guide to the use of International Phonetic Alphabet، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء)، ص۳۔

۴۱۔ اردو اور فارسی میں نقل حرفی (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء)۔

۴۲۔ انٹرنیشنل فونیٹک ایسوسی ایشن (International Phonetic Association)، A Handbook of International Phonetic Association: a guide to ...، محولۂ بالا، ص۳۔

۴۳۔ ایضاً۔

۴۴۔ A Handbook of International Phonetic Association، محولۂ بالا، ص۳۔

۴۵۔ ایضاً۔

۴۶۔ گریگ بروکس (Greg Brooks)، Dictionary of the British Spelling System، محولۂ بالا، ص۱۴۔

۴۷۔ ایان میک (Ian R.A. Mackay)، Phonetics: The Science of Speech Production، محولۂ بالا، ص۸۰۔۷۶

۴۸۔ The Penguin Dictionary of Languaage، (لندن: پینگون بکس، ۱۹۹۹ء)، ص۳۰۲ [دوسرا ایڈیشن]۔

گیارھواں باب: سماجی لسانیات (۱)

زبان اور معاشرہ

تاریخ میں بعض ایسے عجیب واقعات بھی ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان بھی کیا چیز ہے، یہ شناخت کی وجہ تو بنتی ہے لیکن بعض حالات میں اسی زبان اور شناخت کی وجہ سے جان بھی جا سکتی ہے۔

☆ زبان اور شناخت

عبرانی بائبل میں ایک واقعہ مرقوم ہے جو زبان اور شناخت سے متعلق ہے۔ یہ دو قبیلوں کا قصہ ہے جن میں سے ایک جلعاد (Gilead) (اسے گیلاداور گیلعاد بھی لکھتے ہیں) کہلاتا تھا اور دوسرے قبیلے کا نام افرائیم (Ephraim) تھا (ان قبیلوں کی تاریخ، ناموں کے اشتقاق اور مفاہیم پر اختلاف ہیں جن کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہیں ہے)۔ تیرھویں اور گیارھویں صدی قبل مسیح میں افرائیمیوں (Ephraimites) نے جلعادیوں (Gileadites) پر حملہ کیا لیکن افرائیمیوں کو شکست ہوئی۔ باقی ماندہ افرائیمی افراد نے دریائے اردن عبور کر کے اپنے وطن واپس جانے کی کوشش کی لیکن جلعادیوں نے واپسی کے راستوں پر پہرہ لگا دیا تھا تاکہ افرائیمیوں کو شناخت کر کے قتل کیا جا سکے۔ جب افرائیمیوں سے پوچھا جاتا کہ کیا وہ افرائیمی ہیں تو وہ انکار کرتے۔ اس پر ان سے کہا جاتا کہ بولو ''شیبولیتھ''۔ لیکن وہ ''ش'' کی آواز کا درست تلفظ نہیں کر سکتے تھے اور ''سیبولیتھ'' (یعنی ''ش'' کی بجائے ''س'' سے) بولتے تھے جس پر انھیں قتل کر دیا جاتا تھا[۱]۔

جس چیز نے افرائیمی قبیلے کا راز فاش کیا وہ ان کا علاقائی تلفظ تھا اور اسی قصے کے نتیجے

میں انگریزی زبان میں ایک لفظ شیبولیتھ (shibboleth) داخل ہوگیا۔ اس لفظ کی اصل عبرانی ہے اور اس کا مفہوم اصل میں تو ''غلّے کے پودے کی بالی'' یا ''بہتا چشمہ'' تھا لیکن دورِ جدید میں انگریزی میں اس کا مفہوم ہوگیا: ''ممتاز کرنے والا کوئی نشان'' یا ''کوئی معیار''[۲]۔ اب شیبولیتھ کا مفہوم انگریزی میں کچھ اور بھی ہے، مثلاً: کوئی لفظ یا آواز جسے کوئی غیر ملکی ادا نہ کر سکے اور اسی سے دوسرا مفہوم بن گیا یعنی تلفظ یا لہجے کا خاص انداز؛ نیز کوئی رسم یا عادت جس سے کسی خاص گروہ کو پہچانا جائے[۳]۔

کچھ اسی طرح کا ایک واقعہ ہندوستان میں بھی پیش آیا جس کا ذکر حافظ محمود شیرانی نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ فیروز شاہ خلجی کے بعد ناصرالدین محمود نے مشرقی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے افراد کو سیاسی معاملات میں مداخلت سے باز رکھنے کے لیے انھیں دہلی سے نکل جانے کا حکم دیا لیکن ان میں سے کچھ لوگوں نے خود کو دہلی کا باشندہ ظاہر کیا تو ان کی شناخت کے لیے ان سے ''کھڑا کھڑی'' بُلوایا گیا (جو مشرقی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے لوگ آسانی سے نہیں بول سکتے تھے) اور ان میں سے جو نہ بول سکا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا[۴]۔

لسان یعنی زبان اور سماج یعنی معاشرے کا کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ انسانی معاشروں میں باہمی ابلاغ و ترسیلِ خیالات کے لیے زبان اہم ترین ذریعہ تو ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ زبان کے ذریعے انسان دوسروں تک اپنے خیالات اور احساسات ہی نہیں پہنچاتا بلکہ جو زبان وہ بولتا ہے اور جس انداز میں وہ کوئی زبان بولتا ہے اس کے ذریعے وہ اپنے بارے میں اور بھی بہت سی معلومات دوسروں تک نادانستہ طور پر پہنچا دیتا ہے جو اس کی اور اس کے علاقے کی شناخت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہم کون ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں اور ہمارا ذریعۂ معاش کیا ہے، اس کا اچھا خاصا سراغ ہماری گفتگو سے بھی مل سکتا ہے۔ گویا زبان سماجی پس منظر کو بھی آشکار کرتی ہے۔

ہر زبان آہستہ آہستہ اور غیر محسوس انداز میں بدلتی رہتی ہے اور ایک ہی زبان مختلف علاقوں اور طبقوں میں تھوڑے تھوڑے فرق اور اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ یہ فرق اپنے

بولنے والوں اور ان کے سماجی پس منظر کے بارے میں بھی بہت کچھ بتاتا ہے۔ اسی سماجی پس منظر اور زبان کے باہمی تعلق کو سمجھنا سماجی لسانیات کا کام ہے۔

☆ سماجی لسانیات: تعریف اور تعارف

سماجی لسانیات یا سوشیو لنگ وِسٹکس (sociolinguistics) لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ سوشیو لنگ وسٹکس (sciolinguistics) کی اصطلاح سب سے پہلے کیمبرج کے ماہر علم بشریات طامس ہوڈسن (Thomas Hodson) نے ۱۹۳۹ء میں متعارف کرائی[۵]۔ اگرچہ اس سے پہلے اس کا وجود تھا اور سماجی لسانیات کے ضمن میں باقاعدہ علمی مطالعات آغاز انیسویں صدی میں ہو چکا تھا[۶]۔

سماجی لسانیات سماج (یعنی معاشرے یا سوسائٹی society) اور لسان (یعنی زبان) کے تعلق کا مطالعہ کرتی ہے۔ سماجی لسانیات کی باقاعدہ تعریف کی جائے تو کچھ اس طرح کی ہوگی:

> "The scientific study of relationship(s) between language and society."[۷]

اس کا مفہوم کچھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ زبان اور سماج کے درمیان تعلق یا تعلقات کا سائنسی مطالعہ سماجی لسانیات ہے۔

لیکن یہ بھی کہا گیا کہ سماجی لسانیات کے نفسِ مضمون (subject matter) کو دیکھا جائے تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سماجی لسانیات بذاتِ خود کوئی علم یا شعبۂ علم نہیں ہے بلکہ بین العلومی (interdiscipilinary) تحقیق ہے[۸]۔ بعض ماہرین نے کہا کہ سماجی لسانیات اپنے پیش رو علمی تحقیقی میدانوں مثلاً نسلی لسانیات (ethnolingusitics) اور نفسیاتی لسانیات (psycholinguistics) کی طرح ہے جس کے ماہرین دوسرے شعبوں کے ماہرین مثلاً ماہرینِ نسلیات (ethnlogists)، ماہرینِ نفسیات (psychologists) اور ماہرینِ سماجیات (یا عُمرانیات) (sociologists) سے علمی تعاون کرتے ہیں[۹]۔

یہ دوسری تعریف نسبۃً وسیع ہے۔ اس وسیع تر تعریف کی وجہ یہ ہے کہ سماجی لسانیات کا

دائرہ سماج ہی کی طرح رنگارنگ ہے۔ اس میں سماج اور زبان کے باہمی تعلق کا مطالعہ جن عوامل کی مدد سے کیا جاتا ہے وہ خاصے متنوع ہیں اور ان عوامل میں علاقائی و جغرافیائی ماحول، معاشی طبقات، پیشے اور مشاغل، دولسانیت (bilingualism) اور کثیر لسانیت (multilingualism) بھی شامل ہیں۔ بلکہ سماجی لسانیات کے مطالعات کے دائرے میں برادریاں یا فرقے، مقامات (گھر، دفاتر، ادارے وغیرہ)، نسلی تفاوت اور نسلی شناخت کے مسائل، معاشی حالات، صنفی تفاوت (یعنی جنس یا gender کا فرق)، لسانی شناخت کے مسائل اور زبان پر تعلیم کے اثرات بھی شامل ہیں[۱۰]۔ گویا یہ دائرہ خاصا وسیع ہے اور سماج کے کئی شعبوں اور عوامل پر محیط ہے۔ چونکہ سماجی عوامل کی وجہ سے زبان میں ہونے والی تبدیلیاں بھی سماجی لسانیات کا حصہ ہیں اور چونکہ زبان وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے لہٰذا نہ صرف سماجی عوامل کی وجہ سے زبان میں وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیاں سماجی لسانیات کے دائرے میں داخل ہیں بلکہ گفتگو کا انفرادی انداز، زبان میں ذاتی پسند و ناپسند، کثیر لسانی معاشرے کے لسانی مسائل اور نسلیات کے موضوعات بھی سماجی لسانیات کے مطالعات کا حصہ ہیں[۱۱]۔

مختصراً یہ کہ سماجی لسانیات کا دائرہ خاصا وسیع ہے اور یہ اپنے مطالعے کے لیے یقیناً متعدد علوم سے مدد حاصل کرتی ہے۔ ان علوم میں تاریخی سماجی لسانیات (hisotrical sociolinguistics) بھی شامل ہے جو نسبتہً ایک نیا شعبہ ہے اور جسے پہلے سماجی تاریخی لسانیات (socio-historical linguistcs) بھی کہتے تھے[۱۲]۔ تاریخی سماجی لسانیات دراصل لسانیات کی وہ شاخ ہے جو زبان اور معاشرے کے تعلق کا جائزہ تاریخی تناظر میں لیتی ہے اور اس کام میں صرف لسانیات پر انحصار کرنے کی بجائے سماجی عوامل کے زبان پر اثرات کا ماضی میں جاکر تجزیہ کرتی ہے اور اس کے لیے قدیم لسانی مواد کا مطالعہ کرتی ہے[۱۳]۔ تاریخی سماجی لسانیات گویا تین علوم کا اجتماع ہے یعنی تاریخ، سماجیات اور لسانیات۔ بلکہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ سماجی علوم اور لسانیات کے بعض اجزا باہم ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں یا مشترک ہیں اور اسی سے ان علوم کی ذیلی شاخیں بنتی ہیں، مثلاً سماجی لسانیات، زبان کی سماجیات اور بشریاتی

لسانیات (Anthropological Linguistics) ہے۔[14]

☆ سماجی لسانیات اور زبان کی سماجیات

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ سماجی لسانیات اور زبان کی سماجیات (sociology of language) دو الگ موضوعات ہیں اگرچہ دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ سماجی لسانیات تو یہ دیکھتی ہے کہ سماج اور طبقات کا زبان پر کیا اثر پڑتا ہے، مثلاً خواتین کی زبان مردوں کی زبان سے ذرا سی مختلف ہوتی ہے، پڑھے لکھے لوگوں کی زبان اَن پڑھوں سے الگ ہوتی ہے۔ یہ سماج ہے جو زبان پر اثر ڈال رہا ہے۔ یعنی ہماری سوچ، معاشرے اور ماحول کا ہماری زبان پر جو اثر پڑتا ہے سماجی لسانیات اس کا مطالعہ کرتی ہے۔ سماجی لسانیات سماج کو لسانیات اور زبان کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے[15]۔ یہ افراد اور معاشرے کے زبان پر پڑنے والے اثرات کو جانچتی ہے۔

اس کے برعکس زبان کی سماجیات یہ دیکھتی ہے کہ زبان کا معاشرے اور افراد پر کیا اثر پڑتا ہے۔ کس طرح ایک خاص زبان بولنے والے ایک خاص انداز میں سوچتے ہیں، ہماری زبان سے ہماری سوچ اور ذہنیت کس طرح متاثر ہو جاتی ہے۔ زبان کی سماجیات، زبان کو سماجیات کے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے[16]۔

چیک زبان کی ایک کہاوت ہے: نئی زبان سیکھو اور نئی روح پاؤ[17]۔ مراد یہ کہ ہم جو زبان بولتے ہیں اس میں اور ہمارے محسوسات اور اور دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کے انداز میں گہرا تعلق ہوتا ہے کیونکہ ہر زبان کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جو ہماری نفسیات کا حصہ بن جاتی ہیں۔ معروف فلسفی وٹجنسٹن (Wittgenstein) نے کہا تھا کہ میری زبان کی حد ہی میری دنیا کی حد ہے[18]۔ گویا ہماری زبان کی وسعتیں یا محدودات ہماری سوچ کی وسعتوں یا محدودات کو طے کرتی ہیں۔

☆ ترجمہ، لسانی جبریت اور لسانی اضافیت

زبان اور سوچ کے باہمی تعلق کے ضمن میں ایک معروف نظریہ سپیر اور ہورف کا نظریہ

(Sapir-Whorf hypothesis) کہلاتا ہے۔ یہ امریکی ماہرِ لسانیات ایڈورڈ سپیر (Edward Sapir) اور اس کے شاگرد بنجمن لی ہورف (Benjamin Lee Whorf) کے نام پر ہے۔ اس نظریے کے دو پہلو ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ ہماری زبان اور ہمارا ذخیرۂ الفاظ یہ طے کرتے ہیں کہ ہم کس طرح سوچیں گے، اسے لسانی جبریت (linguistic determinism) کہتے ہیں۔

۲۔ اسی سے دوسرا پہلو نکلا کہ کسی زبان کی خلقی امتیازی خصوصیات کسی دوسری زبان میں نہیں پائی جاتیں، اسے لسانی اضافیت (inguistic relativity) کہتے ہیں[۱۹]۔

اس نظریے سے اختلاف بھی کیا گیا ہے، مثلاً اس کے دوسرے حصے (لسانی اضافیت یعنی کسی زبان کی خصوصیات دوسری زبان میں نہیں ہوسکتیں) کو درست تسلیم کرلیا جائے تو کسی ایک زبان کے متن کا مکمل اور درست ترجمہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے۔ لیکن بہت سے کامیاب تراجم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ درست ترجمہ ممکن ہے، خاص طور پر آپس میں قریبی تعلق رکھنے والی زبانوں میں ترجمہ نسبتۂ آسان ہوتا ہے مثلاً جرمن اور انگریزی یا اردو اور فارسی میں ایک دوسرے کے تراجم اس طرح ہوسکتے ہیں کہ ایک زبان کی امتیازی خصوصیات بڑی حد تک دوسری تک منتقل ہوسکیں۔ البتہ اس نظریے کے پہلے حصے (لسانی جبریت) یعنی اس بات میں صداقت ہے کہ ایک زبان کے بولنے والوں کے بعض تصورات دوسری زبان بولنے والوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور اس بات کے واضح ثبوت بھی موجود ہیں کہ زبان ہمارے سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے اور ذہنی کام انجام دینے کی صلاحیت پر اثر انداز ہوتی ہے[۲۰]۔ زبان کا استعمال کس طرح ہماری سوچ پر اثر انداز ہوتا ہے اور کس طرح کسی خاص لفظ یا فقرے کے اثر سے ہم حقیقت کا کسی اور طرح سے ادراک کرتے ہیں اس کا مطالعہ ہورف نے کیا تھا اور اس نے اس موضوع پر تحقیق بھی کی[۲۱]۔

معروف ماہر لسانیات آر ایل ٹراسک (R.L.Trask) نے اس کی خاصی مثالیں دی ہیں کہ کس طرح وسیع اور متنوع ذخیرۂ الفاظ رکھنے والے افراد دنیا کو مختلف نظر سے دیکھتے اور سمجھتے

ہیں اور ان کا ادراک اور احساس دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔اس ضمن میں اس نے بعض اقوام کی زبانوں میں رنگوں یا جیومیٹری کی شکلوں کو بیان کرنے کے لیے پائے جانے والے الفاظ کی مثالیں دی ہیں[۲۲] جس کی تفصیل یہاں دینا باعثِ طوالت ہوگا۔لیکن یاد رہے کہ بعض ماہرین کے نزدیک، سپیر اور ہورف کا یہ نظریہ متنازع ہے[۲۳]۔بہرحال، یہ نظریہ کہ زبان ہماری سوچ پر اثر انداز ہوتی ہے اور ہمارے احساس اور ادراک کو بدل سکتی ہے، زبان کی سماجیات کا موضوع ہے۔

☆ لسانی فرق (language variation)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص جب اپنے علاقے سے خاصا دور نکل کر کسی ایسے اجنبی علاقے میں جاتا ہے جہاں اس کی مادری زبان ہی بولی جاتی ہے تو اس کی گفتگو سن کر اکثر وہاں کے لوگ پوچھتے ہیں کہ کس گاؤں کے رہنے والے ہو؟ کیونکہ انھیں اس شخص کی زبان کچھ الگ سی محسوس ہوتی ہے۔ممکن ہے کوئی یہ سوال نہ کرے لیکن اس شخص کو خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس اجنبی علاقے کے لوگ وہی زبان بول رہے ہیں جو میری مادری زبان ہے اور جو میں اپنے علاقے میں بولتا ہوں مگر ان کی زبان اور میری زبان میں تھوڑا سا فرق ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک زبان ایک ہوتے ہوئے بھی دوسرے علاقے میں پہنچ کر تھوڑی سی مختلف ہو جاتی ہے۔زبان کی اس ذرا سی مختلف صورت یا اختلاف کو اصطلاحاً فرق (variation) کہتے ہیں۔لسانیات کی زبان میں اسے لسانی فرق (language variation) بھی کہا جاتا ہے[۲۴]۔

سماجی لسانیات کا ایک خاص موضوع ایک ہی زبان میں پیدا ہونے والا یہی فرق اور اختلاف بھی ہے اور اگر ایک ہی زبان مختلف علاقوں میں تھوڑے سے فرق سے بولی جائے (جیسا کہ اوپر کی مثال میں ہے) تو اسے علاقائی تحتی بولی یا ڈائیلکٹ (dialect) کہا جاتا ہے (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

☆ لسانی تغیر (language change)

سماجی لسانیات میں ایک اور اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے اور وہ ہے تغیر (change)۔

بظاہر لسانی فرق اور لسانی تغیر دونوں اصطلاحات ایک سی لگتی ہیں مگر دونوں کے مفہوم میں ذرا سا امتیاز کیا جاتا ہے۔ کسی زبان میں ''وقت'' کے ساتھ ساتھ (یہاں وقت پر زور دینا مقصود ہے) جو تغیر و تبدل ہوتا ہے اور ماضی اور حال کی زبان میں جو تبدیلی نظر آتی ہے اسے لسانیات کی زبان میں لسانی تغیر (language change) کہتے ہیں[۲۵]۔

یاد رہے کہ کسی ایک زمانے یا ایک وقت میں ایک ہی زبان کی مختلف علاقوں یا طبقوں میں بولی جانے والی مختلف صورت کو لسانی فرق (language variation) کہا جاتا ہے[۲۶]۔ گویا زبان میں جغرافیائی خطوں کے تعلق سے پیدا ہونے والی یک زمانی (synchronic) یعنی ایک ہی زمانے میں ہونے والی تبدیلی کو فرق (variation) کہتے ہیں اور کثیر زمانی (diachronic) یا وقت کے ساتھ یعنی تاریخی تبدیلی کو تغیر (change) کہا جاتا ہے۔

☆ تغیر اور فرق کی مثالیں

تغیر (change) اور فرق (variation) میں امتیاز کے لیے چند مثالیں پیش ہیں۔ کسی زبان مثلاً انگریزی میں لکھی ہوئی ہزار سال پرانی تحریر کسی انگریزی جاننے والے کے سامنے آج لائی جائے تو وہ اس کا بیشتر حصہ نہیں سمجھ پائے گا کیونکہ ہر زبان وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی سے ہم کنار ہوتی رہتی ہے اور جب خاصا وقت گزر جاتا ہے تو وہ اپنی قدیم یا ابتدائی صورت سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ یہ لسانی تغیر (language change) کی مثال ہے[۲۷]۔ اردو کا بھی یہی حال ہے، مثلاً آج ''مثنوی کدم راو پدم راو'' کو پڑھنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے، سمجھنا تو اور بھی مشکل ہے حالانکہ وہ اردو ہی کی کتاب ہے اور اسے لکھے ہوئے کوئی پونے چھ سو یا چھ سو برس ہی ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان بہت بدل گئی ہے اور اُس وقت کی زبان اور آج کی زبان میں بہت تغیر ہو گیا ہے۔ اِس تغیر (change) کا بیان بالعموم تاریخی لسانیات کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ یہ ذکر آگے تاریخی لسانیات کے باب میں آ رہا ہے۔

فرق (variation) کی مثال یہ ہے کہ ایک ہی دور میں ایک ہی زبان میں پائے

جانے والے فرق کو لسانی فرق (languagge variation) کہتے ہیں ،مثلاً سندھی کی مختلف علاقوں میں بولی جانے والی شکلوں (مثلاً سکھر کی سندھی اور تھر پارکر کی سندھی میں تھوڑا سا فرق ہے) یا انگریزی کی مختلف شکلوں (مثلاً انگلستان کے شمالی علاقوں اور جنوبی علاقوں کی انگریزی میں تھوڑا سا فرق ہے) کو فرق (variation) کہا جاتا ہے۔اسی طرح آج پنڈی کی پنجابی اور لاہور کی پنجابی میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ علاقائی یا جغرافیائی ہے اور اسی لیے یہ فرق (variation) کے ذیل میں آتا ہے۔لیکن بلھے شاہ کی پنجابی اور آج کی پنجابی میں جو اختلاف یا تبدیلی نظر آتی ہے وہ وقت کی وجہ سے ہے اور یہ تغیر (change) کے ذیل میں ہے۔

یوں کہہ لیجیے کہ زبان میں جو اختلاف اور فرق (variation) جغرافیائی خطوں اور سماجی طبقوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے وہی اختلاف یا فرق (variation) گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ لسانی تغیر (change) بن جاتا ہے۔گویا زبان میں ''تغیر'' (change) زمانی اور تاریخی ہوتا ہے اور ''فرق'' (variation) کی اصطلاح مکانی اور جغرافیائی فرق کو واضح کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

زبان میں تغیر (change) ہر لحاظ سے ہوتا ہے یعنی قواعد، الفاظ اور تلفظ کے لحاظ سے بھی۔البتہ یہ تلفظ اور ذخیرۂ الفاظ میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور بالعموم اسی کا مطالعہ زیادہ کیا جاتا ہے[۲۸]۔مثال کے طور پر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سندھی اور آج کی سندھی میں تغیر (change) ہے اور ہمارے بعض سندھی دوست بتاتے ہیں کہ ''شاہ جو رسالو'' کے بعض الفاظ کے معنی کو سمجھنا بعض اوقات بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

☆ لسانی فرق کی صورتیں

زبان میں فرق (variation) تین طرح سے ہوتا ہے: وقت، مقام اور طبقے کے لحاظ سے۔اور تینوں صورتیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں[۲۹]:

۱۔ وقت کے لحاظ سے ،جسے تغیر (change) کہتے ہیں۔ یہ ہوتا تو اختلاف یا فرق (variation) ہی ہے لیکن تاریخی ہوتا ہے یعنی فرق (variation) ایک ہی زبان کی

قدیم اور جدید شکل کے درمیان ہو تو تغیر (change) کہلاتا ہے۔ اس کا ذکر زیادہ تر تاریخی لسانیات کے ضمن میں ہوتا ہے۔

۲۔ مقام یا جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے، یہ اختلاف علاقے یا جغرافیہ کی بنیاد پر ہوتا ہے یعنی ایک ہی زمانے میں زبان کی تھوڑی سی مختلف شکل جو کسی اور جغرافیائی خطے یا علاقے (بالعموم ملحقہ علاقے) میں استعمال ہوتی ہے۔ گویا ایک ہی زبان مختلف علاقوں میں تھوڑی مختلف شکل میں اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ بولی جائے تو اس کو علاقائی تحتی بولی یا ریجنل ڈائیلکٹ (regional dialect) کہتے ہیں۔

۳۔ سماج یا طبقے کے لحاظ سے، یہ اختلاف سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان ہوتا ہے یعنی ایک ہی زمانے میں معاشرے میں کوئی خاص گروہ یا کوئی خاص طبقہ یا کسی خاص پیشے سے وابستہ افراد ایک ہی زبان کو مختلف انداز میں بولتے ہیں، اسے سماجی بولی یا سوشل ڈائیلکٹ (social dialect) کہتے ہیں۔

گویا زبان میں اختلاف یا فرق (variation) علاقے کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے اور سماجی طبقے کے لحاظ سے بھی۔ یہ استعمال کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے اور استعمال کرنے والے کے لحاظ سے بھی۔ یعنی یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ زبان کون بول رہا ہے، کس مقصد کے تحت اسے بول رہا ہے اور وہ کس علاقے میں بولی جا رہی ہے[۳۰]۔

☆ زبان کی نوع (variety)

زبان میں تھوڑے تھوڑے اختلاف اور فرق (variation) کی وجہ سے مختلف طبقات یا علاقوں میں ایک ہی زبان ایک ہی وقت میں مختلف شکلوں میں بولی جاتی ہے۔ زبان کی اس طرح کی الگ الگ شکلیں جزوی طور پر مختلف کیفیات رکھنے کے باوجود ایک بڑے گروہ کا حصہ ہوتی ہیں لیکن یہ شکلیں بہرحال اپنی کچھ امتیازی خصوصیات بھی رکھتی ہیں۔ ان میں سے زبان کی ہر شکل کو جو اس کی دوسری شکلوں سے الگ اور ممتاز ہو اصطلاحاً ویرائٹی (variety) یا ''نوع'' کہتے

ہیں [۴۱]۔ (اسے اردو میں تنوع کا نام بھی دیا گیا ہے)۔ چاہے شکلوں میں یہ فرق و امتیاز و اختلاف علاقائی ہو یا طبقاتی یہ بنیادی طور پر نوع (variety) شمار ہوگا۔ ویرائٹی یا ''نوع'' میں جغرافیائی شکلیں یا جغرافیائی اقسام بھی آجاتی ہیں اور طبقاتی اقسام بھی، مثلاً انگریزی زبان کی ایک شکل برطانوی انگریزی ہے اور دوسری شکل امریکی انگریزی ہے، یہ دونوں انگریزی کی ویرائٹی (vaiety) یا انواع یا اقسام ہیں [۴۲]۔ کھڑی بولی اور برج بھاشا اردو کی علاقائی تحتی بولیاں ہیں اور اردو کی قسم یا نوع یا ویرائٹی ہیں۔ اسی طرح کسی خاص طبقے میں بولی جانے والی کسی زبان کی خاص شکل، مثلاً دہلی کے کاری گروں میں رائج اردو زبان کی ایک خاص شکل جسے کرخنداری کہتے ہیں، اردو کی قسم یا نوع (variety) ہے۔ کچھ ماہرین ویرائٹی (variety) کی بجائے لیکٹ (lect) کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں [۴۳]۔ یہ وہی lect ہے جو dialect اور sociolect میں نظر آتا ہے (lect کے لفظی معنی ہیں بولنا اور یہ ذرا سے مختلف ہجوں کے ساتھ بعض انگریزی الفاظ میں نظر آتا ہے کیونکہ اس کی اصل یونانی ہے)۔

گویا قسم یا نوع یا ویرائٹی (variety) ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں زبان کی مختلف شکلیں شامل ہیں اور اس میں ایک زبان کی علاقائی بولیاں یا ڈائیلکٹ (dialect) بھی آجاتے ہیں اور سماجی بولیاں (مثلاً سلینگ) بھی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ڈائیلکٹ کیا ہے۔

☆ بولی یا ڈائیلکٹ (dialect)

اسے اردو میں بولی اور تحتی بولی بھی کہتے ہیں۔ بولی یا ڈائیلکٹ کی تعریف کئی کتابوں میں موجود ہے، ان میں سے ایک یہ ہے:

> "Dialects are mutually intelligible forms of a language that differ in systemic ways" [۴۴]

اس کا مفہوم کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ڈائیلکٹ کسی زبان کی ایسی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جو منظم طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں لیکن باہمی طور پر قابلِ تفہیم ہوتی ہیں۔

اس کی وضاحت میں تین نکات پیش کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ ڈائیلکٹ ایک ہی زبان کی مختلف شکلیں یا انواع (varieties) ہوتی ہیں۔یعنی ایک ہی زبان مختلف جغرافیائی علاقوں یا سماجی طبقوں میں تھوڑے تھوڑے فرق اور اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہے اور ان میں سے ہر ایک اس زبان کا ڈائیلکٹ ہوتا ہے۔

۲۔ ڈائیلکٹ باہم مختلف ہوتے ہیں لیکن ایک خاص طریقے یا نظام کے تحت مختلف ہوتے ہیں۔''خاص طریقے یا نظام'' یا ''منظّم طور پر'' سے مراد یہ ہے کہ ڈائیلکٹوں کا باہمی اختلاف الل ٹپ نہیں ہوتا بلکہ اس اختلاف کو واضح طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔یہ فرق صوتیاتی بھی ہوسکتا ہے، قواعدی (صرفی ونحوی) بھی اور معنیاتی بھی۔یعنی ایک ہی زبان کے مختلف ڈائیلکٹوں میں بعض الفاظ کا تلفظ، ان کا مفہوم اور ان کی قواعدی حیثیت یا صرفی ونحوی استعمال مختلف ہوسکتا ہے[۳۵]۔مثال کے طور پر اردو میں بلبل مذکر بھی ہے مونث بھی۔گیان چند نے لفظ'' بُوا'' کی مثال دی ہے کہ بھوپال کی اردو میں لفظ بوا خادمہ کے معنی میں آتا ہے لیکن یوپی کے بعض ہندو بوا باپ کی بہن کو کہتے ہیں جبکہ بعض مسلمان خواتین برابر والیوں کو بوا کہہ کر مخاطب کرتی ہیں[۳۶]۔

۳۔ اس باہمی اختلاف اور فرق (variation) کے باوجود ایک ہی زبان کے مختلف ڈائیلکٹ (یا علاقائی تحتی بولی) بولنے والے آپس میں ایک دوسرے کی زبان سمجھ لیتے ہیں۔اوپر ہم نے جو مثال دی ہے کہ ایک شخص اپنے علاقے سے نکل کر دوسرے علاقے میں جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس دوسرے علاقے کی زبان اگرچہ میری مادری زبان ہی ہے لیکن اس میں تھوڑا سا فرق ہے تو گویا وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ میری ہی زبان کی مختلف شکل یا قسم یا نوع (variety) ہے (یعنی ڈائیلکٹ ہے) لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ وہ شخص اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی مادری زبان کی اس مختلف علاقائی شکل کو سمجھ سکے۔اگر دو ڈائیلکٹ آپس میں قابلِ تفہیم نہیں ہیں (یعنی ان کے بولنے والے آپس میں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ سکتے) تو وہ ایک ہی زبان کے دو ڈائیلکٹ

نہیں ہیں بلکہ دو الگ الگ زبانیں ہیں [۳۷]۔

☆ بولی یا ڈائیلکٹ کی قسمیں

ڈائیلکٹ یا بولی کی دو قسمیں ہیں، علاقائی اور سماجی۔

(ا) علاقائی تحتی بولی (regional dialect)

جب کوئی زبان تھوڑے سے فرق کے ساتھ کسی خاص علاقے یا جغرافیائی مقام پر بولی جائے تو وہ اس زبان کی علاقائی تحتی بولی یا ریجنل ڈائیلکٹ کہلاتی ہے [۳۸]۔ اگر اصطلاحات میں گفتگو کی جائے تو علاقائی تحتی بولی کسی زبان کی وہ قسم یا نوع (variety) ہوتی ہے جو کسی خاص علاقے میں بولی جائے اور بولنے والے کے علاقے کی اصلیت کا پتا دے [۳۹]۔

مثال کے طور پر لاہور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جانے والی زبان جو ماجھی کہلاتی ہے پنجابی کی علاقائی تحتی بولی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ پنجابی کا ماجھی ڈائیلکٹ ہے۔ پنجاب کے دیگر علاقوں میں تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ بولی جانے والی پنجابی دراصل پنجابی کی علاقائی تحتی بولیاں یا اس کے ریجنل ڈائیلکٹ ہیں [۴۰]۔

اس طرح کے ڈائیلکٹ دنیا کی ہر زبان میں ہوتے ہیں۔ زبان کا علاقہ جتنا وسیع ہوگا اس کی اتنی ہی زیادہ اور متنوع اقسام یا انواع (varieties) ہوں گی اور وہ سب اس کے ریجنل ڈائیلکٹ ہوں گے [۴۱]۔ بسا اوقات علاقائی تحتی بولیوں میں اتنا زیادہ فرق ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض کے ڈائیلکٹ ہونے یا نہ ہونے اور الگ زبان ہونے یا نہ ہونے پر سوالات اٹھ جاتے ہیں اور اچھے خاصے تنازع کا بھی باعث بن جاتے ہیں [۴۲]۔ پاکستان میں بھی چونکہ لسانی مسائل کو بھی سیاسی فوائد کی خاطر سیاسی مسائل بنا دیا گیا ہے لہٰذا بعض زبانوں/بولیوں کی حیثیت پر سوال اٹھ جاتے ہیں، مثلاً سرائیکی والے اپنی زبان کو الگ زبان قرار دیتے ہیں اور اس کی کئی علاقائی تحتی بولیوں کا وجود بھی ثابت کرتے ہیں۔ البتہ پنجابی کے بعض ماہرین سرائیکی کو پنجابی کا ڈائیلکٹ یا بولی قرار دیتے ہیں۔ جبکہ سندھی زبان کے بعض ماہر سرائیکی کو سندھی کی بولی یا ڈائیلکٹ قرار دیتے ہیں۔ ان مسائل پر سیاسیات کی بجائے لسانیات کے اصولوں کی بنیاد پر غور کرنا چاہیے۔

علاقائی تحتی بولی یعنی ریجنل ڈائیلکٹ کا تصور علاقے یا جغرافیہ یا زمینی فاصلے سے متعلق ہے، اسے مکانی تصور کہہ لیجیے۔

(۲) سماجی بولی (social dialect)

سماجی بولی یا سوشل ڈائیلکٹ، جسے سوشیولیکٹ (sociolect) بھی کہتے ہیں، کسی زبان کی وہ شکل یا نوع (varierty) ہوتی ہے جو کسی سماج کے کسی خاص طبقے میں بولی جاتی ہے[۴۳]۔

جس طرح علاقائی بولی اپنے بولنے والے کے علاقے کا پتا دیتی ہے اسی طرح سماجی بولی اپنے بولنے والے سے متعلق سماجی معلومات دیتی ہے یعنی یہ کہ بولنے والے کا تعلق کس معاشی طبقے سے ہے یا اس کی سماجی حیثیت کیا ہے، اس کا پیشہ کیا ہے، اس کا تعلیمی پس منظر کیا ہے، وغیرہ[۴۴]۔ اس کی ایک مثال اردو کی کرخنداری بولی ہے جو دہلی کے کارخانوں میں کام کرنے والوں نیز ہاتھ سے کام کرنے والے دیگر پیشہ وروں کی بولی ہے[۴۵]۔ یہ ایک طرح کی سماجی بولی یا سوشل ڈائیلکٹ ہے جو دہلی شہر کے بعض مخصوص علاقوں میں کاری گر اور دیگر محنت کش بولتے ہیں[۴۶]۔

سماجی بولی یا سوشل ڈائیلکٹ کا تصور طبقے، سماج، جنس، تعلیم، عمر سے متعلق ہے۔ نئی نسل اور پرانی نسل کی زبان ایک ہوتے ہوئے بھی تھوڑی سی الگ ہوتی ہے۔ مردوں اور عورتوں کی زبان میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح غریب طبقے اور امیر طبقے کی زبان تھوڑی سی مختلف ہوتی ہے۔ سماج کے مختلف طبقات میں جو فرق مختلف حالات و اسباب کی بنا پر ہوتا ہے وہ ان طبقات کی زبان میں بھی جھلکتا ہے گو وہ ایک ہی زبان (مثلاً اردو یا انگریزی یا پنجابی) بولتے ہوں۔

☆ معیاری زبان اور ڈائیلکٹ

زبان کی ایک نوع (variety) وہ ہوتی ہے جو معیاری زبان (standard language) کہلاتی ہے۔ یہ کسی زبان کی وہ نوع یا ویرائٹی ہوتی ہے جو اس زبان کے بولنے والوں کے درمیان دوسری انواع (varieties) (مثلاً مختلف ڈائیلکٹوں) کے مقابلے میں ''درست'' تسلیم کی جاتی ہے اور جسے تحریر، ذرائع ابلاغ اور تدریس میں ترجیح دی جاتی ہے[۴۷]۔

معیاری زبان کے بارے میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان ہوتی ہے [۴۸]۔ اگر چہ ہر زبان ڈائیلکٹوں کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زبان کوئی طے شدہ نظام ہے جو بذاتِ خود ایک معیار ہے اور جس میں سے ڈائیلکٹ نکلے ہیں لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے [۴۹]۔ لسانیاتی طور زبان اور ڈائیلکٹ میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا [۵۰]۔

ایک عام تاثر یہ ہے کہ ڈائیلکٹ کوئی کم تر چیز ہوتی ہے اور زبان کی جو معیاری شکل یا نوع (standard) ہوتی ہے وہی قابلِ اعتنا ہوتی ہے۔ یہ تاثر صحیح نہیں ہے کیونکہ ہر زبان دراصل علاقائی بولیوں یا ڈائیلکٹوں ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اور کسی زبان کے ابتدائی تاریخی دور میں جب کوئی مرکزی یا مسلمہ معیار نہیں ہوتا یہ علاقائی بولیاں یا شکلیں (یا ڈائیلکٹ) علاقائی معیارات کو پیش کرتی ہیں۔ وقت گزرنے کے بعد انہی علاقائی بولیوں میں سے کوئی ایک بولی معیاری نوع یا قسم (standard variety) یا معیاری زبان بن جاتی ہے [۵۱]۔ گویا دوسرے لفظوں میں ہر زبان میں ڈائیلکٹ ہوتے ہیں اور ہر ڈائیلکٹ زبان ہوتا ہے اور ان تمام ڈائیلکٹوں کی مجموعی صورت حال کو دیکھ کر ہی اس زبان کو علمی و لسانیاتی سطح پر سمجھا جا سکتا ہے [۵۲]۔ کیونکہ کوئی بھی ڈائیلکٹ کم تر نہیں ہوتا بلکہ کسی زبان کے سارے ڈائیلکٹ اسی ایک زبان کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں اور یہ کہ ہر معیاری زبان کسی زمانے میں خود بھی ڈائیلکٹ رہی ہوگی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ زبان کی وہ شکل یا قسم جو معیاری زبان (standard language) سمجھی جاتی ہے خود اس کے بھی مختلف جغرافیائی ڈائیلکٹ ہوتے ہیں، اگر چہ اسے ایک ہی نوع یا ورائٹی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال برطانوی اور امریکی انگریزی ہے، جس کو انگریزی کی معیاری زبان سمجھا جاتا ہے مگر ان دونوں میں تلفظ اور قواعد کے لحاظ سے فرق بھی پائے جاتے ہیں اور پھر برطانیہ اور امریکا میں انگریزی کی اپنی علاقائی تحتی بولیاں (regional dialects) ہیں [۵۳]۔ جس انگریزی کو معیاری انگریزی (standard English) کہا جاتا ہے خود اس کے بھی متعدد لہجے (accent) ہیں [۵۴]۔

گویا ڈائیلکٹوں کے ضمن میں دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں: پہلی بات یہ کہ ہم میں سے ہر شخص

کوئی نہ کوئی ڈائیلکٹ بولتا ہے اگر چہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو معیاری زبان بولتے ہیں لیکن دوسرے لوگ اسی زبان کا کوئی ڈائیلکٹ بول رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص معیاری زبان بول بھی رہا ہے تو معیاری زبان خود بھی اسی زبان کی ایک ویرائٹی یا ڈائیلکٹ ہی تو ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کوئی بھی ڈائیلکٹ گھٹیا یا کمتر نہیں ہوتا نہ کوئی زبان گھٹیا یا ''پس ماندہ'' ہوتی ہے۔

☆ ڈائیلکٹ لہجہ نہیں ہے

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ ڈائیلکٹ یا تحتی بولی اور لہجہ (accent) دو الگ اصلاحات ہیں۔ عام طور پر ہمارے ہاں ڈائیلکٹ کو لہجہ کہا جاتا ہے اور بعض کتابوں میں مثلاً سندھی یا پنجابی کے علاقائی ڈائیلکٹوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں ''سندھی کے لہجے'' یا ''پنجابی کے لہجے'' کہا جاتا ہے [۵۵]۔ یہ بالکل غلط ہے۔ لہجہ بالکل الگ اصطلاح ہے۔ اصطلاحات میں بات کریں تو لہجہ (accent) دراصل تکلم یا گفتگو (speech) کی وہ شکل یا نوع (variety) ہے جو صوتیاتی طور پر (phonetically) اس زبان کی باقی شکلوں سے مختلف ہے [۵۶]۔

آسان لفظوں میں یوں کہیے کہ لہجہ (accent) کسی زبان کے الفاظ کا تلفظ ایک خاص انداز میں کرنے کا نام ہے [۵۷]۔ یوں بھی کہہ سکتے ہی کہ اگر کوئی شخص کسی زبان کو غیر مادری زبان کے طور پر بولتا ہے تو اس کے بولنے کا انداز لہجہ کہلائے گا [۵۸]۔ اس آخری جملے کی مثال ہم اپنے معاشرے سے لیں تو ٹی وی کے مختلف چینلوں پر خبروں کے دوران میں پاکستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے رپورٹر کوئی واقعہ یا خبر پیش کرتے ہوئے جس انداز میں اردو بولتے ہیں (جن میں سے بیشتر کی مادری زبان اردو نہیں ہوتی) وہ ان کا لہجہ (accent) ہوتا ہے اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے ان رپورٹروں کی اردو کا ''لہجہ'' سن کر آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں سے کس کا تعلق پاکستان کے کس صوبے (مثلاً سندھ یا خیبر پختون خوا) سے ہے۔

☆ بولیوں کا علم (dialectology)

جہاں ڈائیلکٹ پر اتنی بات ہوئی وہاں یہ بھی بتا دیا جائے کہ ڈائیلکٹوں یا بولیوں کے

مطالعے کے علم کو ڈائیلکٹولوجی (dialectology) کہتے ہیں۔ گیان چند جین نے ڈائیلکٹولوجی کو "بولی علم" بھی کہا ہے [۵۹]۔ بولیوں کے علم میں جغرافیائی یعنی علاقائی بولیوں (regional dialects) کا بطور خاص مطالعہ کیا جاتا ہے اور علاقائی تحتی بولیوں کی قواعد، بولیوں کی فرہنگ اور بولیوں کے علاقوں کا لسانی نقشہ (linguistic map) بنایا جاتا ہے۔ جس اطلس میں بولیوں کے لسانی نقشے دیے گئے ہوں اسے بولی اطلس (dialect atlas) کہتے ہیں [۶۰]۔

☆ لسانی نقشے

بولی اطلس میں زبانوں اور بولیوں کی سرحدیں تلاش کر کے انھیں علامات اور نشانات کے ذریعے نقشے پر ظاہر کیا جاتا ہے اور ایسے نقشوں میں بولیوں اور زبانوں کی حدود اور نوع (variation) کو طے کرنا آسان ہوتا ہے [۶۱]۔ بولی اطلس کے نقشوں پر جس لکیر کے ذریعے زبانوں اور بولیوں کے علاقوں یا ان کی خصوصیات کی نشان دہی کی جاتی ہے اس لکیر کو خطِ لسانی تفریق (isogloss) کہا جاتا ہے [۶۲]۔

محی الدین قادری زور نے اردو کی مختلف علاقائی تحتی بولیوں (مثلاً کھڑی بولی، بندیلی، برج بھاشا) اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کا لسانی نقشہ اپنی کتاب میں دیا ہے [۶۳]۔ اظہر علی فاروقی نے خاصی تفصیل سے اور الگ الگ نقشے بنا کر اردو کی علاقائی تحتی بولیوں کی لسانی حد بندی کی ہے [۶۴]، اور ایسی مثالیں اردو میں کم ہیں۔ اردو کی علاقائی تحتی بولیوں نیز دیگر پاکستانی زبانوں کے لسانی نقشے پر تفصیلی کام کی ضرورت ہے۔ غلام حیدر سندھی نے بعض پاکستانی زبانوں کے لسانی نقشے دیے ہیں جو بہت غنیمت ہیں [۶۵]۔

رولینڈ جے ایل بریٹن (Roland J-L Breton) کا بنایا ہوا جنوبی ایشیا کی زبانوں اور برادریوں کا اٹلس بھی اس ضمن میں اہم معلومات پیش کرتا ہے۔ اس میں ہمارے خطے کی کئی زبانوں اور بولیوں کے علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے [۶۶]۔

حواشی:

۱۔ اس کا ذکر کئی کتابوں میں موجود ہے، مثلاً: جوناتھن ایم واٹ (JonathanM. Watt)، Living Biblical and Ancient Greek Linguistics, مشمولہ، Language Environment Volume4، مدیر اسٹینلے ای پورٹر ودیگر (Stanley E. Porter Et al)، (یوجین (اوریگن): وِف اینڈ اسٹاک پبلشرز، ۲۰۱۶ء)، ص ۴۵؛ نیز جان ایڈورڈ (John Edward)، Sociolinguistics: A Very Short Introduction، (نیویارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء)، ص ۱؛ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)، ص ۲۶۔ [اشاعتِ نو]

۲۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language، محولۂ بالا، ص ۲۶۔

۳۔ کنسائز اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری (Concise Oxford English Dictionary)، (اوکسفرڈ، ۲۰۰۶ء) [گیارھواں ایڈیشن]۔

۴۔ پنجاب میں اردو (نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۴-۲۳ (حاشیہ)۔

۵۔ جان ایڈورڈ، Sociolinguistics: A Very Short Introduction، محولۂ بالا، ص ۲۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ جیرارڈ وان ہرک (Gerard Van Herk)، What Is Sociolinguistics? (چیچسٹر (ویسٹ سسیکس): وِلی بلیک ویل، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۔

۸۔ اے ڈی شیوسٹر (A.D. Sheveister)، Contemporary Sociolinguistics: Theory, Problems, Methods، (ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ، ۱۹۸۶ء)، ص ۵۱

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: جیرارڈ وان ہرک (Gerard Van Herk)، What Is Sociolinguistics? ، محولۂ بالا، مختلف ابواب۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ الیگزنڈر برگس (Alexander Bergs)، Social Networks and Historical Sociolinguistics، (برلن: موٹون ڈی گروٹر، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲، ۹، ۸، ۷۔

۱۴۔ ایضاً۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ ڈیوڈ ڈبلیو کیرول، (David W. Carroll)، Psychology of Language، (بلیمونٹ: تھامسن، ۲۰۰۸ء) ص ۳۹۴ [پانچواں ایڈیشن]۔

۱۸۔ بحوالہ ایضاً۔

۱۹۔ اس کی تفصیلات کئی کتابوں میں ملتی ہیں، مثلاً: آر ایل ٹراسک (R.L.Trask) نے مختصر اور جامع انداز میں مثالوں کے ساتھ اس کی وضاحت کی ہے، دیکھیے: Language: The Basics، (لندن: روٹلیج، ۲۰۰۰ء)، ص ۶۹۔۶۳؛ نیز Anthropological Linguistics مشمولہ Culture and Language Use (مدیر گنٹر سینف و دیگر (Gunter Senft Et al)، (ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۵۔۳۲؛ نیز جینٹ ہومز (Janet Holms)، An Introduction to Sociolinguistics، (ہارلو (انگلستان): لونگ مین، ۲۰۰۱ء)، بالخصوص دسواں باب اور تیرھواں باب [دوسرا ایڈیشن]۔

۲۰۔ اس کا ذکر بھی مختلف کتب میں موجود ہے، مثلاً ٹراسک نے مناسب حد تک تفصیل دی ہے، دیکھیے: آر ایل ٹراسک (R.L.Trask)، Language: The Basics، محولہ بالا، ص ۶۹۔۶۳؛ نیز ڈیوڈ کرسٹل نے بہت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اسے بیان کیا ہے، دیکھیے: The Penguin Dictionary of Language (لندن: پینگوین بکس، ۱۹۹۹ء) [دوسرا ایڈیشن]۔

۲۱۔ جینٹ ہومز (Janet Holms)، An Introduction to Sociolinguistics، محولۂ بالا، ص ۲۳۳۔

۲۲۔ مثلاً آر ایل ٹراسک (R.L.Trask)، Language: The Basics، محولۂ بالا، ص ۲۲۵، ۶۹۔۶۳

۲۳۔ جینٹ ہومز، محولہ بالا، ص ۱۹۵۔۱۹۴

۲۴۔ آر ایل ٹراسک، محولہ بالا، ص ۲۲۷، ۷۷۔۷۱

۲۵۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language (لندن: پینگوین بکس، ۱۹۹۹ء) [دوسرا ایڈیشن]۔

۲۶۔ آر ایل ٹراسک، Language: The Basics، محولہ بالا، ص ۲۷۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۲۱، ۹۲۔۹۱

۲۸۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language، محولۂ بالا۔

۲۹۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: جینٹ ہومز (Janet Holms)، An Introduction to Sociolinguistics، محولہ، ص ۱۹۵۔

۳۰۔ جینٹ ہومز، محولہ بالا، ص ۲۲۳۔

۳۱۔ پی ایچ میتھیوز (P.H. Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Lingiuistics (نیویارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۷ء)۔

۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ مثلاً: ڈیوڈ کرسٹل، Cambridge Encyclopedia of Language، محولہ بالا، ص ۲۴۔

۳۴۔ وکٹوریا فرام کن و دیگر (Victoria Fromkin, Et al) An Introduction to Language، (میلبرن: تھامسن پبلشنگ، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۰۱ [پانچواں ایڈیشن]۔

۳۵۔ ایضاً، دسواں باب

۳۶۔ لسانی مطالعے (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۶۶ [تیسرا ایڈیشن]۔

۳۷۔ اس ضمن میں کچھ گفتگو ہم پہلے کر چکے ہیں، اسے یہاں دہرایا نہیں جا رہا۔ دیکھیے: رؤف پاریکھ، لسانیاتی مباحث (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۸۸، ۸۷ [اشاعتِ ثانی]

۳۸۔ آر ایل ٹراسک، محولہ بالا، ص ۲۲۵، ۲۲۷۔

۳۹۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، An Introduction to Language، محولہ بالا ص ۵۳۴؛ نیز پی ایچ میتھیوز، Oxford Concise Dictionary of Linguistics، محولہ بالا؛ ڈیوڈ کرسٹل، The Penguin Dictionary of Language، محولہ بالا۔

۴۰۔ تفصیلات: رؤف پاریکھ، پاکستانی زبانیں اور بولیاں، مشمولہ اردو (ششماہی)، کراچی، انجمن ترقی اردو، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۸ء، جلد ۹۴، ص ۱۵۶۔۱۲۶

۴۱۔ ایڈورڈ فنیگن (Edward Finegan)، Language: Its Structure and Use (فورٹ ورتھ: ہارکوٹ براس، ۱۹۹۹ء)، دسواں اور گیارھواں باب۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۴۵۔۳۷۲

۴۳۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، An Introduction to Language، محولہ بالا، ص ۵۳۵۔

۴۴۔ ڈیوڈ کرسٹل، The Penguin Dictionary of Language، محولہ بالا۔

۴۵۔ گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۶۲۔۲۵۹؛ نیز کرخنداری کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے: گوپی چند نارنگ، Karkhandari Dialect of Delhi Urdu، (دہلی: ناشر مصنف، ۱۹۶۱ء)۔

۴۶۔ گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، محولہ بالا، ص ۲۶۴۔۲۶۳

۴۷۔ پی ایچ میتھیوز (P.H. Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Lingiuistics، محولہ بالا۔

۴۸۔ پیٹر ٹرڈ جل (Peter Trudgill) On Dialect: Social and Geographical Perspectives (اوکسفرڈ: باسل بلیک ویل، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۸۶۔

۴۹۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، محولہ بالا، ص ۴۰۹۔

۵۰۔ ایڈورڈ فنیگن، Language: Its Structure and Use، محولہ بالا، ص ۳۷۱۔

۵۱۔ ای ہوجن (E, Hoaigen)، Dalect, Language, Nation، مشمولہ Sciolinguistics (مرتبہ جے بی پرائڈ J.B. Pride اور جینٹ ہومز Janet Holmes)، (ہرمنڈزورتھ: پینگوِن، ۱۹۸۴ء)، ص ۹۹۔

۵۲۔ ای ہوجن، Dalect, Language, Nation، محولہ بالا، ص ۳۷۱۔

۵۳۔ پیٹر ٹرڈ جل On Dialect:Social and Geographical Perspectives، محولہ بالا، ص ۱۸۶۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۸۷۔

۵۵۔ مثلاً میمن عبدالمجید سندھی نے لسانیاتِ پاکستان (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء)، محمد قاسم بگھیو نے لسانیات تا سماجی لسانیات (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء) اور حمید اللہ ہاشمی نے مختصر زبان و ادب: پنجابی (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء) میں ڈائیلکٹ کے لیے ''لہجہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۵۶۔ پی ایچ میتھیوز (P.H. Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Lingiuistics، محولہ بالا۔

۵۷۔ آر ایل ٹراسک، محولہ بالا، ص ۷۳۔

۵۸۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، محولہ بالا، ص ۴۰۲۔

۵۹۔ عام لسانیایت، محولہ بالا، ص ۲۲۔

۶۰۔ پی ایچ میتھیوز (P.H. Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Lingiuistics، محولہ بالا؛ نیز آر ایل ٹراسک، محولہ بالا، ص ۷۷۔

۶۱۔ گیان چند، عام لسانیات، محلوۂ بالا، ص ۵۷۱۔۵۶۶

۶۲۔ آر ایل ٹراسک، محولہ بالا، ص ۷۷۔

۶۳۔ ہندوستانی لسانیات (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۰ء)، بالمقابل ص ۱۶۔

۶۴۔ اتر پردیش کے لوک گیت (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ قومی زبان، ۱۹۹۸ء) [دوسرا ایڈیشن]۔

۶۵۔ دیکھیے: پاکستان کا لسانی جغرافیہ (اسلام آباد: نیشنل انسٹی ٹیوٹ اوف پاکستان اسٹڈیز، ۲۰۰۵ء)۔

۶۶۔ رولینڈ جے ایل بریٹن (Roland J-L Breton)، Atlas of the Languages and Ethnic Communities of South Asia، (دہلی: سیج پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)۔

☆......☆......☆
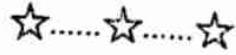
بارھواں باب: سماجی لسانیات (۲)

کثیر لسانی معاشرہ، مشترک زبان اور قومی زبان

دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کی تعداد چھے ہزار اور آٹھ ہزار کے درمیان ہے اور دنیا کے تمام ممالک کی مجموعی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے اکثر ملک کثیر لسانی (multilingual) اور کثیر ثقافتی (multicultural) ہیں، بس کوئی کم کثیر لسانی و کثیر ثقافتی ہے اور کوئی زیادہ[1]۔

گویا دنیا کے بیش تر ملکوں میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان کی علاقائی تحتی بولیاں یا ریجنل ڈائیلکٹ (regional dialect) بھی ہوتے ہیں۔ ایسا معاشرہ کثیر لسانی معاشرہ یا کثیر لسانی سماج (multilingual society) کہلاتا ہے۔ ایک کثیر لسانی سماج میں کئی زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں اور اس صورت حال کو کثیر لسانیت (multilingualism) کہتے ہیں۔

☆ یک لسانیت، دولسانیت اور کثیر لسانیت

ہمارا معاشرہ کثیر لسانی ہے۔ کثیر لسانی معاشرے کی بعض خصوصیات پر بات کرنے سے قبل بعض تصورات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

دنیا کی آبادی کی اکثریت دولسانی (bilingual) ہے یعنی دو زبانیں جانتی ہے اور یہ حقیقت بعض امریکیوں اور برطانویوں کے لیے باعثِ حیرت ہوتی ہے کیونکہ وہ عموماً یک لسانی (monolingual) افراد ہوتے ہیں اور صرف ایک ہی زبان یعنی انگریزی جانتے ہیں[2]۔ ایک

زبان جاننے کی حالت یا کیفیت کو یک لسانیت (monolingualism) کہا جاتا ہے۔ بعض ملکوں میں تعلیم کے بعض مراحل میں طلبہ کو دوسری زبان سیکھنی پڑتی ہے یا کسی وجہ سے معاشرے میں دوسری زبان بھی رائج ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال کو جس میں کوئی فرد یا لسانی گروہ (speech community) دو زبانیں استعمال کرتا ہے دولسانیت (bilingualism) کہتے ہیں اور ایسے فرد یا معاشرے یا گروہ کو دولسانی (bilingual) کہا جاتا ہے[۳]۔ اسی طرح جب صورت حال ایسی ہو کہ کوئی فرد یا لسانی برادری دو سے زیادہ زبانیں استعمال کرے تو اسے کثیر لسانیت (multilingualism) کہتے ہیں اور دو سے زیادہ زبانیں استعمال کرنے والوں کو کثیر لسانی (multilingual) کہا جاتا ہے[۴]۔

پاکستان کے اکثر شہری دو یا دو سے زیادہ زبانیں جانتے ہیں اور ملک کے بعض علاقوں خاص طور پر خیبر پختون خوا اور گلگت بلتستان کے بعض علاقوں میں تو شاید ہی کوئی شخص ہو جو تین زبانیں نہ جانتا ہو۔ یہی حال پنجاب کے کئی علاقوں اور بلوچستان اور سندھ کے بعض حصوں کا ہے۔ ان زبانوں میں ایک مادری زبان ہوگی اور دوسری ان علاقوں میں رائج دوسری زبانوں میں سے کوئی زبان یا زبانیں۔

سندھ اور بلوچستان میں بعض علاقے ایسے ہیں جہاں کے لوگ تین تین اور چار چار زبانیں روانی سے بولتے ہیں، مثلاً گھوٹکی (سندھ) یا ضلع نصیر آباد (بلوچستان) نیز آس پاس کے بعض علاقوں میں کئی لوگ سندھی، سرائیکی اور بلوچی بول لیتے ہیں۔ خیبر پختون خوا اور گلگت بلتستان کے لوگ بھی کئی زبانیں بول سکتے ہیں۔ گلگت بلتستان (ان علاقوں کا نام پہلے شمالی علاقہ جات تھا لیکن اب ان کا باقاعدہ سرکاری نام گلگت بلتستان ہے) کے کئی باشندے ایسے ہیں جن کی مادری زبان بروشسکی یا شِنا ہے لیکن وہ کوئی دوسری مقامی زبان بھی جانتے ہیں۔ چترال اور آس پاس کے علاقوں میں دس بارہ زبانیں بولی جاتی ہیں اور اکثر لوگ ایک سے زیادہ زبانیں جانتے ہیں[۵]۔ اردو پاکستان کے بیشتر علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لہٰذا پاکستان میں سبھی لوگ عام طور پر اردو بھی جانتے ہیں۔ ملک میں بیش تر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد انگریزی بھی جانتے ہیں۔ گویا پاکستان

میں بعض لوگ چار پانچ زبانیں بھی جانتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ پاکستان کے باشندوں میں سے اکثر دولسانی یا کثیر لسانی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ لسانی لحاظ سے پاکستان بہت زرخیز ہے اور یہاں چھہتر (۷۶) زبانیں اور بولیاں رائج ہیں[۶]۔

☆ مشترک زبان یا لنگوا فرینکا (lingua franca)

دنیا کے کئی ملکوں کی آبادی ایسے افراد پر مشتمل ہے جو مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ایسے کثیر لسانی ملکوں کے باشندے آپس میں رابطے اور تجارت کے لیے کوئی مشترک زبان استعمال کرتے ہیں اگرچہ ان کی اپنی مادری زبانیں ہوتی ہیں۔اس زبان کو رابطے کی زبان یا مشترک زبان یا لنگوا فرینکا (Lingua Franca) کہتے ہیں[۷]۔گویا لنگوا فرینکا وہ مشترک زبان ہوتی ہے جو مختلف اللسان لسانی گروہ آپس میں ایک دوسرے سے ابلاغ و ترسیل کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

لنگوا فرینکا کا وجود تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف خطوں میں ملتا ہے۔لنگوا فرینکا کی اصطلاح کے مختلف اشتقاق بھی بیان کیے جاتے ہیں اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ دراصل عربی کے ''لسان الفرنج'' (بمعنی فرنگ کی زبان یا مغرب کی زبان) کا بگاڑ ہے[۸]۔مختلف زمانوں میں مختلف زبانیں بعض خطوں میں لنگوا فرینکا یا رابطے کی زبان کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہیں اور ان میں عربی بھی شامل تھی[۹]۔لنگوا فرینکا کی ترکیب کا دوسرا اشتقاق یہ بتایا جاتا ہے کہ لنگوا (lingua) کے لفظی معنی ہیں زبان[۱۰] اور ''فرینکا'' فرینک (Frank) لوگوں کی زبان کو کہا جاتا تھا[۱۱] فرینک لوگوں کی زبان کو ''فرینکش'' بھی کہتے تھے[۱۲]۔یہ زبان فرینک لوگ چوتھی اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیانی عرصے میں بولتے تھے اور یہ زبانوں کے جرمینک (Germanic) خاندان سے تعلق رکھتی تھی[۱۳]۔

گویا لنگوا فرینکا کے لفظی معنی ''فرینکِش زبان'' (Franksih language) کے ہیں۔ یہ زبان قرونِ وسطیٰ میں بحر روم کے ساحلوں پر تجارتی مقاصد کے تحت بولی جاتی تھی اور جس کی بنیاد میں بیشتر وہ زبانیں شامل تھیں جو بعد میں جدید اطالوی اور پرووِنسل زبان (Provencal) کی صورت میں اُبھریں۔ پرونسل زبان جنوبی فرانس کے علاقوں خاص کر پرووِنس (Provence)

میں بولی جاتی تھی [۱۴]۔ بعد میں لنگوا فرینکا کو بطور اصطلاح ایسی تمام زبانوں کے لیے استعمال کیا جانے لگا جو اسی طرح رابطے کے لیے مشترک زبان کے طور پر بولی جاتی ہیں [۱۵]۔

انگریزی کو اب دنیا کی لنگوا فرینکا کہا جاتا ہے، لاطینی اور یونانی کسی زمانے میں علی الترتیب مغرب اور مشرق میں عسیائیت کی لنگوا فرینکا بن گئی تھیں اور تقریباً ایک ہزار سال تک رہیں [۱۶]۔ مشرقی افریقا میں ہزاروں قبائل ہیں جن کی اپنی اپنی زبان ہے مگر مشرقی افریقا کے کئی علاقوں میں اکثر لوگ تھوڑی بہت سواحلی زبان (Swahili Language) بھی زبانِ دوم (second language) کے طور سیکھ لیتے ہیں کیونکہ وہاں سواحلی مشترک زبان یا رابطے کی زبان یا لنگوا فرینکا کے طور پر تقریباً تمام منڈیوں میں بولی جاتی ہے [۱۷]۔ اسی طرح ہندی اب ہندوستان کی لنگوا فرینکا اور اردو پاکستان کی لنگوا فرینکا ہے کیونکہ اس خطے کی لسانی صورت حال بہت پیچیدہ ہے [۱۸]۔ اسی طرح چین میں بھی لسانی صورت حال بہت پیچیدہ ہے اور وہاں بھی کئی ڈائیلکٹ ہیں لیکن ایک مشترک زبان یا رابطے کی زبان استعمال ہوتی ہے [۱۹]۔

لنگوا فرینکا یا رابطے کی زبان کے سلسلے میں ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس کے استعمال کی کئی وجوہ ہوتی ہیں اور ان وجوہ میں مشترک لسانی، مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشی اور علمی امور کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اگر پاکستان میں اردو رابطے کی زبان یا لنگوا فرینکا ہے تو اس کی وجوہ مختلف پاکستانی زبانیں بولنے والوں کے باہمی لسانی، مذہبی اور ثقافتی اشتراکات ہیں۔

☆ قومی زبان (national language)

جیسا کہ ابتدا میں ذکر ہوا، اندازہ ہے کہ دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کی تعداد چھے ہزار سے آٹھ ہزار تک ہے۔ دنیا میں ملکوں کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے اکثر ملک کثیر لسانی (multilingual) اور کثیر ثقافتی (multicultural) ہیں، بس کوئی کم کثیر لسانی و کثیر ثقافتی ہے اور کوئی زیادہ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کے ملکوں میں سے بیش تر (تمام نہیں) ملک ایسے ہیں جن میں صرف ایک قومی زبان ہے، اگرچہ آئینی طور پر ان ملکوں میں دوسری زبانون کو بھی تسلیم کیا گیا ہے [۲۰]۔ لفظ قوم کی تعریفوں کی بحث میں پڑے بغیر اگر قوم واحد ایک

سیاسی یا معاشی وسماجی اکائی (unit) یا ایک ملک سمجھا جائے تو قومی زبان (national language) کسی ملک یعنی کسی سیاسی، مذہبی، معاشی اور سماجی اکائی (unit) کی زبان ہوتی ہے اور اسے عام طور پر قومی یک جہتی کی علامت کے طور پر پروان چڑھایا اور استعمال کیا جاتا ہے [۲۱]۔ قومی زبان کا مقصد قوم کو شناخت دینا اور اسے متحد کرنا ہوتا ہے [۲۲]۔

گویا قومی زبان کسی ملک وقوم کے نظریاتی مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ قومی زبان ملک کی تاریخ اور تہذیب کی عکاس ہوتی ہے۔ یہ قوم کے نظریے اور شناخت کی بھی علامت ہوتی ہے۔ قومی زبان ملک کے اتحاد، یک جہتی اور اشتراکِ عمل کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے نئے آزاد ہونے والے ملکوں میں کسی ایک زبان کو قومی زبان قرار دے دیا جاتا ہے تاکہ پورے ملک کے ایک قوم ہونے کی حیثیت کو واضح کیا جا سکے، خواہ وہ ملک کثیر لسانی ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ کئی ملکوں میں کیا گیا، مثلاً تنزانیہ میں سواحلی کو، اسرائیل میں عبرانی کو، ملائشیا میں ملائی کو اور انڈونیشیا میں انڈونیشیائی (جسے بھاشا انڈونیشیا بھی کہتے ہیں) کو قومی زبان بنایا گیا [۲۳]۔ اسی طرح پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنایا گیا۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں قومی زبان مختلف اداروں مثلاً سرکاری دفاتر، عدالتوں اور ذرائع ابلاغ میں استعمال ہوتی ہے، مثال کے طور پر فرانس میں فرانسیسی [۲۴]۔ لیکن چند ملک ایسے بھی ہیں جہاں کسی ایک زبان کو بوجوہ قومی زبان بنانا ممکن نہ تھا لہٰذا وہاں ایک سے زیادہ زبانیں بطور قومی زبانیں اختیار کی گئیں، مثلاً بلجیم، سنگاپور اور گھانا [۲۵]۔

☆ اردو کو قومی زبان بنانا کیوں ضروری ہے

بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کے اس فیصلے کو کہ ''پاکستان کی قومی زبان صرف اور صرف اردو ہوگی'' بے جا طور تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قائد کے اس فیصلے کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں بنگالی زبان اور بنگلہ شناخت کا مسئلہ اٹھا اور نتیجۃً پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ قائد اعظم کا یہ فیصلہ دور اندیشی پر مبنی تھا اور پاکستان میں اردو کو واحد قومی زبان بنانا اس لیے ضروری تھا کہ اگر کسی بڑے لسانی گروہ کی بات مان کر ان کی

زبان مثلاً بنگالی کو اردو کے ساتھ قومی زبان بنایا جاتا تو باقی زبانیں بولنے والے (جن کی بڑی تعداد موجود تھی اور ہے) مطالبہ کر سکتے تھے کہ ہماری زبان (مثلاً پنجابی، سندھی، سرائیکی اور پشتو وغیرہ) کو بھی قومی زبانوں میں شامل کیا جائے۔ اور ایسا ہوا بھی۔ ۱۹۵۳ء میں بنگلہ تحریک نے زور پکڑا اور مشرقی پاکستان میں اردو اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پھیلائی جانے لگی تو بقولِ سید عبداللہ مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ اس صورت حال سے خوف زدہ ہوگئی اور کُل پاکستان مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے ۲۰؍اپریل ۱۹۵۴ء کو اردو کے ساتھ بنگلہ کو بھی قومی زبان بنانے کی قرارداد پیش کی[۲۶] اور ''اس قرارداد سے تقویت پاکر ۸؍مئی ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی نے بھی اس پاکستان کُش فیصلے کو آئین میں شامل کرنے کی سفارش کر دی''[۲۷]۔

اصولاً تو اردو کے ساتھ بنگالی کو پاکستان کی قومی زبان بنائے جانے کے بعد بنگلہ اردو پرخاش ختم ہو جانی چاہیے تھی اور بنگلہ قومیت کی تحریک کو بھی ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا[۲۸] بلکہ اس سے علیحدہ ثقافت و تہذیب اور علیحدگی پسندی کے رجحانات نے طاقت پائی اور سندھ اور بلوچستان میں بھی قوم پرستانہ جذبات فروغ پانے لگے۔ گویا قائدِ اعظم کے بعد بنگالی کو دوسری قومی زبان تسلیم کرنے سے بنگالی قومیت کی تحریک میں جان پڑی۔ بقولِ سید عبداللہ بنگال کا اصل مسئلہ تو جمہوری حقوق تھے اور صرف بنگالی کو قومی زبان بنا دینے سے ان کی تسکین کیسے ہوتی[۲۹]۔ آج پاکستان میں مختلف پاکستانی زبانوں کو قومی زبان بنا کر ان کے احساسِ محرومی کی تلافی کی باتیں کی جارہی ہیں، سوال یہ ہے کہ کسی علاقے یا صوبے کی زبان کو قومی زبان بنانے سے وہاں کے لوگوں کی معاشی محرومیوں کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ یہ تو صوبائیت اور قوم پرستی کو ابھارنے کا نسخہ ہے۔

اردو کی وجہ سے پیدا ہونے والی قومی یک جہتی کو ختم کرنے کی ایک غیر ضروری کوشش کوئی چھے سات سال پہلے بھی کی گئی تھی اور اردو کی بجائے دس زبانوں کو قومی زبان بنانے کے لیے آئینی ترمیم کا ابتدائی مجوزہ مسودہ (۲۰۱۴ء) تیار بھی کر لیا گیا تھا جس کی رو سے دس زبانوں کو پاکستان کی قومی زبان بننا تھا اور ان میں یہ زبانیں شامل تھیں: بلتی، بلوچی، براہوی، پنجابی، پشتو، شِنا، سندھی، سرائیکی، ہندکو اور اردو[۳۰]۔

لیکن اس مجوزہ ترمیمی مسودے کو ایوانِ زیریں (قومی اسمبلی) میں پذیرائی نہ ملی۔ اس کے دو سال بعد (۲۰۱۶ء) اسے ایوانِ بالا (سینیٹ) میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہاں تجویز کیا گیا کہ صرف پانچ قومی زبانیں یعنی اردو، پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی مقرر کی جاسکتی ہیں[۱۳]۔ ظاہر ہے کہ باقی زبانوں (سرائیکی اور ہندکو وغیرہ) کے حامی (جو زور وشور سے اس بل کی حمایت اس خیال سے کر رہے تھے کہ ان کی زبان بھی قومی زبانوں میں شامل ہو جائے گی) اس پر قطعی تیار نہ ہوئے کہ ان کی زبانوں کو چھوڑ کر دوسری زبانوں مثلاً پنجابی یا پشتو کو قومی زبانوں کی فہرست میں شامل کرلیا جائے۔ اتفاق سے راقم الحروف کو ایسی بعض کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا جو اسی موضوع پر ہوئی تھیں اور جس میں مختلف زبانیں بولنے والوں نے بہت جوش اور (معذرت کے ساتھ) کسی حد تک سخت کلامی کا بھی مظاہر کیا اور اردو کو بطورِ خاص مطعون کیا۔ لیکن جب سینیٹ سے ان کی زبانوں کو قومی زبانوں کی فہرست میں سے نکال دیا گیا تو ہمارے انھیں قوم پرست دوستوں میں سے ایک نے (جن کی زبان مجوزہ پانچ قومی زبانوں میں شامل نہیں تھی) ادارۂ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، میں منعقدہ ایک کانفرنس میں اپنی تقریر میں بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ ''یہ تو ثابت ہو گیا ہے کہ پاکستان کی قومی زبان ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے''۔ جس کے بعد اگرچہ پاکستان کی قومی زبان/زبانوں کے مسئلے پر آوازیں اٹھتی رہی ہیں لیکن آئین میں ترمیم کے مجوزہ مسودۂ قانون کی بازگشت سنائی نہیں دیتی۔ یہاں خیال آتا ہے کہ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا تجزیہ درست ہے کہ 'جن علاقوں کو سیاسی یا معاشی محرومی کا سامنا ہے ان کے اصل مسائل حل کیے جائیں نہ کہ لسانی مسئلے کو سیاسی مسئلہ بنا کر وہاں کے لوگوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے قومیت کو ابھارا جائے اور غیر ضروری اور طے شدہ مباحث (مثلاً اردو کا قومی زبان ہونا) از سرِ نو چھیڑے جائیں۔ اردو کی قومی زبان کی حیثیت کو بدلنے سے ملکی یک جہتی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

مختصراً یہ کہ کثیر لسانی معاشروں میں کسی ایک زبان کو جو رابطے کی زبان یا لنگوا فرینکا ہو قومی زبان بنانا سود مند ہوتا ہے کیونکہ ایسے معاشروں میں ایک سے زیادہ زبانوں کو قومی زبان بنانا کئی مسائل کو جنم دیتا ہے۔ کثیر لسانی سماج میں چند ایک زبانوں کو قومی زبان قرار دینا بقیہ زبانیں

ہے۔ رہی اردو تو اول تو اردو پاکستان کے کسی بولنے والوں کے جذبات کو بھڑکانے کے مترادف علاقے کی زبان ان معنوں میں نہیں ہے کہ اردو کے اصل علاقے جو اس کی جنم بھومی تھے وہ تو ہندوستان ہی میں رہ گئے اور یہ ہجرت کر کے آنے والوں کی زبان ٹھہری۔ اردو پاکستان کے کسی علاقے کی مادری زبان اس طرح نہیں ہے جیسے دوسری پاکستانی زبانیں، لہٰذا اس بنیاد پر کوئی علاقہ یا صوبہ اعتراض نہیں کرسکتا کہ ہمارے علاقے کی زبان کو چھوڑ کر اردو کو کیوں قومی زبان بنایا گیا جو پاکستان کے فلاں علاقے یا فلاں صوبے کی زبان ہے۔ صوبے یا علاقے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو ایک غیر متنازع فیہ انتخاب ہے۔

دوسرے یہ کہ اردو پاکستان بننے سے بہت پہلے برعظیم پاک و ہند کی لنگوا فرینکا تھی۔ محمد عتیق صدیقی کے بقول جان گل کرسٹ جب ۱۷۸۲ء میں بمبئی پہنچا تو اس نے ساحل پر قدم رکھتے ہی ملکی زبان سیکھنی شروع کر دی کیونکہ وہ بہت دور اندیش انسان تھا اور اپنی کامیابی کے لیے یہاں کی وہ زبان سیکھنی ضروری سمجھتا تھا جو پورے ملک میں بولی جاتی تھی[۳۲] (اور یہ زبان اُردو ہی تھی اگرچہ اس وقت اس کا نام ہندوستانی تھا)۔ جب ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو اس نے شملہ میں وائسرائے کو پیش کیے گئے اپنے محضر نامے میں کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی قومی زبان نہیں ہے بلکہ یہ پورے ہندوستان کی لنگوا فرینکا بھی ہے[۳۳]۔

تیسرے یہ کہ اردو اب بھی پاکستان کی لنگوا فرینکا ہے۔ ہمارے سیاسی زعما ہوں یا علمائے کرام، عوام سے رابطے کے لیے ان کی زبان اردو ہی ہے۔

چوتھے یہ کہ قیام پاکستان میں اردو کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ دو قومی نظریہ، جس کی بنیاد پر پاکستان کے حصول کی تحریک چلی اور کامیاب ہوئی، دراصل ہندی اردو تنازع کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا اور اس میں اردو کا کردار مرکزی تھا[۳۴]۔ گویا اردو پاکستان کی بنیادوں میں شامل ہے اور چونکہ یہ کسی صوبے کی زبان نہیں ہے لہٰذا قومی زبان بنائے جانے کی غیر متنازع فیہ امیدوار بھی ہے۔

مختصراً یہ کہ بہمہ وجوہ اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوسکتی ہے۔ پاکستان میں چھہتر زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ دس یا پانچ زبانوں کو قومی زبان بنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ باقی اکہتر یا چھیاسٹھ

زبانیں بولنے والوں میں اس ضمن میں احساسِ محرومی پیدا ہو جائے اور وہ بھی مطالبہ کریں کہ ہماری زبانوں کو بھی قومی زبان بنایا جائے اور اس طرح ملک میں انتشار اور لسانی تعصب پھیل جائے۔

☆ سرکاری یا دفتری زبان (offical language)

دفتری یا سرکاری زبان (official language) وہ زبان ہوتی ہے جو حکومت کے دفتری کاموں میں استعمال ہوتی ہے اور اس کا مقصد قومی زبان کے برعکس نظریاتی یا علامتی نہیں بلکہ عملی اور افادی ہوتا ہے [۳۵]۔ البتہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی زبان یہ دونوں کام کرے یعنی قومی زبان ہی کو دفتری یا سرکاری زبان بنایا جائے [۳۶]۔ یک لسانی معاشروں میں ایک ہی زبان کو قومی اور سرکاری زبان بنایا جاتا ہے البتہ کثیر لسانی معاشروں میں متوازی یا متبادل انتظامات کے ذریعے سیاسی اور سماجی مقاصد کے حصول کے ساتھ ساتھ عملی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے [۳۷]۔ اگر کوئی قومی زبان سرکاری امور اور تجارتی مقاصد دونوں کو مکمل طور پر پورا نہ کر سکے تو ایک اور زبان یا چند زبانوں کو سرکاری اور دفتری زبان بنایا جاتا ہے، مثلاً زائرے، آئیوری کوسٹ اور چڈ جیسے افریقی ملکوں میں (جو پہلے فرانسیسی نوآبادیات رہے تھے) مقامی زبانوں کی بجائے فرانسیسی سرکاری زبان ہے [۳۸]۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح ہمارے ہاں ہندوستان اور پاکستان میں اپنی اپنی زبانوں کو چھوڑ کر انگریزی کو سرکاری زبان بنایا گیا۔

ایک سے زیادہ سرکاری زبانوں کا اعلان اس وقت ضروری ہو جاتا ہے جب کسی ایک قومی زبان کا انتخاب مسئلہ بن جائے۔ اس کی مثال کثیر لسانی ملک ہندوستان ہے جہاں ہندی کو واحد قومی زبان بنانے کا فیصلہ کام یاب ثابت نہ ہو سکا اور انگریزی اور بعد ازاں ہندی کے ساتھ چودہ زبانوں کو اس طرح سرکاری زبان بنایا گیا کہ صوبوں کو اپنی سرکاری زبان اپنانے کا اختیار دیا گیا اور اب مثلاً آندھرا پردیش میں تلگو سرکاری زبان ہے [۳۹]۔

☆ مادری زبان (mother tongue)

مادری زبان (mother tongue)، جسے پیدائشی زبان یا مقامی زبان (native

language) بھی کہا جاتا ہے، سے مراد ہے وہ زبان جو بچہ قدرتی طور پر اپنے ماحول سے سیکھتا ہے [۴۰]۔ کسی زبان کو مقامی زبان یا پیدائشی زبان (native language) کے طور پر بولنے والے کو native speaker یعنی اہل زباں کہا جاتا ہے [۴۱]۔

کثیر لسانی معاشروں میں مادری زبان کا سوال بعض اوقات بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے لیکن مادری زبان کا تصور اب دنیا میں کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی بجائے اب اسے پیدائشی زبان یا مقامی زبان (native language) اور زبانِ اوّل (first language) بھی کہا جاتا ہے۔ ڈیوڈ کرسٹل نے بھی اپنی لسانیات کی لغت میں مادری زبان (mother tongue) کے اندراج کو زبانِ اوّل (first language) سے رجوع کرادیا ہے اور لسانیات پر لکھی گئی بعض دیگر انگریزی کتب میں بھی یہی کیا گیا ہے۔ گویا بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ مادری زبان ہی زبانِ اوّل ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات مادری زبان اور زبان اوّل ایک نہیں ہوتیں اور دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بچے کے ماں باپ یا گھر والوں کی اپنی زبان تو کچھ اور ہوتی ہے لیکن گھر میں یا آس پاس کے علاقے میں کوئی اور زبان رائج ہوتی ہے اور بچہ اس دوسری زبان کو زیادہ بولتا اور سمجھتا ہے اور اظہارِ خیال میں بھی اسی میں آسانی محسوس کرتا ہے۔

☆ زبانِ اوّل (first language)

زبانِ اوّل سے مراد ہے وہ زبان جو بچہ پہلے پہل سیکھتا ہے، یہ زبان مادری زبان بھی ہو سکتی ہے اور کسی کثیر لسانی معاشرے میں یہ مادری زبان کی بجائے کوئی اور ایسی زبان بھی ہو سکتی ہے جسے معاشرے میں ترجیح حاصل ہے [۴۲]۔ مثال کے طور پر یورپ سے ہجرت کر کے امریکا میں بس جانے والے لوگوں کے بچوں کی زبانِ اوّل ان کی مادری زبان (مثلاً فرانسیسی یا جرمن) نہیں بلکہ انگریزی ہے [۴۳]۔

انگلستان میں پاکستان اور دوسرے ملکوں سے ہجرت کر کے جانے والوں کی دوسری اور خاص طور پر تیسری نسل اپنی مادری زبانوں سے بہت کم واقف ہے اور بعض بچے اپنی مادری زبان یا تو بالکل نہیں بول سکتے یا ٹوٹی پھوٹی بولتے ہیں اگرچہ مادری زبان سمجھ سکتے ہیں۔ دراصل انگریزی

ان کی زبانِ اوّل ہے اور ان کی مادری زبان ان کے لیے ایک غیر ملکی زبان (foreign lnguage) یا زبانِ دوم (second language) کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

پاکستان میں کئی گھرانے ایسے ہیں جن کی مادری زبان کچھ اور (مثلاً پنجابی) ہے لیکن ان کے گھر میں اردو بولی جاتی ہے اور اردو ان کے بچوں کی زبانِ اوّل بن جاتی ہے۔ اسی طرح بعض پاکستانی اپنے گھروں میں انگریزی بولتے ہیں (اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے) اور بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں جہاں انگریزی بولنے پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ وہ بچے انگریزی ادب پڑھ کر بڑے ہوتے ہیں اور اس طرح ان بچوں کی مادری زبان کچھ اور ہوتی ہے (مثلاً پنجابی یا اردو) لیکن ان کی مادری زبان ان کی زبانِ اوّل نہیں ہوتی بلکہ انگریزی ان کی زبانِ اوّل بن چکی ہوتی ہے۔ وہ گفتگو اور تحریر میں انگریزی میں مادری زبان کے مقابلے زیادہ آسانی محسوس کرتے ہیں۔

کثیر لسانی معاشروں میں بعض اوقات بعض لوگ اپنی مادری زبان سے زیادہ عبور زبانِ اوّل پر حاصل کر لیتے اور اظہار خیال بالخصوص تحریری طور پر اظہارِ خیال کے وقت زبانِ اوّل میں مادری زبان سے زیادہ سہولت محسوس کرتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں انگریزی اسکولوں سے تحصیلِ علم کرنے والے کئی طالب علم اپنی زبان مثلاً اردو یا پنجابی سے زیادہ انگریزی میں اظہار خیال پر قدرت رکھتے ہیں۔ بعض طالب علم جن کی مادری زبان مثلاً پنجابی ہے وہ اردو میں تحریری اظہار خیال میں آسانی محسوس کرتے ہیں حالانکہ اردو ان کی زبانِ اوّل ہوتی ہے۔

اس جدید تعریف کے مطابق ہر وہ شخص اردو کا اہل زبان ہے جس کی زبانِ اول اردو ہے، خواہ اس کی مادری زبان کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

☆ اردو بطور قومی اور دفتری زبان

خلاصہ اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ چونکہ اردو پاکستان کی لنگوا فرینکا یا مشترک زبان ہے اور پاکستان میں پچانوے فی صد لوگ اردو جانتے ہیں نیز ادب اور ذرائع ابلاغ کی ترجیحی زبان بھی اردو ہے لہٰذا اردو ہی کو پاکستان کی قومی اور دفتری زبان ہونا چاہیے۔ اردو کے ساتھ کسی اور زبان یا چند زبانوں کو قومی زبان بنانے سے دیگر زبانیں بولنے والے بھی اپنی زبان کے لیے قومی

زبان کی حیثیت کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔لیکن کسی ملک کی چھہتر (۷۶) قومی زبانیں نہیں ہو سکتیں۔

اردو کا قومی اور دفتری زبان ہونا نہ صرف تعصّبات کے خاتمے اور ملکی یکجہتی کے لیے ضروری ہے بلکہ پاکستان کے آئین کی شق دوسوا کیاون (۲۵۱) کا بھی تقاضا ہے۔اردو کو دفتری زبان نہ بنانا نہ صرف آئین کی خلاف ورزی ہے بلکہ عدالتِ عظمیٰ کی واضح ہدایات کے بعد توہینِ عدالت کے زمرے میں بھی آتا ہے۔

☆ پجن (pidgin) اور کری اول (creole)

لنگوا فرینکا یا مشترک زبان یا رابطے کی زبان عام طور پر ایک ایسی زبان ہوتی ہے جو بطور مادری زبان بھی کچھ حلقوں میں بولی جاتی ہے اور زیادہ امکان یہ ہوتا ہے کہ لنگوا فرینکا کو مشترک زبان کے طور پر استعمال کرنے والے ایسی دیگر زبانیں مادری زبان کے طور پر بولتے ہوں گے جو اسی مشترک زبان یعنی لنگوا فرینکا کے لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں گی [۴۴]۔اس کی مثال اگر ہم اپنے ہاں دیکھیں تو اردو پاکستان کی لنگوا فرینکا ہے اور آریائی زبان ہے۔پاکستان میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اردو کو بطور مادری زبان نہیں بولتے لیکن ان میں سے بیشتر کی مادری زبانیں (مثلاً پنجابی، سندھی وغیرہ) زبانوں کے اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جس سے اردو کا تعلق ہے یعنی آریائی خاندان (البتہ پاکستانی زبانوں میں سے براہوی کا تعلق دراوڑی خاندان سے ہے)۔یہ وہ تاریخی ولسانی اشتراک ہے جو رابطے کی ایک زبان کو فروغ دینے کا دیگر اسباب کے ساتھ ایک سبب بنا اور اسی وجہ سے رابطے کی اس زبان کو قومی زبان بنانا ناگزیر تھا۔

لیکن تاریخ میں ایسا بھی ہوا ہے کہ تاجر اور مذاہب کی تبلیغ کرنے والے ایسے خطوں میں پہنچے جہاں کی زبان اور ثقافت یک سر مختلف تھی اور ان اجنبیوں اور مقامی لوگوں میں کوئی ایسی ثقافتی یا لسانی مشترک اقدار نہ تھیں جو کسی مشترک یا رابطے کی زبان یعنی لنگوا فرینکا کے استعمال کا سبب بن سکیں [۴۵]۔ایسے مواقع پر مختلف زبانیں بولنے والوں نے آپس میں ابلاغ و ترسیلِ خیالات کے لیے ایک ایسی ابتدائی یا خام زبان استعمال کرنی شروع کی جس میں معدودے چند الفاظ اور فقرے ہوتے تھے اور اس کی قواعد پیچیدہ نہیں ہوتی تھی۔ایسی بنیادی اور خام زبانوں کو پجن

(pidgin) کا نام دیا گیا ہے [۴۶]۔ پجن زبان زبانوں کے بنیادی اور مرکزی دھارے میں شامل نہیں ہوتی۔ ایسی زبان کو جو زبانوں کے بنیادی یا مرکزی دھارے میں شامل نہ ہوں ثانوی زبان یا حاشیائی زبان (marginal language) کہا جاتا ہے [۴۷]۔

پجن زبان کی بنیاد عام طور پر رابطے میں آنے والی دو زبانوں میں سے کسی ایک زبان پر ہوتی ہے یعنی اس کا قواعدی ڈھانچا اور ذخیرۂ الفاظ کسی ایک زبان پر زیادہ انحصار کرتا ہے [۴۸] اور ایسی کئی مثالیں ہیں جن میں بالعموم مغربی زبانوں نے مقامی (بالخصوص افریقی) زبانوں کے ساتھ جو پجن بنائی ان میں مغربی زبان ہی میں مقامی زبان کے چند الفاظ ملا کر ایک رابطے کی زبان بنالی گئی۔ خاص طور پر استعماری قوتوں نے جو نوآبادیات قائم کیں اُن میں بنائی جانے والی پجن زبانوں کی بنیاد یورپی زبانوں ہی پر رکھی گئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پجن زبانوں کی تاریخ ان علاقوں میں نوآبادیات کی تاریخ ہے جہاں یہ زبانیں مستعمل ہیں [۴۹]۔

مختصراً یہ کہ پجن ضرورت کے تحت استعمال ہونے والی ایک ایسی سادہ سی زبان ہوتی ہے جس کی بنیاد کسی ایک زبان پر ہوتی ہے لیکن اس میں کسی دوسری زبان کے الفاظ بھی شامل کرلیے جاتے ہیں تاکہ تجارت یا روزمرہ کے معاملات میں آسانی ہو۔ پجن اس وقت وجود میں آتی ہے جب ایسے افراد یا اقوام آپس میں کچھ معاملات، مثلاً کاروبار، کرنا چاہیں جن کا لسانی اور ثقافتی پس منظر بہت مختلف ہو۔

اب پجن کی وجہ تسمیہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ اوکسفرڈ ڈکشنری کے مطابق لفظ پجن دراصل انگریزی کے لفظ بزنس (business) کا چینی زبان میں بگاڑ ہے، یعنی کاروبار، تجارت، بیوپار، پیشہ یا معاملہ [۵۰]۔ لیکن دراصل لفظ پجن کی اصل یا اشتقاق نامعلوم ہے اور مختلف قیاسات میں سے ایک قیاس یہ ہے کہ پہلے یہ ''پجن انگلش'' (pidgin English) کی شکل میں مستعمل تھا جو یقیناً اس زبان کے لیے مخصوص تھا جو کاروبار کے لیے انگریزی میں کسی مقامی زبان کے الفاظ شامل کرکے کاروباری معاملات کے لیے استعمال کی جاتی تھی [۵۱]۔ لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ چونکہ چین کے ساحلوں پر بولی جاتی تھی اور ساحل کو انگریزی میں بیچ (beach) کہتے ہیں لہٰذا یہ ''بیچ

انگلش''، کا بگڑا ہوا تلفظ ''پجن انگلش'' ہو سکتا ہے جو بعد میں صرف پجن رہ گیا[۵۲]۔ ایک اور امکان یہ ہے کہ یہ پرتگالی کے ایک لفظ کا چینی تلفظ ہو[۵۳]۔

پجن کا ذکر عام طور پر منفی انداز میں ہوتا ہے جس کی ایک وجہ پجن کا نوآبادیات کی نشانی ہونا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پجن زبان کی ابتدائی یا خام شکل ہوتی ہے[۵۴]۔ اگرچہ پجن میں صوتیے یا فونیم (phoneme) کم ہوتے ہیں اور اس کے محدود ذخیرۂ الفاظ میں مفہوم کے باریک اور نازک فرق کو واضح کرنے کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی لیکن پجن قواعد سے بالکل عاری بھی نہیں ہوتی اور اس میں اصوات کا ایک نظام بھی ہوتا ہے[۵۵]۔

پجن کے علاوہ ایک اور اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے اور وہ ہے کری اول (creole)۔ جب کسی پجن کو کوئی لسانی گروہ بطور مقامی زبان اختیار کر لے اور ان کے بچے اس کو زبانِ اوّل (frist language) کے طور پر سیکھنا شروع کر دیں تو اس پجن کو کری اول کہتے ہیں[۵۶]۔

لفظ کری اول کے اشتقاق پر خاصا اختلاف ہے لیکن غیر ضروری تفصیلات سے بچتے ہوئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس کی اصل لاطینی کا ایک لفظ creare ہے جس کا مفہوم ہے تخلیق اور یہی لفظ مختلف زبانوں میں ذرا سے مختلف تلفظ اور املا کے ساتھ رائج ہوا اور اس کے معنی ہو گئے ملازم یا غلام جس کی گھر میں پرورش ہوئی ہو۔ اس کا ایک مفہوم ''افریقی غلام جو برازیل میں پیدا ہوا ہو'' بھی ہو گیا[۵۷]۔ مختصراً یہ کہ کری اول وہ زبان ہوتی ہے جو تاریخی طور پر کسی پجن سے وجود پاتی ہے۔ ابتدا میں اس کو بطور مقامی زبان بولنے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن بعد میں بچے بھی اسے سیکھ لیتے ہیں اور یہ کسی گروہ یا برادری کی زبانِ اول بن جاتی ہے نیز اس کا ذخیرۂ الفاظ اور ڈھانچا دونوں پہلے کے مقابلے میں کچھ پیچیدہ ہو جاتے ہیں[۵۸]۔ دنیا میں آج ایک سو کے قریب پجن اور کری اول زبانیں بولی جاتی ہیں جن کی بنیاد بالعموم ہسپانوی، ولندیزی، فرانسیسی، انگریزی اور پرتگالی ہیں[۵۹]۔

آج کل پاکستان میں اردو میں انگریزی کی بے محابا اور غیر ضروری ملاوٹ کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اردو میں انگریزی کے الفاظ اس کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں کہ کبھی کبھی آدھے

سے زیادہ جملہ انگریزی میں ہوتا ہے اور اس میں بس کہیں کہیں اردو کے الفاظ استعمال کر لیے جاتے ہیں۔ اس طرح کی دوغلی زبان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ اردو کو پجن یا کری اول کے درجے تک گرانے کی کوشش ہے۔

☆لسانی ثنویت یا ڈائگلوسیا(diglossia)

اگر ہم ہندوستان کے صوبے بہار میں آباد ایسے عام لوگوں کی اردو سنیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور پھر بہار میں اردو کی کتابوں اور اردو اخباروں میں لکھی جانے والی اردو پر غور کریں تو ہمیں حیرت ہوگی کیونکہ دونوں میں خاصا فرق ہوگا، اگرچہ یہ ایک ہی لسانی گروہ کی ایک ہی زبان یعنی اردو ہوگی لیکن اس کی دو مختلف شکلیں ہمارے سامنے ہوں گی۔ یہ صورت حال لسانی ثنویت یا ڈائیگلوسیا کی ایک مثال ہے۔

اسی طرح کی ایک اور مثال لیجیے: سوئٹزرلینڈ میں جرمن زبان بولی جاتی ہے لیکن وہاں جرمن زبان کی دو انواع (varieties) رائج ہیں، ایک معیاری جرمن ہے اور دوسری ''سوئس جرمن'' کہلاتی ہے [۶۰]۔ ایسی صورت حال جس میں کوئی لسانی گروہ ایک ہی زبان کی دو واضح طور پر مختلف شکلیں مختلف مواقع یا سماجی صورت حال کی مناسبت سے استعمال کرے ڈائیگلوسیا کہلاتی ہے [۶۱]۔ ان میں سے زبان کی ایک شکل یا نوع وہ ہوگی جو رسمی تعلیم سے پہلے حاصل کی گئی ہوگی اور ایک خاص سماجی صورت حال میں قابل قبول ہوگی اور دوسری رسمی تعلیم کے بعد حاصل کی گئی زبان ہوگی جسے مخصوص سماجی ماحول میں استعمال کیا جائے گا [۶۲]۔

ڈائگلوسیا(diaglossia) کے لیے اردو میں جو اصطلاحات ملتی ہیں ان میں سے ایک ''دو معیاری لسانیت'' ہے [۶۳]۔ عطش درانی صاحب نے ایک بار راقم کے استفسار پر اس کا مترادف ''ذولفظیہ'' بتایا۔ لیکن یہ کوئی لفظ نہیں ہوتا بلکہ ایک کیفیت یا صورت حال ہوتی ہے جس میں کوئی زبان بولنے والے دو مختلف زبانیں یا ایک ہی زبان کی دو مختلف انواع (varieties) یا تحتی بولیاں یعنی ڈائیلکٹ (dialect) استعمال کرتے ہیں۔ گیان چند نے اسے لسانی ثنویت کہا

ہے [۶۴]۔ اس صورت حال یعنی ڈائگلوسیا میں بالعموم ایک زبان (یا ایک ہی زبان کی دوسری اور مختلف نوع) بہتر حیثیت کی حامل یا معیاری (standard) سمجھی جاتی ہے، اسے اونچا یا اعلیٰ (high) سمجھا جاتا ہے اور رسمی مواقع پر (مثلاً خطبات، تقاریر، اخبارات کے اداریوں میں) استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری نوع کو نیچا یا پست (low) خیال کیا جاتا ہے اور اسے روزمرہ گفتگو یا دیگر غیر رسمی موقعوں پر برتا جاتا ہے [۶۵]۔

ڈائیگلوسیا سماجی لسانیات کی اہم اصطلاحات میں سے ہے اور اس کی مختلف تعریفیں ملتی ہیں لیکن بیشتر تعریفوں میں یہی کہا گیا ہے کہ ڈائیگلوسیا ایک ایسی صورت حال ہوتی ہے جس میں ایک ہی لسانی ماحول یا ایک ہی لسانی برادری عملی طور پر ''دولسانی نظاموں'' میں تقسیم ہوتی ہے اور یہ دونوں ساتھ ساتھ وجود رکھتے ہیں [۶۶]۔ یہاں لوفٹی سایا ہی نے ''دولسانی نظام'' کی اصطلاح اس لیے استعمال کی ہے کہ اس سے مفہوم میں ذرا وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے دائرے میں دو زبانیں، ایک ہی زبان کے دو ڈائیلکٹ اور ایک ہی زبان کی دو انواع (varieties) بھی آجاتی ہیں، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط سے ڈائنگلوسیا کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی ہے اور اس میں ایک ہی خاندان کی دو زبانیں، دو مختلف زبانیں اور ایک ہی زبان کی انواع بھی شامل ہوگئی ہیں [۶۷]۔

☆ ٹرائنگلوسیا (triglossia)

لفظ ڈائنگلوسیا میں di (ڈائی) یونانی زبان کا لفظ ہے اور ''دو'' کے معنی میں ہے لیکن بسا اوقات کسی معاشرے میں دو کی بجائے تین زبانیں بھی بیک وقت استعمال ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت اور سماجی مرتبہ ان کے استعمال کے لحاظ سے اعلیٰ یا پست سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت حال کو ''ٹرائنگلوسیا'' (triglossia) کہتے ہیں کیونکہ tri (ٹرائی) لاطینی میں تین کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس کی مثال تیونس میں فرانسیسی، کلاسیکی عربی اور روزمرہ کی تیونسی عربی کا استعمال ہے اور اس میں فرانسیسی اور کلاسیکی عربی کو اعلیٰ (high) اور عربی کی مقامی نوع (variety) کو پست (low) سمجھا جاتا ہے [۶۸]۔

☆ تبدیلیٔ زباں یا کوڈ سوئچنگ (code-switching)

اس اصطلاح کو بعض کتابوں میں لینگوئج سوئچنگ یا صرف سوئچنگ بھی لکھا گیا ہے[۶۹]۔
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ ایک ایسا عمل یا ایسی صورت حال ہوتی ہے جس میں گفتگو کرنے والا فرد یا افراد ایک زبان (یا ڈائیلکٹ) بولتے بولتے دوسری زبان (یا ڈائیلکٹ) بولنے لگتا ہے البتہ اس میں مخاطب کا دونوں زبانیں یا ڈائیلکٹ جاننا ضروری ہے، دوسرے لفظوں میں جب چند دو لسانی (bilingual) افراد ملتے ہیں تو تبدیلیٔ زباں یا کوڈ سوئچنگ کی صورت حال پیدا ہوسکتی ہے[۷۰]۔ کچھ لکھنے والوں کے مطابق کوڈ سوئچنگ میں ایک ہی جملے میں دو زبانیں استعمال ہوسکتی ہیں اور اس میں آدھا جملہ یا چند الفاظ ایک زبان میں اور چند دوسری زبان میں ہوتے ہیں[۷۱]، جیسا کہ بعض لوگ آدھی اردو اور آدھی انگریزی بولتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

لیکن بعض ماہرین کے مطابق کوڈ سوئچنگ یہ ہے کہ دو افراد ایک زبان بولتے بولتے پوری گفتگو دوسری زبان میں کرنے لگیں تو یہ کوڈ سوئچنگ ہے لیکن اگر وہ آدھا جملہ یا چند الفاظ ایک زبان میں ادا کریں اور بقیہ دوسری زبان میں تو یہ عمل کوڈ مکسنگ (code-mixing) (خلطِ زباں) ہے[۷۲]۔

سوال یہ ہے کہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں کہ ایک زبان بولتے بولتے دوسری زبان میں شروع ہوجاتے ہیں یا آدھا تیتر آدھا بٹیر کی طرح جملے کا کچھ حصہ ایک زبان مثلاً اردو یا پنجابی اور آدھا حصہ دوسری زبان مثلاً انگریزی یا اردو میں ہوتا ہے؟ ڈیوڈ کرسٹل نے تبدیلیٔ زباں (کوڈ سوئچنگ) یا خلطِ زباں (کوڈ مکسنگ) کی اس کی کچھ وجوہات بیان کی ہیں جو یہ ہوسکتی ہیں[۷۳]:

۱۔ بولنے والا ایک زبان میں بعض خیالات کے اظہار پر پوری طرح قدرت نہیں رکھتا اور کچھ باتیں بیان کرنے کے لیے اسے مجبوراً دوسری زبان کے جملوں یا الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

۲۔ گفتگو کی زبان تبدیل کر کے کسی ایسی زبان میں یا ڈائیلکٹ میں گفتگو کرنا جو مخصوص

علاقے یا لسانی گروہ کی زبان ہو اس مخصوص علاقے یا لسانی گروہ سے ذہنی ہم آہنگی یا اتحاد و یکجہتی کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے۔

۳۔ بولنے والے کا زبان تبدیل کرنا مخاطب سے اس کے کسی خاص رویے یا طرزِ عمل کا بھی عکاس ہوسکتا ہے، مثلاً دوستانہ، غصیلا، مزاحیہ، طنزیہ وغیرہ۔ کیونکہ مخصوص حالات میں دوسری زبان بولنے سے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں (مثلاً ہمارے ہاں اکثر رسمی مواقع پر انگریزی بولی جاتی ہے کیونکہ ایک خیال ہے کہ اس سے رعب پڑتا ہے)۔ یک لسانی (monolingual) لوگ ایسے مواقع پر زبان کو صورت حال کے مطابق زیادہ رسمی یا غیر رسمی بنالیتے ہیں لیکن دولسانی افراد زبان تبدیل کر لیتے ہیں۔

البتہ بسا اوقات کوڈ سوئچنگ یا کوڈ مکسنگ کرنے والے کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے کیونکہ کبھی کبھی یہ عمل لاشعوری یا نادانستہ بھی ہوتا ہے۔ البتہ بعض لوگ اسے طنزیہ الفاظ میں یاد کرتے ہیں [۷۴]۔ ہمارے ہاں بھی بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگ غیر ضروری طور پر انگریزی جھاڑ کر نفسیاتی اثر ڈالنا چاہتے ہیں، ایسا ہے بھی کیونکہ انگریزی کو ہمارے معاشرے میں ایک خاص اہمیت اور توقیر حاصل ہے۔ لیکن یہ ہر بار یا ہر شخص کے معاملے میں نہیں ہوتا، جیسا کہ اوپر درج وجوہات سے اندازہ ہوتا ہے۔ جس زبان یا نوع (variety) کو معاشرے میں اہمیت یا توقیر حاصل ہو اسے معتبر ڈائیلکٹ (prestige dialect) کہتے ہیں اور یہ بالعموم امیر، بااثر اور طاقت ور حلقوں کی زبان یا ڈائیلکٹ ہوتا ہے، جیسے انگریزی میں شاہی خاندان کی زبان [۷۵]۔

☆ سَبک یا اسٹائل (style)

سماجی لسانیات کی ایک اصطلاح اسٹائل (style) بھی ہے۔ اردو میں اسے سبک (س مفتوح، ب ساکن) یا طرز کہنا چاہیے۔

دراصل لوگ مختلف حالات کے لحاظ سے ایک ہی زبان کو مختلف انداز میں برتتے ہیں، مثلاً دوستوں میں ہماری زبان کچھ اور انداز کی ہوتی ہے، اساتذہ یا والدین سے بات کرتے ہوئے طرز کچھ اور ہوتی ہے اور ملازمت کا انٹرویو دیتے ہوئے ہم کسی اور انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ صور، ، حال

کے لحاظ سے ایک ہی زبان میں گفتگو کے یہ مختلف انداز اسٹائل (style) کہلاتے ہیں[۶]۔

اسٹائل یا سبک رسمی اور غیر رسمی کے مختلف درجات میں سے کسی بھی درجے پر ہوسکتا ہے۔ یہ انتہائی رسمی (ماحضر تناول فرمائیے)، رسمی (کھانا کھائیے)، غیر رسمی (کھانا کھاؤ) اور انتہائی غیر رسمی (ابے کھانا کھالے) ہوسکتا ہے۔ اردو میں مخاطب کرنے کے لیے آپ، تم اور تو صورت حال اور مخاطب کو دیکھ کر استعمال کیا جاتا ہے، یہ بھی اسٹائل کی مثال ہے۔

☆ **سلینگ** (slang)

سلینگ کا لفظ عام طور پر ان الفاظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو غیر رسمی ہوتے ہیں یا انھیں معیاری زبان (standard language) کا حصہ نہیں سمجھا جاتا[۷]۔ سلینگ پرانے لفظوں کو نئے معنی میں استعمال کرنے کا بھی نام ہے اور کبھی کبھار کوئی شخص جانتے بوجھتے نیا سلینگ لفظ بنا بھی لیتا ہے۔ دراصل جب عام اور رسمی الفاظ اظہار کا زور اور معنی کی شدت کھو بیٹھیں تو ان کی جگہ لینے کے لیے نئے لفظ آجاتے ہیں یا پرانے لفظوں کو نئے معنی میں استعمال کرلیا جاتا ہے۔ انگریزی میں لفظ سازی اور سلینگ کے ضمن میں نئے لفظ بنانے کی مثالیں بہت عام ہیں۔ سلینگ کبھی استہزائیہ بھی ہوسکتا ہے اور فحش بھی۔ لیکن اس کا استہزائیہ یا فحش ہونا ضروری نہیں ہے، غیر رسمی ہونا ضروری ہے۔ دراصل سلینگ عوامی چیز ہے۔ سلینگ عوام میں جڑیں رکھتا ہے اور عوام سے اٹھتا ہے۔ یہ زبان میں ہونے والی جمہوری تبدیلیوں کی مثال ہے۔ سلینگ الفاظ کو عام لوگ بسا اوقات اپنے اصلی لغوی معنوں سے ہٹ کر استعمال کرتے ہیں۔ اردو کے سلینگ کی چند مثالیں دیکھیے:
ٹیوب لائٹ (بے وقوف آدمی)، پٹرول پمپ کی ٹنکی (موٹا آدمی)، ٹیکسی (طوائف)، چیتا (بہت ذہین اور کسی کام میں تیز)، مک مکا (ملی بھگت، رشوت)، جہاز (ہیرونچی، نشئی)، پنگا لینا (خواہ مخواہ مصیبت مول لینا)، چراند کرنا (بلا وجہ اعتراض کرنا یا رکاوٹ ڈالنا، چراند کے لغوی معنی جلنے کی بو کے ہیں)، سوفٹ ویر اپ ڈیٹ کردینا (کسی کا دماغ درست کردینا)۔

سلینگ الفاظ کا اپنا ایک خاص پس منظر ہوتا ہے اور اسی لیے اس کا دائرہ خاصا محدود بھی ہوسکتا ہے، مثلاً مختلف پیشوں کے افراد کے زیر استعمال بعض اصطلاحات بھی سلینگ ہوتی ہیں،

جیسے فوجی سلینگ، ریلوے سلینگ یا دفتری سلینگ۔ بعض اسکولوں کا اپنا سلینگ ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ طالب علموں کی اگلی نسلیں ان سلینگ الفاظ سے واقف نہ ہوں۔ کیونکہ اکثر سلینگ الفاظ کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے اور یہ چند ہی برسوں میں بھولے بسرے یا ناقابلِ فہم ہو جاتے ہیں کیونکہ ان سے جڑا سماجی پس منظر بھی بھولی بسری یاد بن جاتا ہے، مثال کے طور پر دوسری جنگِ عظیم نے انگریزی زبان کو سلینگ الفاظ و محاوارت کا خاصا بڑا ذخیرہ دیا لیکن اب ان میں سے بیشتر کا وجود انگریزی سلینگ کی پرانی لغات تک محدود ہے۔ گویا سلینگ الفاظ کی بڑی تعداد جلد ہی ختم ہو جاتی ہے اور ان کی جگہ نئے سلینگ الفاظ آ جاتے ہیں۔ سلینگ کو معیاری زبان کا حصہ نہیں مانا جاتا اور بسا اوقات ان کا استعمال رسمی صورت حال میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ البتہ کچھ سلینگ الفاظ عوامی بول چال سے اٹھ کر تحریر میں نمودار ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ معیاری زبان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آج کے انگریزی اور اردو کے بہت سے الفاظ کسی زمانے میں سلینگ تھے۔ اس سلسلے میں راقم نے کچھ تفصیلات اور اردو کے سلینگ الفاظ کی کچھ مثالیں اپنی کتاب ''اولین اردو سلینگ لغت'' میں پیش کی ہیں۔

☆ رجسٹر (register)

رجسٹر کی اصطلاح سماجی لسانیات اور اسلوبیات (stylistics) میں استعمال ہوتی ہے۔ رجسٹر سے مراد ہے زبان کی وہ نوع یا ویرائٹی (variety) جس کی بنیاد اس کا خاص صورت حال یا مفہوم میں استعمال ہے [۷۸]۔ مثلاً کوئی لفظ اگر سائنس کی کسی اصطلاح کے مفہوم میں (جیسے ''جوہر'' ایٹم (atom) کے معنی میں) استعمال ہو تو اسے سائنسی رجسٹر کہیں گے، اگرچہ جوہر کے معنی کسی اور صورت حال میں کچھ اور ہوں گے۔ اسی طرح اگر ہم کمپیوٹر کے رجسٹر میں بات کر رہے ہوں تو ''نیٹ ورکنگ'' (networking) کے ایک خاص معنی ہوں گے [۷۹]۔ گویا کسی علم یا شعبے یا موضوع یا صورت حال کا زبان پر ایک خاص اثر پڑتا ہے اور اس وقت نہ صرف ایک خاص قسم کا ذخیرۂ الفاظ استعمال کیا جاتا ہے بلکہ الفاظ کو ایک خاص معنی میں اور خاص انداز میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرح ایک مختلف رجسٹر وجود میں آتا ہے [۸۰]۔

حواشی:

۱۔ طامس رسنٹو (Thomas Ricento)، Models and Approaches in Language Policy and Planning، مشمولہ Handbook of Language and Communication: Diversity and Change (مرتبہ مارلس ہیلنگر و دیگر (Marlis Hellinger Et al)، (برلن: والٹر ڈی گروٹر، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۱۱۔

۲۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language (لندن: پینگوین بکس، ۱۹۹۹ء)، ص ۳۷ [دوسرا ایڈیشن]۔

۳۔ دولسانیت اور اس کی بعض خصوصیات کے لیے ملاحظہ ہو: وکٹوریا فرامکن و دیگر (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language، (میلبرن: تھامسن پبلشنگ، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۳۷۔۳۳۴ [پانچواں ایڈیشن]۔

۴۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language، محولہ بالا، ص ۲۲۴۔

۵۔ اسٹاک ہوم یونی ورسٹی کے پروفیسر ہنرک للیگرین (Henrik Liljegren) گلگت، بلتستان اور چترال اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں کی زبانوں پر تقریباً دس برسوں سے تحقیق کر رہے ہیں اور ان کے دومیلی، گوَرباتی، یِدغا، پالولا اور اِشوجُو نامی زبانوں کے تعارف اور ذخیرۂ الفاظ پر مبنی کام کے اردو میں ترجمے ہو چکے ہیں جو کتابچوں کی صورت میں اسلام آباد سے ایف ایل آئی کے زیر اہتمام شائع ہوئے ہیں۔
دیکھیے: رؤف پاریکھ، How Many Languages Are Spoken in Pakistan?، مطبوعہ روزنامہ ڈان (Dawn)، ۱۳ر مارچ ۲۰۱۷ء، https://www.dawn.com/news/1320097 (رجوع کردہ ۴ر ستمبر ۲۰۲۰ء)۔

۶۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: رؤف پاریکھ، پاکستانی زبانیں اور بولیاں: ایک بنیادی تعارف، مشمولہ اردو، (شش ماہی)، انجمن ترقیٔ اردو، کراچی، شمارہ جولائی۔دسمبر ۲۰۱۸ء، جلد ۹۴، ص ۱۵۶۔۱۲۶

۷۔ وکٹوریا فرامکن و دیگر، (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language، محولہ بالا، ص ۴۱۵ [پانچواں ایڈیشن]۔

۸۔ جوآنا نولین (Joanna Nolan)، The Elusive Case of Lingua Franca: Fact and Fiction، (چیم (سوئزرلینڈ): پیل گریو میکملن، ۲۰۲۰ء)، ص ۴۔

۹۔ ایضاً، ص ۸۔۴۔

۱۰۔ ملاحظہ ہو: Webster's Unabrdiged Dictionary (نیویارک: کولنز ورلڈ، ۱۹۷۶ء) [دوسرا ایڈیشن]۔

۱۱۔ جوآنا نولین (Joanna Nolan)، The Elusive Case of Lingua Franca: Fact and Fiction، محولۂ بالا، ص ۹۶۔

۱۲۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر، (Victoria Fromkin Et al)، محولۂ بالا، ص ۴۱۶؛ نیز Webster's Unabridged Dictionary (نیویارک: کولنز ورلڈ پباشنگ، ۱۹۷۶ء) [دوسرا ایڈیشن]

۱۳۔ پیٹر ٹرچن (Peter Turchin)، Historical Dynamics: Why States Rise and Fall (نیوجرسی: پرنسٹن یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۷۳؛ نیز جوآنا نانولین (Joanna Nolan)، محولۂ بالا، ص ۱۱۔۳

۱۴۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر، (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language، محولۂ بالا، ص ۴۱۶۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ ایضاً۔ یہاں سواحلی زبان سے متعلق کچھ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ سواحل عربی کے لفظ ساحل کی جمع ہے۔ سواحلی زبان کو تقریباً پچاس لاکھ افراد بطور مادری زبان بولتے ہیں، خاص طور پر کینیا اور تنزانیہ میں۔ سواحلی زبان بنیادی طور پر مشرقی افریقا کی بنتو (Bantu) خاندان کی زبانوں میں سے ہے اور اس کے ذخیرۂ الفاظ میں عربی کے الفاظ خاصی تعداد میں شامل ہیں۔ یہ تنزانیہ اور کینیا کی سرکاری زبان بھی ہے۔ یہ پہلے پجن (pidgin) تھی۔ اس کے انگریزی میں ہجے دو طرح کیے جاتے ہیں یعنی Swahili اور Sawahili (تفصیلات کے لیے: ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language، محولۂ بالا نیز پی ایچ میتھیوز (P.H. Matthews)، Oxford Concise Dictionary of Lingiuistics (نیویارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۷ء)۔

۱۸۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر، An Introduction to Language، محولۂ بالا، ص ۴۱۶۔

۱۹۔ ایضاً، ۴۱۶۔

۲۰۔ طامس رسنٹو (Thomas Ricento)، محولۂ بالا، ص ۲۱۱۔

۲۱۔ جینٹ ہومز (Janet Holmes)، An Introduction to Sociolinguistics، (ہارلو: پیئرسن ایجوکیشن، ۲۰۰۱ء)، ص ۹۷ [دوسرا ایڈیشن]۔

۲۲۔ ایضاً۔

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language، محولہ بالا۔

۲۵۔ ایضاً۔

۲۶۔ پاکستان میں اردو کا مسئلہ: ایک تاریخی و تحقیقی مطالعہ (لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۶ء)، ص ۳۵۔

۲۷۔ ایضاً ص ۳۶۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۹۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۹۔

۳۰۔ تفصیلات: رؤف پاریکھ، Proposed Constitutional Amendment Bill and Official Language، مطبوعہ روزنامہ ڈان (Dawn)، ۲۷ ر فروری ۲۰۱۷ء،
https://www.dawn.com/news/1317152/literary-notes (رجوع کردہ ۴ ر ستمبر ۲۰۲۰ء)۔

۳۱۔ رؤف پاریکھ، National Language and Pakistani Languages: the Only Way Out، مطبوعہ روزنامہ ڈان (Dawn)، ۲۳ ر مئی ۲۰۱۷ء
https://www.dawn.com/news/1334755/literary-notes
(رجوع کردہ ۴ ر ستمبر ۲۰۲۰ء)

۳۲۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد (دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء)، ۳۱۔۳۰ [دوسرا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن]۔ یہ اور بات ہے کہ اس زبان کو گل کرسٹ باقی یورپی اہل علم کی طرح ہندوستانی کہتا تھا لیکن اس سے مراد اردو ہی تھی کیونکہ اس وقت تک جو زبان پورے ملک اور عوام میں رائج تھی وہ بالعموم ایک ہی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور وہ عربی فارسی کا رسم الخط تھا۔ ہندی کا جھگڑا تو فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۰۰ء کے بعد دیوناگری رسم الخط کو دوبارہ زندہ کرنے پر اٹھا۔ گل کرسٹ کے بعد جان ٹی پلیٹس نے جب قواعد کی ایک کتاب A Grammar of the Hindustani or Urdu Language لکھی تو اس کے نام سے گویا یہ واضح کر دیا کہ "ہندوستانی" سے مراد "اردو" ہی ہے۔ تفصیلات: رؤف پاریکھ، علم لغت، اصول لغت اور لغات (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۶۳۔

۳۳۔ سید عبداللہ، پاکستان میں اردو کا مسئلہ، محولہ بالا، ص ۷۔

۳۴۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: کے کے عزیز، The Making of Paksitan: a Study in Nationalism (لاہور: اسلامک بک سروس، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۲۹۔۱۲۶ [چوتھا ایڈیشن]۔

۷۵۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر، An Introduction to Language، محولۂ بالا، ص ۱۲، ۴۱، ۵۳۲۔
۷۶۔ ایضاً، ص ۴۲۱۔
۷۷۔ سلینگ اور اس سے متعلقہ مباحث کے لیے ملاحظہ ہو: رؤف پاریکھ، مقدمہ، اولین اردو سلینگ لغت (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۰۶ء)۔ یہاں سلینگ سے متعلق معلومات اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔
۷۸۔ ڈیوڈ کرسٹل، The Penguin Dictionary of Language، محولۂ بالا۔
۷۹۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر، An Introduction to Language، محولۂ بالا، ص ۴۲۳۔
۸۰۔ ایضاً۔

☆......☆......☆

تیرھواں باب: تاریخی لسانیات

زبانوں کے خاندان

ایک دل چسپ وضاحت تاریخی لسانیات کے سلسلے میں پی ایچ میتھیوز (P.H. Matthews) نے اپنی کتاب میں دی ہے۔ اور اس کا مقصد غالباً تاریخی لسانیات اور اس کے ایک اہم جز یعنی زبانوں کے خاندان کے تصور کو موثر طور پر اور آسانی سے بیان کرنا ہے۔

لکھتے ہیں کہ ایک بار میں نے ایک کتاب پڑھی جس میں ایک صاحب کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ اس بات پر بہت حیران تھے کہ تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب اٹلی کے باشندوں نے لاطینی زبان (Latin) جسے وہ صدیوں سے خوشی خوشی استعمال کر رہے تھے استعمال کرنی یک لخت بند کر دی اور اس کی بجاے اطالوی یعنی اٹالین (Italian) بولنا شروع کر دی۔ یہ ان صاحب کے نزدیک ایک راز تھا[1]۔

میتھیوز کے مطابق ہمارے لیے یہ کوئی راز نہیں ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ زبان ہر وقت بدلتی رہتی ہے اور مثلاً قدیم انگریزی یا اولڈ انگلش (Old English) دھیرے دھیرے ارتقا پا کر اور مختلف تاریخی مراحل سے گزر کر جدید انگریزی (modern English) میں تبدیل ہوئی ہے۔ اسی طرح موجودہ اطالوی زبان جو پچھلے تقریباً ایک ہزار سال سے لکھی جا رہی ہے نسل در نسل آہستہ آہستہ تبدیلیوں سے گزرتی ہوئی اُس زبان سے ارتقا پا کر بنی ہے جو لاطینی کہلاتی تھی اور جو کوئی دو ہزار سے ڈھائی ہزار سال قبل بولی جاتی تھی[2]۔ یہ اچانک یا یک لخت نہیں ہوا تھا۔ تاریخ میں ایسا کوئی نقطہ یا خاص وقت نہیں آیا تھا جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ یہاں سے اچانک لاطینی کی بجاے اطالوی بولی جانے لگی[3]۔ یہاں پر ذہن بے اختیار اردو کی

طرف جاتا ہے جس کے بارے میں بعض معصوم لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اردو بھی اسی طرح اچانک مغلوں کی فوج میں مختلف زبانیں بونے والے سپاہیوں کے ملنے سے بن گئی تھی اور اسی لیے اردو لشکری زبان ہے، حالانکہ اس نظریے کی تردید بہت پہلے کی جا چکی تھی[۴]۔ زبانیں اس طرح اچانک نہیں بنا کرتیں نہ اچانک تبدیل ہوتی ہیں۔ زبانوں کے بننے اور بدلنے میں صدیاں لگتی ہیں۔

اردو کی بحث کو موقوف کر کے لاطینی کی طرف واپس آتے ہیں۔ جب لاطینی تبدیل ہونا شروع ہوئی تو یہ مختلف شکلوں میں بٹ گئی۔ لاطینی یوں تو ایک چھوٹی سی ریاست کی زبان تھی جس کا مرکز روم (Rome) تھا لیکن رومی لوگ بڑے زبردست جنگجو تھے اور انھوں نے آج سے کوئی دو ہزار سال قبل ایک عظیم سلطنت بنالی تھی جس میں اٹلی کے علاوہ فرانس، ہسپانیہ (اسپین) اور پرتگال بھی شامل تھے[۵]۔ ان تمام علاقوں میں لاطینی زبان آہستہ آہستہ چھاتی گئی اور مقامی زبانوں کی جگہ لیتی گئی۔ پانچ سو سال کے اندر ہی مختلف علاقوں کی لاطینی میں خاصا فرق آ گیا[۶]۔ اس دوران میں سلطنت زوال سے دوچار ہوگئی اور چونکہ لوگوں کے آپس کے روابط بھی بہت کم ہو گئے تھے اس لیے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی لاطینی بھی اپنے اپنے طور پر تبدیل ہوتی گئی۔ اس طرح وہ زبان جو کبھی ایک اور یکساں تھی اگلے مزید پانچ سو برسوں میں (یعنی ایک ہزار سال کے بعد) مختلف علاقوں میں الگ الگ مقامی روپ اختیار کرگئی[۷]۔ جو علاقے ایک دوسرے سے زیادہ دور تھے ان کی زبان مین فرق بھی زیادہ ہوتا گیا[۸]۔ شمال وسطی اٹلی کے علاقے توسکانا (Tuscan) کی زبان اطالوی بن گئی، فرانس میں پیرس کے آس پاس کے علاقے کی زبان فرانسیسی بنی اور جنوبی ہسپانیہ (اسپین) کے علاقے قشتالہ یا کاستیل (Castile) کی زبان اسپینش یا ہسپانوی بن گئی[۹]۔

گویا لاطینی زبان ہی سے اطالوی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبانیں نکلی ہیں۔ بلکہ پرتگالی اور رومانیائی (Romanian) زبانیں بھی لاطینی سے نکلی ہین۔ یعنی لاطینی ان زبانوں کی "نانی اماں" ہے، اسے جدامجد کہہ لیجیے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ سب ایک خاندان کی زبانیں ہیں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے علمِ حیوانیات میں کہا جاتا ہے کہ شیر، چیتے اور پالتو بلیاں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس خاندان کو cat family کہتے ہیں [۱۰]۔ زبانوں میں اگرچہ اس طرح خاندان نہیں ہوتے جس طرح حیوانات یا انسانوں میں ہوتے ہیں لیکن زبانوں کے آپس کے رشتے کی وضاحت کے لیے ''خاندان'' یا فیملی (family) کا استعارہ استعمال ہوتا ہے۔

☆ تاریخی اور تقابلی لسانیات

زبانوں کی تاریخ اور زبانوں کے خاندانوں کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر زبان وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ان تبدیلیوں کے نتیجے میں زبانیں یکسر تبدیل بھی ہوسکتی ہیں۔ کسی زبان میں ہونے والی ان تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے اس زبان کی تاریخ دیکھی جاتی ہے اور اس کا تقابل اور موازنہ دوسری زبانوں سے بھی کیا جاتا ہے۔ لسانیات کی جو شاخ زبانوں میں ہونے والی ان تاریخی تبدیلیوں کا مطالعہ کرتی ہے اسے تاریخی لسانیات کہا جاتا ہے۔

تاریخی لسانیات (hisotrical linguistics) لسانیات کی وہ شاخ ہے جس کا سروکار یہ ہے کہ زبانیں کیسے تبدیل ہوتی ہیں، یہ تبدیلیاں کیوں ہوتی ہیں اور کس طرح کی ہوتی ہیں۔ اس کو ''تاریخی'' (historical) اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق کسی خاص زبان کی تاریخ سے ہوتا ہے [۱۱]۔ زبانوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے کا ایک شعبہ تقابلی لسانیات (comparative linguistics) کہلاتا ہے کیونکہ زبانوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے تاریخی مطالعے میں زبانوں کا تقابل بھی کیا جاتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ہی خاندان کی زبانوں میں کیا کیا مماثلتیں ہیں اور مختلف زبانوں کے ملتے جلتے الفاظ کا اشتقاق (etymology) اور ان کی اصل کیا ہے [۱۲]۔ اس طرح زبانوں کے کسی خاندان کی اولین یا قدیم ترین صورت یعنی 'پروٹولینگویج' (proto-language) کی بازتخلیق یا تشکیلِ نو کی کوشش کی جاتی ہے [۱۳] (پروٹولینگویج کا ذکر آگے آرہا ہے)۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تاریخی لسانیات (historical linguistics) سے

مراد لسانیات کی تاریخ (history of lingusitics) نہیں ہے، اگرچہ بعض اوقات عام قاری یا طالب علم اس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ تاریخی لسانیات نے علم لسانیات کے ارتقا اور فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے اور انیسویں صدی میں لسانیاتی مطالعے زیادہ تر تاریخی لسانیات تک ہی محدود تھے لیکن تاریخی لسانیات کا دائرۂ کار لسانیات کی تاریخ نہیں ہے[۱۴]۔ یہ بھی درست ہے کہ تاریخی لسانیات کے گہرے اثرات لسانیات سے بڑھ کر سماجی علوم (social sciences) تک بھی پہنچے اور تاریخی لسانیات کے پیش کیے ہوئے تقابلی طریقے (comaparative method) کو انیسویں صدی کی اہم فکری کامیابیوں میں شمار کیا گیا مگر تاریخی لسانیات کا سروکار لسانیات کی تاریخ نہیں ہے[۱۵]۔

ایک اور موضوع جو بالعموم تاریخی لسانیات کے ذیل میں نہیں آتا انسانی زبان کے آغاز اور اصل سے متعلق ہے، یعنی یہ کہ انسان نے کیسے اور کب بولنا شروع کیا اور انسانی زبانیں کیسے وجود میں آئیں۔ اس موضوع پر متنوع نظریات پائے جاتے ہیں لیکن ان کے درست ہونے کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے[۱۶]۔ اگرچہ تاریخی لسانیات کے نظریات اور تحقیقات اس ضمن میں کام آسکتی ہیں کیونکہ انسانی زبانوں کے آغاز و ارتقا سے متعلق زیادہ تر قیاس آرائیوں سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ مگر پھر بھی یہ تاریخی لسانیات کا بنیادی کام نہیں ہے کہ وہ انسان کی زبان کے آغاز کا سراغ لگائے[۱۷] اور یہ معلوم کرے کہ انسان نے کب اور کیسے بولنا شروع کیا۔

ماضی میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ تاریخی لسانیات کا کام صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ زبانیں ''کیسے'' تبدیل ہوتی ہیں لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد لسانیات کے میدان میں ہونے والی عظیم ترقی کے بعد اب یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ زبانیں ''کیوں'' تبدیل ہوتی ہیں لہٰذا اب ہم یہ کہتے ہیں کہ تاریخی لسانیات کا کام یہ ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ زبانیں ''کیسے اور کیوں'' تبدیل ہوتی ہیں[۱۸]۔

ایک غلط فہمی یہ بھی کہ تاریخی لسانیات صرف الفاظ کے اشتقاق (etymology) یا ان کی اصل کا مطالعہ کرتی ہے حالانکہ تاریخی لسانیات کا بنیادی مقصد الفاظ کا اشتقاق معلوم کرنا نہیں ہے اگرچہ کسی لفظ کا ٹھیک ٹھیک اشتقاق تاریخی لسانیاتی تحقیق کے نتیجے میں معلوم

ہو جاتا ہے [۱۹]۔

دراصل تاریخی لسانیات کا مقصد کسی زبان یا کسی لفظ میں ہونے والی تاریخی تبدیلیوں کا سراغ لگانا ہے اور چونکہ اس تلاش میں لفظوں کا اشتقاق اور ان کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی ظاہری صورت (یعنی املا اور تلفظ) اہم کردار ادا کرتے ہیں لہٰذا ان کا مطالعہ لامحالہ کرنا پڑتا ہے اگرچہ یہ تاریخی لسانیات کا اصل یا بنیادی مقصد نہیں ہوتا۔

☆ پروٹولینگویج یا قبل ترین زبان

پروٹولینگویج (proto-language) کو اردو میں ''ماقبل زبان''[۲۰] اور ''قبل ترین زبان''[۲۱] کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اسے بعض کتابوں میں مادر زبان (mother language) یعنی زبانوں کی امّاں زبان بھی کہا گیا ہے (لیکن اس اصطلاح کے ایک دوسری اصطلاح یعنی مادری زبان یا mother tongue سے گڈ مڈ کیے جانے کا خطرہ ہے لہٰذا ہم اسے قبل ترین زبان یا پروٹو لینگویج ہی کہیں گے)۔

کسی زبان کی قدیم ترین یا اولین صورت کو 'پروٹولینگویج' (proto-language) کہتے ہیں۔ 'پروٹو' (proto) کے لفظی معنی ہیں اولین، ابتدائی، اصلی یا اوّل شے جس سے کوئی اور چیز نکلے یا بنائی جائے۔ اسی لیے پروٹو ٹائپ (prototype) کسی چیز کے اس نقشِ اول یا ابتدائی نمونے کو کہتے ہیں جسے بعد میں ارتقا دے کر اس چیز کو نئی صورت میں لایا جاتا ہے۔ پروٹولینگویج یا قبل ترین زبان سے مراد ہے ایک ایسی قدیم ترین زبان جس سے مختلف زبانیں مختلف زمانوں میں نکلی ہوں۔ پروٹولینگویج ان زبانوں کا اولین نمونہ یا ابتدائی صورت ہوتی ہے جس سے کچھ اور زبانوں نے ارتقا پایا ہو۔ گویا کئی زبانوں پر مشتمل زبانوں کے کسی خاندان کا قدیم ترین جدِ امجد پروٹولینگویج ہوتا ہے[۲۲]۔ چونکہ اردو میں لفظ ''زبان'' کو ہم مونث کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو یوں سمجھ لیجیے کہ یہ کئی زبانوں کی نانی ہوتی ہے۔ قبلِ تاریخ کے دور کی کئی زبانوں کے نام کے حصے کے طور پر ''پروٹو'' یا ''پروٹولینگویج'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، جیسے پروٹو انڈو یوروپین

(proto-Indo-European) یا پروٹو جرمینک (proto-Germanic)[۲۳]۔

پروٹولینگو یج یا قبل ترین زبان دو طرح کی ہوتی ہے، مصدقہ (attested) اور غیر مصدقہ (unattested):

ا۔ مصدقہ قبل ترین زبان (attested proto-language)

مصدقہ قبل ترین زبان وہ ہوتی ہے جو کسی زمانے میں ایک حقیقی زبان کے طور پر موجود تھی اور جس سے دوسری زبانیں نکلی ہیں، جیسا کہ یورپ کی کئی زبانوں مثلاً فرانسیسی، ہسپانوی، اطالوی اور دیگر رومانس (Romance) زبانوں کے بارے میں شواہد پہلے سے موجود تھے کہ یہ لاطینی زبان سے نکلی ہیں۔ گویا لاطینی زبان ان زبانوں کی پروٹولینگو یج ہے اور لاطینی مصدقہ ہے[۲۴] (یعنی اس کے وجود کا ثبوت موجود ہے)۔

۲۔ غیر مصدقہ قبل ترین زبان (unattested proto-language)

غیر مصدقہ قبل ترین زبان وہ ہوتی ہے جس کے بارے میں ماہرین نے داخلی شواہد کی بنیاد پر اندازہ لگایا ہو کہ یہ زبان کسی زمانے میں موجود رہی ہوگی اگرچہ اس کی پوری طرح سے تصدیق نہیں کی جاسکتی یعنی اس کے وجود کا یقینی ثبوت نہیں ہوتا۔ البتہ اس سے نکلی ہوئی زبانیں مصدقہ (attested) ہوتی ہیں[۲۵]۔

☆ زبانوں کے خاندان

دنیا کی زبانوں کی تاریخ کے سائنسی مطالعے کا آغاز اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہوا جب ماہرین نے مختلف زبانوں کے گروہوں کا باقاعدہ اور تفصیلی موازنہ کرنا شروع کیا تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ آیا ان میں کچھ مماثلتیں ہیں[۲۶]۔ انیسویں صدی میں تاریخی لسانیاتی مطالعات میں ایک اصطلاح ''مشترک جدِ امجد'' (common ancestor) کی استعمال ہونے لگی اور اس سے مراد تھی کسی زبان کی کوئی ایسی اصلی اور قدیم شکل یا ''پروٹو'' (proto) جس سے جدید زبانیں نکلی ہوں گی[۲۷]۔ ماہرین کا خیال تھا کہ اگر مختلف زبانوں میں پائی جانے والی مماثلتوں کو واضح طور پر پیش کیا جائے تو یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا آپس میں کوئی رشتہ ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا

جا سکتا ہے کہ یہ زبانیں ایک ہی اصل اور بنیاد سے نکلی ہیں اور یہ اصل یا بنیاد کوئی قدیم زبان یا قبل ترین زبان یعنی پروٹو لینگوئج (proto-language) ہوگی، چاہے وہ اصل اور بنیاد یعنی پروٹو لینگوئج اب وجود رکھتی ہو یا تاریخ دھندلکے میں گم ہو چکی ہو اور اس کی بازیافت اور باز تخلیق یا تشکیلِ نو اَب ناممکن ہو[۲۸]۔

لاطینی زبان کے بعض یورپی زبانوں (مثلاً فرانسیسی اور ہسپانوی وغیرہ) کے جدِامجد یا پروٹو لینگوئج ہونے کے نظریے کا اطلاق زبانوں کے بڑے گروہوں پر کیا گیا اور انیسویں صدی کے آغاز میں ایسے قائل کرنے والے ثبوت مل گئے جن کی بنیاد پر یہ نظریہ قائم کیا جا سکے کہ کسی زمانے میں ایک ایسی زبان وجود رکھتی تھی جس سے ایشیا اور یورپ کی کئی زبانیں نکلی تھیں اگرچہ وہ اب معدوم ہو چکی ہے۔ اس پروٹو زبان کا نام قبل ترین ہند یورپی یا پروٹو انڈو یورپین (Proto-Indo-European) پڑ گیا۔ اسی اصول اور تکنیک کی بنیاد پر جلد ہی زبانوں کے دوسرے گروہوں کے مطالعے کا آغاز ہو گیا[۲۹]۔

زبانوں کے تاریخی رشتوں کی وضاحت کے لیے جو استعارہ استعمال کیا جاتا ہے وہ ''خاندان'' کا استعارہ ہے۔ اسے زبانوں کا شجرہ بھی کہتے ہیں[۳۰]۔ مثال کے طور پر لاطینی زبان کو کئی یورپی زبانوں کی ''امّاں'' مانا جاتا ہے اور اس طرح فرانسیسی اور ہسپانوی اس کی ''بیٹیاں'' ہیں۔ گویا فرانسیسی اور ہسپانوی زبانیں آپس میں ''بہنیں'' کہلائیں گی[۳۱]۔

اسی تکنیک کو اختیار کرتے ہوئے زیادہ بڑے گروہ کا مطالعہ کیا جائے تو زبانوں کے ہند یورپی خاندان یا انڈو یورپین فیملی (Indo-European family) کے خاندانی شجرے میں ایک پروٹو انڈو یورپین زبان ہے جو اس خاندان کی ''اوّلین یا قدیم ترین بزرگ زبان'' ہے اور اس کی بیٹیاں لاطینی، یونانی اور سنسکرت ہیں۔ پھر ان زبانوں یعنی لاطینی یا سنسکرت وغیرہ سے نکلی ہوئی زبانیں ان زبانوں (لاطینی یا سنسکرت) کی بیٹیاں ہیں[۳۲]۔ بات کو سمجھنے کے لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پروٹو انڈو یورپین نانی ہے، لاطینی اور سنسکرت اس کی بیٹیاں ہیں اور ان سے نکلی ہوئی جدید زبانیں پروٹو انڈو یورو پین کی نواسیاں ہیں۔ اسی مشترک خاندان اور اس کے خاندانی اثرات کی

وجہ سے سنسکرت اور اطالوی زبان میں بعض الفاظ حیرت انگیز طور پر مشابہ ہیں اور کم وبیش اسی مفہوم میں مستعمل ہیں[۳۳]۔ مثال کے طور پر سنسکرت میں سانپ کو "سرپ" کہتے ہیں اور اطالوی میں serpe اور اسی طرح سنسکرت میں سات کے لیے "ستَّ" کا لفظ ہے جبکہ اطالوی میں سات کے لیے sapta ہے[۳۴]۔ اس طرح کی مشابہت اور زبانوں کے خاندانی رشتوں کا ذکر ولیم جیمز نے بھی کیا تھا[۳۵]۔

جب انگریزی زبان کی اصل اور جڑ کا سراغ لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا تعلق انڈو یورپین یا ہندیورپی زبانوں کی ایک شاخ سے ہے جسے قبل ترین المانی یا پروٹو جرمینک (Proto-Germanic) کہا جاتا ہے (المانی ترجمہ ہے Germanic کا)۔ لیکن پروٹو جرمینک پر کہانی کا اختتام نہیں ہوتا بلکہ دوسو سال کی تحقیق سے انکشاف ہوا کہ پروٹو جرمینک تو خود کسی زمانے میں ایک بولی یا ڈائیلکٹ (dialect) تھی اور یہاں سے تو کہانی کا آغاز ہوتا ہے[۳۶]۔ پروٹو جرمینک کی مختلف بولیاں ہزاروں سال کے ارتقا کے بعد مختلف یورپی زبانیں بن گئیں اور انگریزی بھی ان میں سے ایک ہے۔ پروٹو جرمینک کی دوسری زبانوں میں جرمن، سویڈش، نارویجین، ڈینش، یِدش (Yiddish) (اس کا ایک تلفظ "اِدِش" بھی ہے) اور یورپ کی بعض دوسری زبانیں شامل ہیں[۳۷]۔

☆ زبانوں کے خاندان کے ضمن میں اہم باتیں

زبانوں کے خاندان (family of languages) کے ضمن میں بعض اہم باتیں یادرکھنی ضروری ہیں:

(۱) زبانوں کے بڑے خاندانوں کے شجرے کی شاخیں ہوتی ہیں اور ان شاخوں میں کئی زبانیں یا ذیلی خاندان بھی ہوتے ہیں[۳۸]۔

(۲) اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ "نانی" یا "اماں" یا "بیٹی" یہاں محض استعارے ہیں اور ان کو لفظی معنوں میں استعمال کرنا یا یہ سمجھنا کہ زبانیں بھی انسانوں کی طرح اچانک پیدا ہو جاتی ہیں درست نہ ہوگا۔ نیز یہ کہ انسانوں کے برعکس "اماں زبان" عام طور پر "بیٹی زبان" کی "پیدائش" کے بعد زندہ نہیں رہتی[۳۹]۔

(۳) اسی طرح یہ سمجھنا بھی درست نہ ہوگا کہ جب زبانوں کے خاندان کی شاخیں ارتقا پاتی ہیں تو ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو کر آزادانہ نشوونما پاتی ہیں اور ان کا آپس میں کوئی میل ملاپ نہیں رہتا[۴۰]۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ زبانیں ایک نقطے سے منتشر ہو کر مختلف سمتوں میں جاتی ہیں اور یہ پھر کسی نقطے پر آ کر مرتکز بھی ہو جاتی ہیں[۴۱]۔

(۴) زبانوں کے ارتقا کے مراحل اتنے سادہ اور واضح نہیں ہوتے جتنے بظاہر نظر آتے ہیں، جیسے کسی زبان کا شجرہ دیکھ کر ذہن میں خیال ابھرتا ہے کہ فلاں زبان سے فلاں زبان بن گئی اور پھر اس سے فلاں زبان نکلی اور اس سارے عمل میں تمام مراحل یکساں طور پر اور آسانی سے طے ہو گئے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ دراصل زبان میں ہونے والے تغیرات اور تبدیلیاں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں، مثلاً صرفی، نحوی، صوتیاتی اور لغوی تبدیلیاں نیز مختلف علاقوں اور طبقات کے لوگ ان تبدیلیوں میں مختلف کردار ادا کرتے ہیں[۴۲]۔ ان تبدیلیوں میں سے بعض کا مطالعہ سماجی لسانیات، لسانی تغیر اور صوتی تبدیلیوں کے ذیل میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ صرفی، نحوی، صوتی اور معنوی و لغوی تبدیلیوں کو تاریخی لسانیات کے تناظر میں کس طرح دیکھا جاتا ہے، یہ ایک الگ اور طویل بحث ہے[۴۳]۔

(۵) اگرچہ ''خاندان'' (family) کی اصطلاح اب بھی لسانیات میں مستعمل ہے لیکن یہ اس صورت میں استعمال ہوتی ہے جب زبانوں کے درمیان رشتے کا واضح لسانی ثبوت موجود ہو لیکن اگر یہ رشتہ قریبی نہ ہو یا اس کا ہونا زیادہ یقینی نہ ہو تو خاندان کی بجائے ''فائلم'' (phylum) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے[۴۴]۔ فائلم کے لیے اردو میں کوئی لفظ متفقہ طور پر مستعمل نہیں ہے، اسے ''نژاد'' یا ''قبیلہ'' کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آسٹریلیا کے قدیمی باشندوں کی مقامی یا دیسی زبانیں، جنھیں انگریزی میں ''ایب اوریجنل'' (aboriginal) کہا جاتا ہے، زیرِ بحث آتی ہیں تو ماہرین اس گروہ کو خاندان (family) کہنے کی بجائے اسے فائلم (phylum) یعنی قبیلہ یا

''میکروفائلم''(macro-phylum) یعنی بڑا قبیلہ کہتے ہی [۴۵]۔

☆ تقابلی طریقہ

زبانوں کے باہمی تاریخی رشتے کو ثابت کرنے کے لیے تاریخی لسانیات میں تقابلی طریقہ (comparative method) استعمال ہوتا ہے۔ اس کے لیے ماہرین زبانوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کی مختلف صورتوں اور مماثلتوں کی نشان دہی کر کے ان زبانوں کے ابتدائی مرحلوں سے متعلق نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل سے اس اصلی یا قدیم زبان (پروٹولینگوتج) کو''دوبارہ تخلیق''(recreate) کیا جاسکتا ہے جس سے یہ سب زبانیں نکلی ہوں گی [۴۶]۔ اس عمل کو داخلی بازتخلیق یا داخلی بازتشکیل(internal reconstruction) کہا جاتا ہے اور اس کے لیے ان زبانوں کے تاریخی شواہد کے استعمال کیے جاتے ہیں [۴۷]۔ اس طریقے میں اس ممکنہ تاریخی پروٹولینگوتج سے نکلنے والی حقیقی زبانوں کی شکلوں پر غور کیا جاتا ہے [۴۸]۔ اس تاریخی تقابلی طریقے کے دو پہلو ہیں: ایک تو یہ کہ تاریخی لسانی شواہد کی بنیاد پر ان دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے الفاظ یا الفاظ کے اجزا کا موازنہ کیا جاتا ہے جن کے درمیان تاریخی خاندانی رشتے پائے جانے کا امکان ہوتا ہے۔ یہ گویا کسی زبان کی تاریخ کا سراغ لگانے کے عمل کا حصہ ہے [۴۹]۔ داخلی بازتشکیل یا داخلی بازتخلیق کے اس عمل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے صرف زبانوں کے باہمی رشتے ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ یہ علم بھی ہوسکتا ہے کہ ان زبانوں کی قدیم شکل وصورت کیا تھی [۴۹]۔ تاریخی لسانیات کے اس عملِ داخلی بازتشکیل کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اس کے نتائج واثرات دوررس اور لسانیات کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی ہوسکتے ہیں کیونکہ ان تاریخی لسانی روابط سے ان زبانوں کے بولنے والوں کی قدیم تاریخ، قدیم سماج اور ان کے قدیم ثقافتی حالات کا بھی علم ہوتا ہے [۵۰]۔

☆ کثیر زمانی اور یک زمانی مطالعہ

جدید لسانیات کے بانی فرڈینڈ ڈی سوسیئر (Ferdinand de Saussure) نے

تاریخی اور غیر تاریخی لسانیات میں واضح طور پر امتیاز کیا اور کہا کہ تاریخی لسانیات زبان کو ایک مسلسل تبدیل ہوتے ہوئے ذریعے (medium) کے طور پر دیکھتی ہے جبکہ غیر تاریخی لسانیات زبان کو ایک خاص وقت اور خاص حالت میں دیکھتی ہے [۵۱]۔ تاریخی لسانیات کا مطالعہ وہ راستہ ہے جس سے کوئی زبان گزر کر آئی ہے کیونکہ تاریخی لسانیات زبان کی حالت مختلف زمانوں میں دیکھتی ہے۔ زبانوں میں وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ تاریخی لسانیات کا کام ہے۔ چونکہ اس مطالعے کا تعلق مختلف زمانوں سے ہوتا ہے لہٰذا اسے عصریاتی یا کثیر زمانی (diachronic) مطالعہ کہتے ہیں [۵۲]۔ اگر زبان کا مطالعہ کسی ایک زمانے یا کسی ایک مخصوص دور، بالخصوص زمانۂ حال، میں کیا جائے تو اسے عصری یا یک زمانی (synchronic) مطالعہ کہتے ہیں [۵۳]۔

عصریاتی یا کثیر زمانی مطالعے میں کسی زبان کی تاریخ کے مختلف ادوار کے نمونے تجزیے کے لیے درکار ہوتے ہیں جبکہ عصری یا یک زمانی مطالعے میں صرف کسی ایک دور یا دور حاضر کی زبان کے نمونے لیے جاتے ہیں [۵۴]۔ یک زمانی مطالعے میں اس زبان کی تاریخ کو مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ دراصل یک زمانی مطالعے کا آغاز ٹیپ ریکارڈر کی ایجاد کے بعد ہوا جب آوازوں کو محفوظ کرنا ممکن ہو گیا اور ولیم لیبوو (William Labov) نے اس طریقِ کار کا آغاز کیا [۵۵]۔

لیکن یک زمانی مطالعہ تاریخی لسانیات کے ذیل میں نہیں ہے بلکہ یہ توضیحی یا تشریحی لسانیات (descriptive linguistics) کا حصہ ہے جبکہ عصریاتی یا کثیر زمانی مطالعہ اگر کسی ایک زبان میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں کا ہو تو اسے تاریخی لسانیات کہتے ہیں اور اگر اس مطالعے کے دوران اس زبان کا موازنہ و مطالعہ اس زبان سے نسلی تعلق رکھنے والی دوسری زبانوں سے کیا جائے تو یہ تقابلی لسانیات (comparative linguistics) کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے [۵۶]۔ اسی لیے بعض اوقات تاریخی لسانیات کو کثیر زمانی لسانیات (diachronic linguistics) بھی کہا جاتا ہے [۵۷]۔

سوسیئر کا خیال تھا کہ زبان کے کثیر زمانی مطالعے سے قبل یک زمانی مطالعہ لازماً کرنا چاہیے کیونکہ یہ کہنے سے قبل کہ فلاں زبان 'حالت الف' سے 'حالت ب' تک پہنچی ہے ہمیں یہ جاننا

چاہیے کہ 'حالت الف' اور 'حالت ب' ہیں کیا، جبکہ یک زمانی مطالعہ تاریخی مطالعے کے بغیر بھی ہوسکتا ہے[۵۸]۔

دوسرے لفظوں میں سوسئیر کا کہنا ہے کہ تاریخی لسانیات سے قبل ہمیں تشریحی یا توضیحی لسانیات (جسے انگریزی میں descriptive linguistics کہا جاتا ہے) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں سوسئیر شطرنج کی ایک بازی کی مثال دیتا ہے کہ اگر کسی کمرے میں شطرنج کی بازی کھیلی جارہی ہو اور آپ اس کمرے میں داخل ہوں تو بساط کو دیکھ کر آپ کھیل کی صورت حال کا اندازہ لگالیں گے[۵۹]۔ اس سے سوسئیر کی مراد یہ ہے کہ آپ کو بازی کی موجودہ صورت حال سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ فریقین نے مختلف مراحل پر کون سی مختلف چالیں چلی تھیں اور بازی کن مراحل سے گزر کر موجودہ حالت تک پہنچی ہے[۶۰]۔ لیکن اگر آپ ماضی کی چالوں سے موازنہ کرنا چاہیں تو یہ اُس وقت ہوسکے گا جب آپ ماضی کی صورت حال اور موجودہ صورت حال دونوں کو سمجھیں۔ اس مثال کا اطلاق زبان پر کیا جائے تو گویا ہمیں پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ کسی زبان کی صرفی، نحوی، لغوی اور صوتیاتی خصوصیات موجودہ زمانے میں کیا ہیں اور پھر اس کے ماضی سے اس کا تقابل کیا جاسکتا ہے، یعنی تاریخی لسانیات یا کثیر زمانی لسانیات کو سمجھنے کے لیے تشریحی لسانیات پہلے پڑھنا ضروری ہے۔ لیکن موجودہ صورت حال جاننے کے لیے یا دوسرے لفظوں میں تشریحی لسانیات کو سمجھنے کے لیے ماضی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ اردو میں لسانیات کی تدریس: ایک بنیادی غلطی

ہمارے ہاں ایک عام خیال یہ ہے کہ تاریخی لسانیات سے چونکہ زبان کی تاریخ کا علم ہوتا ہے لہٰذا پہلے تاریخی لسانیات پڑھی جائے اور ہماری جامعات میں بالعموم پہلے تاریخی لسانیات پڑھائی جاتی ہے یعنی جس معصوم طالب علم کو یہی نہیں معلوم کہ ڈائیلکٹ کیا ہوتا ہے، زبانوں کا خاندان کیا ہوتا ہے، پروٹولینگوئج کس کو کہتے ہیں، پروٹولینگوئج سے زبانیں نکلتی ہیں یا نہیں اور اردو کی پروٹولینگوئج کیا ہوسکتی ہے، اسے پہلے ہی دن سے یہ پڑھایا جاتا ہے کہ اردو پنجابی سے نکلی یا نہیں نکلی اور اردو کا خاندان چونکہ آریائی ہے اور دکن کے دراوڑی خاندانِ السنہ سے الگ ہے اس

لیے وہ دکن میں پیدا ہوسکتی تھی یا نہیں، کھڑی بولی اور برج بھاشا کیا ہیں اوران کی صوتیاتی اور مارفیمیاتی خصوصیات کیا ہیں، اردو کھڑی بولی سے نکلی یا نہیں، وغیرہ۔ گویا جس بے چارے کو لسانیات کی اُن بنیادی اصطلاحات کا بھی علم نہیں ہے جو تشریحی لسانیات (یعنی مارفیمیات، صوتیات، معنویات اور فونیمیات وغیرہ) میں استعمال ہوتی ہیں اسے آپ تاریخی لسانیات پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جس کو یک زمانی مطالعے کا کوئی علم نہیں ہے اس کی لسانیات کی تعلیم کا آغاز ہمارے ہاں کثیر زمانی مطالعے سے کیا جاتا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کسی کو الجبرا کے پیچیدہ مسائل پہلے بتائے جائیں پھر اسے بنیادی حساب پڑھایا جائے۔

راقم کے خیال میں اردو میں لسانیات کے غیر مقبول ہونے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مباحث جو تاریخی اور تقابلی لسانیات سے متعلق ہیں اور جس میں تشریحی لسانیات کی بھی اصطلاحات آتی ہیں ان سے لسانیات کی تدریس کا آغاز ہوتا ہے اور طالب علم بے چارہ غالب کے اس مصرعے کی تصویر بن جاتا ہے کہ:

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اور کچھ عرصے تک ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد غالب ہی کے الفاظ میں کہتا پایا جاتا ہے کہ:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اِک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

اور آخر کار لسانیات کو داغِ مفارقت دے جاتا ہے یا مارے باندھے، بغیر سمجھے پڑھ لیتا ہے کہ ڈگری بھی تو لینی ہے۔

حواشی:

۱۔ Lingusitics: A Very Short Introduction ، (کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء)، ص۴۵ [پاکستانی ایڈیشن]۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ اردو کے لشکری زبان ہونے کے غلط نظریے کے خلاف جو دلائل مختلف ماہرین نے دیے ہیں ان کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: رؤف پاریکھ، اردو لشکری زبان ہرگز نہیں ہے، مشمولہ لسانیاتی مباحث (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۹ء) [اشاعتِ ثانی]، ص۲۶۔۹

۵۔ پی ایچ میتھیوز، ۔Lingusitics: A Very Short Introduction، محولۂ بالا، ص۴۵۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ ایضاً، ص۴۶۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر، (Victoria Fromkin Et al)، An Introduction to Language، (میلبرن: تھامسن، ۲۰۰۵ء) [پانچواں ایڈیشن]، ص۴۵۸۔

۱۲۔ ایضاً، ص۴۷۶۔

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ لائل کیمبل (Lyle Campbell)، Historical Lingusitics: An Introduction، (کیمبرج (میساچوسٹس): ایم آئی ٹی پریس، ۲۰۰۴ء) [دوسرا ایڈیشن]، ص۲۔

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ ایضاً، ص۲۔۱

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ ایضاً، ص۶۔۲

۲۰۔ مثلاً: فرہنگِ اصطلاحاتِ لسانیات (اردو۔انگریزی)، (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۷ء)۔

۲۱۔ مثلاً: الٰہی بخش اختر اعوان، کشاف اصطلاحاتِ لسانیات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء)

۲۲۔ پروٹو لینگوتج اور اس کے بارے میں وضاحت و تفصیل مختلف کتابوں سے ماخوذ ہے، مثلاً: ڈیوڈ

کرسٹل (David Crystal)، The Penguin Dictionary of Language (لندن: پینگوِن بکس،۱۹۹۴ء)؛ پی ایچ میتھیوز (P.H.Mathews)، Oxford Concise Dictionary of Linguistics (نیو یارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۷ء)۔

۲۳۔ پروٹو جرمینک کے بارے، میں تفصیلات کے لیے دیکھیے: ایڈورڈ فنیگن (Edward Finegan)، Language: Its Structure and Use (اور لینڈو: ہارکورٹ برس، ۱۹۹۹ء) [تیسرا ایڈیشن]، ص ۴۷۶۔۴۷۲

۲۴۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء) [اشاعتِ نو] ص ۲۹۲۔

۲۵۔ پی ایچ میتھیوز (P.H.Mathews)، Oxford Concise Dictionary of Linguistics، محولہ بالا، ص ۳۰۲۔۳۰۱

۲۶۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language، محولہ بالا، ص ۲۹۲۔

۲۷۔ جارج یول (George Yule)، The Study of Language، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۳ء) [اشاعتِ نو]، ص ۱۶۹۔

۲۸۔ یہاں اس خیال کو اجمالاً پیش کیا گیا ہے لیکن اس کا تفصیلی ذکر کئی کتابوں میں موجود ہے، مثلاً: ڈونلڈ رِنج و دیگر (Donald Ringe, Et al)، From Proto-Indo-European to Proto-Germanic (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء)، بالخصوص دوسرا باب؛ نیز ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language، محولہ بالا، ص ۲۹۲۔

۲۹۔ اس کی تفصیل کئی کتابوں میں مل سکتی ہے، مثلاً انڈو یورپین کی باز تخلیق یا باز تشکیل کے ایک مختصر جائزے کے لیے دیکھیے: ایڈرین اکماجین (Adrian Akmajian)، Lingusitics: An Introduction to Language and Communication، (کیمبرج (میساچوسٹس): ایم آئی ٹی پریس، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۲۸۔۳۱۵

۳۰۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language، محولہ بالا، ص ۲۹۲۔

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ ایضاً۔

۳۳۔ ڈونلڈ جی ایلس (Donald G. Ellis)، From Language to Communication

(نیویارک: روٹلج، ۱۹۹۹ء)، ص۸[اشاعتِ ثانی]؛ نیز ماریو پی (Mario Pei)، The Story of Language (نیویارک: نیوامریکن لائبریری، ۱۹۶۶ء)، فصل چہارم۔

۳۴۔ ڈونلڈ جی ایلس (Donald G. Ellis)، From Language to Communication، محولہ بالا، ص۸۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ آر ایل ٹراسک (R.L.Trask)، Language: The Basics، (لندن: روٹلج، ۲۰۰۴ء) [دوسرا ایڈیشن]، ص۱۱۳۔۱۰۸

۳۷۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language، محولہ بالا، ص۲۹۲۔

۳۸۔ ایضاً۔

۳۹۔ ایضاً۔

۴۰۔ ایضاً۔

۴۱۔ ایضاً۔

۴۲۔ ایضاً۔

۴۳۔ ہینس ہنرک ہاک (Hans Henrich Hock) نے اپنی ضخیم کتاب Principles of Historical Linguistics میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (برلن: موتون دی گروتر، ۱۹۹۱ء) [دوسرا ایڈیشن]

۴۴۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language محولہ بالا، ص۲۹۲۔

۴۵۔ ایضاً۔

۴۶۔ ایضاً۔

۴۷۔ انتھونی فوکس (Anthony Fox)، Linguistic Reconstruction: An Introduction to Theory and Method (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء)، ص۷۔۱

۴۸۔ ایضاً۔

۴۹۔ ایضاً۔

۵۰۔ ایضاً۔

۵۱۔ اینڈریو ریڈفورڈ و دیگر (Andrew Redford Et al)، Linguitics: Introduotion، (کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء) [دوسرا ایڈیشن]، ص۱۵،۱۶؛ نیز گیان چند جین، عام

لسانیات، (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص۲۱۔

۵۲۔ اینڈریو ریڈفورڈ، Linguitics: Introduction، محولۂ بالا، ص،۱۶۔

۵۳۔ ایضاً۔

۵۴۔ اینڈریو ریڈفورڈ، Linguitics: Introduction ، محولۂ بالا، ص۱۶۔

۵۵۔ ایضاً۔

۵۶۔ گیان چند جین، عام لسانیات، محولۂ بالا، ص۲۲۔

۵۷۔ مثلاً ونفرڈ پی لیہمن (Winfred P. Lehman) نے تاریخی لسانیات پر اپنے ایک مقالے کا عنوان ہی Introduction: Diachronic Linguistics رکھا ہے، مشمولہ Perspectives on Historical Linguistics (مرتبہ ونفرڈ پی لیہمن) (ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء)، ص۱۶۔۱

۵۸۔ بحوالہ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal)، Cambridge Encyclopedia of Language، محولۂ بالا، ص ۴۰۷۔

۵۹۔ ایضاً۔

۶۰۔ ایضاً۔

☆......☆......☆

چودھواں باب: نفسیاتی لسانیات

ذہن اور زبان

علم لسانیات کی جن شاخوں سے حالیہ برسوں میں ماہرین کی دل چسپی بڑھی ہے ان میں نفسیاتی لسانیات بھی شامل ہے۔اس مقالے کا مقصد لسانیات کی اس نسبتہً نئی شاخ کا تعارف کرانا ہے تا کہ ہمارے نو جوان طالب علم اس کی طرف راغب ہو کر اردو میں اس موضوع پر کچھ تحقیقی کام کریں۔

☆ نفسیاتی لسانیات (psycholinguistics)

نفسیاتی لسانیات یا سائیکو لِنگ وِسٹکس (psycholinguistics) کا علم دراصل زبان اور انسانی ذہن کے درمیان تعلق کو دریافت کرتا ہے[1]۔نفسیاتی لسانیات کا کام یہ ہے کہ وہ یہ سراغ لگانے کی کوشش کرے کہ انسانی ذہن لسانی مہارت کو کیسے تشکیل دیتا ہے اور انسانی ذہن کی قوت یا اس کم زوری ترسیل وابلاغ کی صلاحیت پر کیسے اثر انداز ہوتی ہے[2]۔انسانی ذہن نہ صرف زبان کو سیکھنے، سمجھنے اور اسے محفوظ کرنے کی قوت رکھتا ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر اس محفوظ ذخیرے تک رسائی حاصل کر کے صورت حال کے مطابق اسے استعمال کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور نفسیاتی لسانیات اسی لسانی سرگرمی اور مہارت کا مطالعہ کرنے اور اسے سمجھنے کا نام ہے[3]۔

اس نظریے سے کہ زبان دراصل ذہن اور ذہنی عمل کی پیداوار ہے، نفسیاتی لسانیات کے سامنے دو مقاصد آتے ہیں:

۱۔ جس ذہنی عمل کے نتیجے میں زبان کا نظام کام کرتا ہے اس کی تہہ میں کارفرما عوامل کو سمجھنا۔

۲۔ زبان کو ذہن کی پیداوار سمجھتے ہوئے ان طریقوں کا معائنہ کرنا جن کے تحت انسان

اپنے خیالات کو مرتب و منظم کرتا ہے اور اپنے تجربات کو کسی خاص انداز میں ڈھالتا ہے۔[۴]

☆ نفسیاتی لسانیات کا دائرۂ کار

نفسیاتی لسانیات کے دائرۂ کار اور اس کے مباحث کا اندازہ ان موضوعات سے ہوسکتا ہے جن سے یہ علم بحث کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ حسبِ ذیل ہیں:[۵]

بچہ زبان کیسے سیکھتا ہے؟ پیدائشی طور پر قوتِ سماعت سے محروم بچوں کو زبان کیسے سکھائی جائے؟ (جو بچہ پیدائشی طور پر سماعت سے محروم ہوتا ہے اس کے گویائی سے محروم ہونے یا بولنے میں مسائل کا شکار ہونے کا بھی امکان ہوتا ہے، گو اب جدید علاج سے یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں رہا ہے جتنا ماضی میں تھا)، بعض لسانی نقائص یا اختلال مثلاً ہکلاہٹ یا دماغ پر چوٹ لگنے کے سبب ہونے واقع والے فتورِ گویائی (جسے افیزیا (aphasia) کہتے ہیں) کا علاج کیسے کیا جائے؟ نیز پڑھتے وقت الفاظ کے گڈمڈ نظر آنے سے پڑھنے میں دشواری یا عسر خوانی (جسے ڈِسلیکسیا (dyslexia) کہتے ہیں) کو کیسے دور کیا جائے؟ جو بچے ایک سنسان و ویران مقام پر الگ تھلگ رکھے جائیں کیا وہ بولنا سیکھیں گے؟ جانوروں کی زبان کی صلاحیت کیا ہوتی ہے؟ کیا بندروں کو کوئی زبان سکھائی جا سکتی ہے؟ زبانِ اول[۶] (fisrt language) اور زبانِ دوم (second language) کے اکتساب (acquisition) کے کیا طریقے اور کیا مسائل ہیں؟ زبانِ دوم کی تدریس کیسے کی جائے؟ دو لسانیت (bilingualism) کیا ہے؟ اور اس کے فوائد و نقصانات کیا ہیں؟ زبان اور ثقافت (culture) کا کیا تعلق ہوتا ہے؟ زبان کا تصور اور اس کی صلاحیت ہمارے ذہن میں اور لاشعور میں پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے یا نہیں؟ زبان کی پیدائشی صلاحیت اور قواعد کے ضمن میں نوم چومسکی (Noam Chomsky) کے نظریات کیا ہیں اور کس حد تک درست ہیں؟ یہ اور اس طرح کے دیگر موضوعات، مباحث اور مسائل نفسیاتی لسانیات کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں عام طور پر ملتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض موضوعات پر مختلف نظریات اور اختلافی آرا موجود ہیں لیکن

مغرب میں ان پر مسلسل تحقیق بھی جاری ہے۔

☆ نفسیاتی لسانیات کے تحقیقی مباحث

لیکن ان بنیادی تصورات سے اوپر کی سطح پر نفسیاتی لسانیات کی تحقیق کے بنیادی طور پر چھے (۶) دائرے ہیں اور ان میں سے کچھ ایک دوسرے کی حدود میں بھی داخل ہو جاتے ہیں ^ے ان کا تعارف یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ لسانی تعامل (language processing)

یہ تحقیق کہ جب ہم سنتے ہیں، بولتے ہیں، لکھتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کیا عمل ہو رہا ہوتا ہے؟ ان کاموں کے مختلف مراحل یا مدارج کیا کیا ہوتے ہیں؟ کسی معلومات کو منظم اور باقاعدہ شکل میں پیش کرنے کے لیے ہمیں قواعدی ساخت کو ذہن میں پہلے کس طرح مرتب کرنا پڑتا ہے؟

۲۔ لسانی ذخیرہ اور اس تک رسائی (language storage and access)

یہ تحقیق کہ ذخیرۂ الفاظ ہمارے ذہن میں کس طرح محفوظ ہوتا ہے اور جب ہمیں کسی خیال کو ادا کرنے کے لیے لفظ کے استعمال کی ضرورت پڑتی ہے تو ہمارا ذہن اس کو کس طرح تلاش کر کے اس تک رسائی حاصل کرتا ہے؟ نیز اس وقت قواعد کے اصول کس طرح کام کرتے ہیں؟

۳۔ نظریۂ تفہیم (comprehension theory)

جو نئی معلومات ہمیں ملتی ہیں ان کی تفہیم کے لیے ہم اپنے ادراک اور ذہن میں پہلے سے موجود معلومات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں؟ جو الفاظ ہم سنتے یا پڑھتے ہیں ان کی تفہیم ایک وسیع تر تناظر میں کس طرح کر لیتے ہیں؟

۴۔ زبان اور دماغ (language and brain)

جب ہم کوئی چیز پڑھتے یا سنتے ہیں تو دماغ میں کون سا اعصابی عمل وقوع پذیر ہوتا ہے؟ ہمارا ذہن لسانی معلومات اور معنویاتی تصورات کو کیسے محفوظ کرتا ہے؟ گفتگو کے وقت کون کون سی اعصابی اور عضلاتی حرکات یا سرگرمیاں عمل میں آتی ہیں؟ کیا انسانی ذہن کا مختلف ہونا ہی

ہماری نوع۔کے زبان ایجاد کرنے کا سبب بنا ہے؟ (مصنف نے وضاحت نہیں کی لیکن غالبًا یہاں مصنف کی مراد دیگر حیوانات کے مقابلے میں انسانی ذہن کا مختلف ہونا ہے کیونکہ صرف انسان ہی حیوانات کی وہ نوع ہے جو باقاعدہ اور پیچیدہ زبان استعمال کرتی ہے)۔

۵۔غیر معمولی حالات میں زبان (language in exceptional cirumstances)

کیا وجہ ہے کہ بعض نومولود بعض لسانی نقائص یا اختلال مثلاً ہکلاہٹ یا عسر خوانی (dyslexia) کے ساتھ بڑے ہوتے ہیں؟ عمر بڑھنے سے یا دماغ کو پہنچنے والے نقصان سے زبان کی صلاحیت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ پیدائشی بہرے پن سے زبان سیکھنے یا اکتسابِ زبان (language acquisition) کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہے؟

۶۔اکتسابِ زبانِ اوّل (first language acqusition)

نومولود اپنی زبانِ اوّل کا اکتساب کیسے کرتا ہے؟ نومولود کے ذہن میں جب علمِ اصوات، ذخیرۂ الفاظ اور نحو کے تصورات کا ارتقا ہوتا ہے تو وہ کن کن مراحل سے گزرتا ہے؟ اس بات کے کیا شواہد ہیں کہ ہم پیدائشی اور جبلی طور پر زبان کی صلاحیت اپنے ذہن میں لے کر آتے ہیں جس سے ہمیں اپنی زبانِ اول کے اکتساب میں مدد ملتی ہے چاہے ہمیں اپنے ماحول سے کسی زبان سیکھنے کے میں مناسب معلومات یا مدد نہ مل رہی ہو؟

یہ تو تھے وہ بنیادی موضوعات جو لسانیاتی نفسیات کی تحقیق کا موضوع ہیں لیکن ان کو یہاں پیش کرنے کی غرض وغایت یہ ہے کہ ان سے اس علم کے دائرۂ کار اور حدود ومباحث کا اندازہ ہو سکے، اگر چہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ خود ایک بڑا موضوع ہے اور ان میں سے ہر ایک پر ظاہر ہے کہ کئی کئی کتابیں اور تحقیقی مقالے (انگریزی میں) لکھے جا چکے ہیں۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو میں ان موضوعات پر مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔

☆ نفسیاتی لسانیات کا آغاز

اگر چہ نفسیات اور لسانیات کے باہمی تعلق پر کچھ نہ کچھ انیسویں صدی میں لکھا جا چکا تھا لیکن نفسیاتی لسانیات یا سائیکولنگ وسٹکس کی اصطلاح سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں معروف امریکی

ماہرِ نفسیات جیکب کینٹر (Jacob Kantor) نے استعمال کی [۸]۔ لیکن یہ اصطلاح ۱۹۴۶ کے بعد معروف اور رائج ہوئی جب کینٹر کے شاگرد نکولس پرونکو (Nicholas Pronko) نے اسے اپنے ایک مقالے میں استعمال کیا [۹]۔ اس طرح یہ بین العلومی (interdisciplinary) اصطلاح رائج ہوگئی جس کو علمی مطالعات کے نظری مباحث کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا یہ اور بات ہے کہ اُس وقت یہ اصطلاح اسی مفہوم میں مستعمل ہورہی تھی جس مفہوم میں یہ انیسویں صدی کے اواخر سے رائج تھی یعنی ''زبان کی نفسیات'' کے مفہوم میں [۱۰]۔ لیکن اس موضوع پر مسلسل تحقیق، طبی سائنس کی ترقی اور علمِ نفسیات میں ہونے والی تبدیلیوں نے اسے سائنس اور طبی سائنس کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

جدید نفسیاتی لسانیات کا وجود اس وقت عمل میں آیا جب ۱۹۵۰ء کے بعد بعض امریکی جامعات میں اس موضوع پر تحقیقی سیمینار منعقد ہونے شروع ہوئے کہ نفسیات اور لسانیات میں کس طرح کا باہمی ارتباط ممکن ہے، اور اس موضوع پر مغربی جامعات کے اساتذہ نے نصابی کتب بھی لکھنی شروع کیں [۱۱]۔ اس کے بعد معروف امریکی دانش ور، استاد اور ماہرِ لسانیات نوم چومسکی نے اس موضوع پر خاصا کام کیا، بلکہ لسانیات اور نفسیاتی لسانیات کے موضوع پر چومسکی کے اثرات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ چومسکی کے نظریات کے بعد لسانیاتی مباحث کا ایک بڑا حصہ چومسکی کے حمایتیوں اور مخالفین کے مباحث و دلائل پر مبنی ہونے لگا تھا اور لسانیات کے بعض مباحث بالخصوص اس کے آفاقی قواعد یا یونی ورسل گرامر (universal grammar) کے نظریے کے بعد لسانیات اور نفسیاتی لسانیات کے بعض مباحث کے لیے ''مابعدِ چومسکی'' یا ''پوسٹ چومسکین'' (post-Chomskyan) کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔ حتیٰ کہ چومسکی کے نظریات کے حامیوں کے لیے بھی ایک اصطلاح بن گئی اور انھیں چومسکی آئیٹ Chomskyite کہا جانے لگا۔ کیا کسی عالم اور محقق کے لیے اس سے بڑا خراجِ تحسین ہوسکتا ہے کہ جس علم کا وہ ماہر ہے اس کے ایک حصے کا نام ہی اس کے نام پر رکھ دیا جائے؟ یہ اور بات ہے کہ اب چومسکی کے نظریاتی مخالفین کی تعداد بھی خاصی بڑھ رہی ہے اور اس کے لسانیاتی اور سیاسی نظریات کے خلاف مقالوں اور

کتابوں کی صورت میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔

اس امر پر روشنی ڈالنے کے لیے کہ چومسکی کا آفاقی قواعد کا نظریہ کیا ہے اور زبان سیکھنے کے ضمن میں اس کے نظریات جو تجربیت (empiricism) کے برعکس عقلیت (rationalism) پر مبنی ہیں، کیا ہیں، نیز وصفیت اور تجربیت کی اصطلاحات سے لسانیات اور لغت نویسی میں کیا مراد ہے، ایک الگ مقالہ درکار ہے۔ البتہ اس پر راقم نے اپنے ایک مقالے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کی تھی [۱۲]۔ بہرحال، یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس کے بنیادی مباحث کے تعارف کے لیے بھی ایک اچھی خاصی کتاب چاہیے۔ افسوس کہ اردو میں نفسیاتی لسانیات کا صرف سرسری سا ذکر ایک آدھ کتاب میں ملتا ہے، مثلاً گیان چند نے اپنی کتاب ''عام لسانیات'' میں اس کا مختصر ذکر کیا ہے [۱۳]۔

ہمارے نوجوان محققین کو چاہیے کہ تحقیقی موضوع کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے کسی شخصیت پر تان توڑنے کی بجائے لسانیات اور اس کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کریں اور اس کا اطلاق اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں پر کرنے کی کوشش کریں۔ اس سے تازہ افکار اور نئی تحقیقی جہات بھی ہماری زبان میں منتقل ہوں گی اور یہ اردو کی ترقی کا ایک سبب بھی ہوگا۔

حواشی:

۱۔ جان فیلڈ(John Field)، Psycholinguistics : A Resource Book for Students، (نیویارک: روٹلج، ۲۰۰۳ء)، ص۲۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ وکٹوریا فرامکن ودیگر (Voctoria Fromkin & others)، An Introduction to Language، (میلبرن: تھامسن، ۲۰۰۵ء)، ص۳۵۷، پانچواں ایڈیشن۔

۴۔ اس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے: جان فیلڈ، محولہ بالا، ص۲۔۵

۵۔ ان موضوعات کی تفصیل مختلف کتب و مآخذ سے لی گئی ہے۔ مثلاً: ڈینی اسٹین برگ ودیگر (Danny D. Steinberg & others) کی کتاب Psycholinguistics: Language, Mind and World (نیویارک: روٹلج، ۲۰۱۳ء) اس ضمن میں مفید ہے۔

۶۔ واضح رہے کہ اب دنیا میں مادری زبان mother tongue کے ساتھ زبانِ اوّل first language کا تصور بھی فروغ پا رہا ہے۔ ڈیوڈ کرسٹل (David Crystal) کے مطابق زبانِ اوّل (first language) وہ زبان ہوتی ہے جو کوئی بچہ سب سے پہلے سیکھتا ہے۔ یہ ایک طرح سے مادری زبان (mother tongue) ہی ہوتی ہے لیکن بعض دولسانی یا کثیر لسانی معاشروں میں مادری زبان کی بجائے جب کسی اور زبان کو بچے کے ماحول میں ترجیح دی جاتی ہے تو وہ زبان (جو مادری زبان کے علاوہ کوئی اور زبان ہوتی ہو سکتی ہے مثلاً قومی زبان یا انگریزی وغیرہ) بچے کی زبانِ اوّل بن جاتی ہے (دیکھیے: The Penguin Dictionary of Language، لندن: پینگ وِن، ۱۹۹۹ء)۔ مثلاً پاکستان میں بہت سے لوگوں کی مادری زبان کچھ اور ہے لیکن ان کی زبانِ اوّل اردو ہے اور وہ اردو ہی میں اظہارِ خیال میں آسانی محسوس کرتے ہیں۔

۷۔ یہ تفصیلات جان فیلڈ کی کتاب (محولہ بالا، ص۳۔۲) سے ماخوذ ہیں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں انسانی ذہن کے لسانی عمل کو سمجھنے کے لیے اسے ایک کمپیوٹر کی طرح تصور کیا جا رہا ہے اور کچھ اصطلاحات بھی یہاں اسی طرح کی استعمال کی گئی ہیں، بہرحال یہ ایک مصنف کے خیالات ہیں جن کی ترجمانی یہاں کی جا رہی ہے۔

۸۔ ولم لیولٹ (Willem Levelt)، A History of Pre-Chomskyan Era Psycholinguistics، (اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء)، ص۱۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ایضاً، پہلا باب۔
۱۲۔ ملاحظہ ہو راقم کی کتاب لغوی مباحث میں شامل مقالہ بعنوان ''لغت نویسی میں کورپس، کورپس لسانیات، وصفیت اور تجربیت کا کردار''، (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء)، بالخصوص ص ۱۹۶۔۱۸۹
۱۳۔ گیان چند، عام لسانیات، (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص ۶۱۸۔۶۱۶

☆......☆......☆

مآخذ:

(الف) اردو کتب:

۱۔ اکبرالہٰ آبادی، انتخابِ کلام: اکبرالہٰ آبادی (مرتبہ رؤف پاریکھ)، کراچی: اوکسفرڈ: ۲۰۰۹ء۔

۲۔ انشا، ابن، اس بستی کے اک کوچے میں، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۷۸ء [طبع سوم]

۳۔ بخاری، سہیل، اردو زبان کا صوتی نظام اور تقابلی مطالعہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء

۴۔ بخاری، سہیل، اردو کی زبان، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۷ء۔

۵۔ بخاری، سہیل، تشریحی لسانیات، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۸ء۔

۶۔ بخاری، سہیل، سکونِ اول کا مسئلہ (اسکول کے الف کی تحقیق) مشمولہ سہ ماہی اردو نامہ، کراچی، شمارہ ۱۴، اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۶۳ء۔

۷۔ بخاری، سہیل، معنویات، سرگودھا: آزاد بک ڈپو، ۱۹۷۶ء۔

۸۔ بگھیو، محمد قاسم، لسانیات تا سماجی لسانیات، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۹ء۔

۹۔ بیگ، مرزا خلیل، لسانی مسائل ومباحث، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ، ۲۰۱۷ء۔

۱۰۔ پاریکھ، رؤف، اولین اردو سلینگ لغت، کراچی: فضلی سنز، ۲۰۰۶ء۔

۱۱۔ پاریکھ، رؤف، پاکستانی زبانیں اور بولیاں، مشمولہ اردو، ششماہی، کراچی، انجمن ترقی اردو، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۸ء، جلد ۹۴، ص ۱۵۶۔۱۲۶

۱۲۔ پاریکھ، رؤف، علمِ لغت، اصولِ لغت اور لغات، کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۷ء

۱۳۔ پاریکھ، رؤف، لسانیاتی مباحث، کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۹ء [اشاعتِ ثانی]

۱۴۔ جالندھری، فتح محمد، مصباح القواعد، حصہ اول، رام پور: ناظم برقی پریس، ۱۹۴۵ء۔

۱۵۔ جاوید، عصمت، نئی اردو قواعد، لاہور: کمبائنڈ پبلشرز، ۱۹۸۸ء

۱۶۔ جونپوری، شیخ ممتاز حسین، خط وخطاطی، کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۱ء۔

۱۷۔ جین، گیان چند، عام لسانیات دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۰۳ء (دوسرا ایڈیشن) [اشاعتِ اول ۱۹۸۵ء]۔

۱۸۔ جین، گیان چند، لسانی مطالعے، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۱ء [تیسرا ایڈیشن]۔

۱۹۔ حقی، شان الحق، لسانی مسائل ولطائف، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء۔
۲۰۔ خان، اقتدار حسین خان، اردو صرف ونحو، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۱۰ء [اشاعتِ سوم]۔
۲۱۔ خان، اقتدار حسین، صوتیات اور فونیمیات، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۴ء
۲۲۔ خان، رشید حسن، اردو املا، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء۔
۲۳۔ خان، عنایت علی، عنایتیں کیا کیا، لاہور: منشورات، سن ندارد۔
۲۴۔ خاں، غلام مصطفیٰ، جامع القواعد، حصہ نحو، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء [اشاعتِ اول]۔
۲۵۔ خان، محبوب علی، اردو کا صوتی نظام، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء۔
۲۶۔ خان، مسعود حسین، مقالاتِ مسعود، دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۹ء۔
۲۷۔ خان، مسعود حسین، اردو لفظ کا صوتیاتی اور تجز صوتیاتی مطالعہ (مترجم مرزا خلیل احمد بیگ)، علی گڑھ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۸۶ء۔
۲۸۔ خان، نصیر احمد خان، اردو ساخت کے بنیادی عناصر، دہلی: اردو محل، ۱۹۹۱ء۔
۲۹۔ خان، نصیر احمد، اردو لسانیات، دہلی: اردو محل، ۱۹۹۰ء۔
۳۰۔ سبزواری، شوکت، اردو لسانیات، کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۶ء۔
۳۱۔ سروری، عبدالقادر، زبان اور علم زبان، حیدرآباد دکن: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۶ء۔
۳۲۔ سلیم، سید محمد، اردو رسم الخط، کراچی: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۱ء۔
۳۳۔ سلیم، وحید الدین، وضع اصطلاحات، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء [پانچویں اشاعت]
۳۴۔ سندھی، غلام حیدر، پاکستان کا لسانی جغرافیہ، اسلام آباد: نیشنل انسٹی ٹیوٹ اوف پاکستان اسٹڈیز، ۲۰۰۵ء۔
۳۵۔ سندھی، میمن عبدالمجید، لسانیاتِ پاکستان، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء۔
۳۶۔ شیرانی، حافظ محمود، پنجاب میں اردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء، طبع دوم [اشاعتِ اول ۱۹۲۸ء]۔
۳۷۔ صدیقی، ابواللیث، ادب اور لسانیات، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء،
۳۸۔ صدیقی، ابواللیث، جامع القواعد، حصہ صَرف، لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۱ء
۳۹۔ صدیقی، خلیل، آواز شناسی، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۳ء
۴۰۔ صدیقی، عبدالستار، مقالاتِ صدیقی، ج ۲، (مرتبہ ساجد صدیق نظامی)، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۵ء

۴۱۔ صدیقی، عتیق (مترجم)، توضیحی لسانیات، دہلی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء۔

۴۲۔ صدیقی، عتیق، گل کرسٹ اور اس کا عہد، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء [دوسرا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن]

۴۳۔ صہبائی، امام بخش، حدائق البلاغت (مرتبہ مزمل حسین)، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء۔

۴۴۔ عبدالحق، مولوی، قواعدِ اردو، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۹ء۔

۴۵۔ عبدالسلام، عمومی لسانیات، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء۔

۴۶۔ عبداللہ، سید، پاکستان میں اردو کا مسئلہ: ایک تاریخی و تحقیقی مطالعہ، لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۶ء۔

۴۷۔ علی، سر رضا، اعمال نامہ، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۲ء [اشاعتِ اول ۱۹۴۳ء]۔

۴۸۔ فاروقی، اطہر، اتر پردیش کے لوک گیت، دہلی: قومی کونسل برائے فروغ قومی زبان، ۱۹۹۸ء [دوسرا ایڈیشن]۔

۴۹۔ قادری زور، غلام محی الدین، ہندوستانی لسانیات، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۰ء

۵۰۔ کیفی، برج موہن دتاتریہ، کیفیہ، لاہور: معین الادب، ۱۹۵۰ء [طبع دوم]

۵۱۔ لودھی، فرخندہ، اردو اور فارسی میں نقلِ حرفی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔

۵۲۔ میمن، عبدالعزیز، مقالاتِ علامہ عبدالعزیز میمن (مرتبہ محمد راشد شیخ) لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۲۰۱۹ء

۵۳۔ نارنگ، گوپی چند، اردو زبان اور لسانیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

۵۴۔ نارنگ، گوپی چند، اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، دہلی: آزاد کتاب گھر، ۱۹۶۴ء۔

۵۵۔ نارنگ، گوپی چند، اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، مشمولہ اردو لسانیات (مرتبہ فضل الحق) (دہلی: شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۸۱ء) [اشاعتِ دوم، بعد نظرِ ثانی]

۵۶۔ نجم الغنی رام پوری، بحر الفصاحت (حصۂ ششم و ہفتم) (مرتبہ سید قدرت نقوی)، لاہور مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۰ء۔

۵۷۔ ہاشمی، حمیداللہ، مختصر زبان و ادب: پنجابی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹ء۔

(ب) انگریزی کتب:

۱۔ ارنوف، مارک و دیگر (Aronoff, Mark, Et al)، What is Morphology?، چچیسٹر: ولی بلیک، ۲۰۱۱ء [دوسرا ایڈیشن]۔

۲۔ اسٹال، جے ایف، (Staal,J.F.)، Sanskrit Philosophy of Language، مشمولہ History of Linguistic Thought and Contemporary Linguistics، مرتبہ Hermann Parret، برلن: والٹر ڈی گرٹر اینڈ کمپنی، ۱۹۷۵ء۔

۳۔ اسٹین برگ، ڈینی و دیگر (Steinberg, Danny D. & others)، Psycholinguistics: Language, Mind and World، نیویارک: روٹلیج، ۲۰۱۳ء۔

۴۔ اسکینڈرا، پال و دیگر (Skandera, Paul Et al)، A Manual of English Phonetics and Phonology، تیبنجن (جرمنی): ورلاگ/ نار، ۲۰۱۱ء [دوسرا ایڈیشن]

۵۔ اکماجین، ایڈرین و دیگر (Akmajian ,Adrain, Et al)، Linguistics: An Introduction to Language and Communication، کیمبرج (میساچوسٹس): ایم آئی ٹی پریس، ۲۰۱۰ء۔

۶۔ انٹرنیشنل فونیٹک ایسوسی ایشن (International Phonetic Association)، A Handbook of International Phonetic Association: a guide to the use of International Phonetic Alphabet، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء۔

۷۔ اوہالا، جان جے (Ohala, John J.)، The Relation Between Phonetics and Phonology، مشمولہ The Handbook of Phonetic Sciences، (مدیران ولیم جے ہارڈ کاسل و دیگر (William J. Hardcastle Et al)، اوکسفرڈ: ولی بلیک ویل، ۲۰۱۳ء [دوسرا ایڈیشن]

۸۔ اوہالا، منجاری (Ohala, Manjari)، Syllable in Hindi مشمولہ The Syllable: Views and Facts مرتبہ Harry Van dar Hulst و دیگر، مطبوعہ برلن، Mouton de Gruyter، ۱۹۹۹ء۔

۹۔ ایڈورڈ، جان (Edward, John)، Sociolinguistics: A Very Short Introduction، نیویارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء

۱۰۔ ایشبی، میکائیل و دیگر (Ashby, Michael Et al)، Introducing Phonetic Science، دہلی: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء۔

۱۱۔ ایلن، کیتھ (Allan, Keith) (مرتب)، The Routledge Handbook of Linguistics، لندن: روٹلیج، ۲۰۱۶ء۔

۱۲۔ اینیان وو، روز جولیٹ (Anyanwu, Rose-Juliet)، Fundamentals of

Phonetics, Phonology and Tonology ،فرینکفرٹ: پیٹرلینگ، ۲۰۰۸ء

۱۳۔ باربر، سی ایل (Barber, C L) ، The Story of Language ، لندن: پین بکس، ۱۹۷۹ء، [طباعتِ نو]

۱۴۔ بال، مارٹن جے ودیگر (Ball, Martin J. Et al) ، Methods in Clinical Phonetics، لندن: ووہر پبلشرز، ۲۰۰۱ء۔

۱۵۔ براون، ایڈورڈ جی (Browne, Edward G.) ، A Literary Hisotry of Persia ، جلد اول، دہلی: گڈورڈ بکس، ۲۰۰۲ء [اشاعتِ نو][اشاعتِ اول ۱۹۰۲ء]

۱۶۔ براون، کیتھ ودیگر (Brown,Keith, Et al) ، Concise Encyclopedia of Languages of the World، (اوکسفرڈ: ایلسویر لمٹیڈ، ۲۰۰۹)، ص ۲۹۲۔۲۹۱

۱۷۔ برنر، بٹی جے (Betty J. Birner) ، Introduction to Pragmatics ، (چچیسٹر: ولی بلیک ویل، ۲۰۱۳ء)

۱۸۔ برگس، الیگزنڈر (Bergs, Alexander) ، Social Networks and Historical Sociolinguistics، برلن: موٹون ڈی گروٹر، ۲۰۰۵ء۔

۱۹۔ بروکس، گریگ (Brooks, Greg) ، Dictionary of the British Spelling System ، کیمبرج: اوپن بک پبلشرز، ۲۰۱۵ء۔

۲۰۔ بریٹ، رولینڈ جے ایل (Breton, Roland J-L) ، Atlas of the Languages and Ethnic Communities of South Asia، دہلی: سیج پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء۔

۲۱۔ بشیر، ایلینا (Bashir, Elena) ، Urdu and Linguistics" A fraughat but evolving relationship مشمولہ Annual of Urdu Studies، شمارہ ۲۶، ص ۱۲۳۔۹۷

۲۲۔ بعلبکی، رمزی، (Baalbaki, Ramzi) ، The Legacy of the *Kitab*، لیڈن: برل، ۲۰۰۸ء۔

۲۳۔ بلاؤنٹ، بین جی (Blount, Ben G.) Anthropological Linguistics مشمولہ Culture and Language Use (مدیر گنٹر سینف ودیگر (Gunter Senft Et al) ، ایمسٹرڈیم: جان بنجمز، ۲۰۰۹ء

۲۴۔ بلوم فیلڈ، لیونارڈ (Bloomfield, Leonard) ، Language ، لندن: جارج ایلن اینڈ اَن وِن، ۱۹۶۷ء [اشاعتِ اول ۱۹۳۳ء]۔

۲۵۔ بلے ونز، جولیٹ (Blevins,Juliette) , Natural and Unnatural Sound

Naturalness and Iconicity in Language مشمولہ Patterns (مرتبہ کلاس ولیمس اور لڈووِک ڈی کیپیئر (Klaas Willems & Ludovic De Cuypere)، ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ کمپنی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۳۔

۲۶۔ بوسٹوک، ڈیوڈ (Bostock,David)، Plato on Understanding Language مشمولہ Companion to Ancient Thought 3: Language (مرتبہ اسٹیفن ایورسن (Stephen Everson))، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء۔

۲۷۔ بونامی، اولیور بونامی (Bonami, Olivier)، (مرتب) The Lexeme in Descriptive and Theoretical Morphology، برلن: لینگوتیج سائنس پریس، ۲۰۱۸ء۔

۲۸۔ بیکر، پیٹر (Bekker, Peter)، Pidgins مشمولہ Pidgins and Creoles: An Introduction (مرتبہ جیک ارینڈز ودیگر Jacques Arends Et al)، ایمسٹرڈیم: جان بنجمن پبلشنگ: ۲۰۰۸ء [دوسرا ایڈیشن]

۲۹۔ بیگ، مرزا خلیل احمد، (Baig, Mirza Khalil Ahmed)، Urdu Grammar: History and Structure، دہلی: باہری پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

۳۰۔ پاریکھ، رؤف، (Parekh, Rauf)، How Many Languages Are Spoken in Pakistan?، مطبوعہ روزنامہ ڈان (Dawn)، ۱۳/ مارچ ۲۰۱۷ء، (March 13, 2017) https://www.dawn.com/news/1320097 (رجوع کردہ ۴/ ستمبر ۲۰۲۰ء)۔

۳۱۔ پاریکھ، رؤف، (Parekh, Rauf) National Language and Pakistani Languages: the Only Way Out، مطبوعہ روزنامہ ڈان (Dawn)، ۲۳/ مئی ۲۰۱۷ء https://www.dawn.com/news/1334755/literary-notes (رجوع کردہ ۴/ ستمبر ۲۰۲۰ء)

۳۲۔ پاریکھ، رؤف (Parekh, Rauf) Proposed Constitutional Amendment Bill and Official Language، مطبوعہ روزنامہ ڈان (Dawn)، ۲۷/ فروری ۲۰۱۷ء، https://www.dawn.com/news/1317152/literary-notes (رجوع کردہ ۴/ ستمبر ۲۰۲۰ء)۔

۳۳۔ پراڈاوسکی، میکال بی (Paradowaski, Michal B)، Comparatve Linguistics and Language Pedagogy مشمولہ Multilingualism and Applied Comparative Linguistics، (مرتبہ فرینک بوئرس ودیگر Frank Boers Et al)، نیوکاسل: کیمبرج اسکالرز پبلشنگ، ۲۰۰۷ء، ص

۳۴۔ پی، ماریو(Pei ,Mario)، The story of Language، نیویارک: نیوامریکن لائبریری، ۱۹۶۶ء

۳۵۔ ٹراسک، آر ایل(Trask, R. L.)، Language and Linguistics: the Key Concepts (مرتبہ پیٹر اسٹاک ویل(Peter Stockwell)، نیو یارک: روٹلیج، ۲۰۰۷ء [دوسرا ایڈیشن]۔

۳۶۔ ٹراسک، آر ایل(Trask, R. L.)، Language: the Basics، لندن: روٹلیج، ۲۰۰۴ء [دوسرا ایڈیشن]۔

۳۷۔ ٹرڈجل، پیٹر(Trudgill, Peter) On Dialect: Social and Geographical Perspectives ۔اوکسفرڈ: باسل بلیک ویل، ۱۹۸۳ء۔

۳۸۔ ٹرچن، پیٹر (Turchin, Peter)، Historical Dynamics: Why States Rise and Fall ،نیوجرسی: پرنسٹن یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء

۳۹۔ ٹریون ،ڈیرل ٹی و دیگر (Tryon, Darrell T. Et al) Pacific Pidgins and Creoles : Origins, Growth and Development، برلن: موٹن ڈی گروٹر، ۲۰۰۴ء

۴۰۔ جوزف، جان ای (John E Joseph)، Saussure، اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء۔

۴۱۔ جیکسن، ہارورڈ و دیگر (Jackson, Howard Et al)، Words, Meanings and Vocabuary, لندن: کنٹینیم، ۲۰۰۴ء

۴۲۔ چنگ، کیرن اسٹیفن (Chung,Karen Steffen) East Asian Linguistic مشمولہ The Oxford Handbook of the Hisotry of Linguistics (مرتبہ کیتھ ایلن (Keith Allan))، اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء۔

۴۳۔ خان، مسعود حسین (Khan, Masood Hussain)، A Phonetic and Phonological Study of the Word in Urdu (علی گڑھ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۵۱ء۔

۴۴۔ ڈینہم، کرسٹن، و دیگر (Kristin Denham Et al)، Linguistics for Everyone: An Introduction، (بوسٹن: واڈ سورتھ، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۹۵۔

۴۵۔ ڈینیل، آیابوڈ اومولارا (Daniel, Iyabode Omolara)، Introductory Phonetics and Phonology of English، نیوکاسل اپ اون ٹائن: کیمبرج اسکالرز پبلشنگ، ۲۰۱۱ء

۴۶۔ رسنٹو، طامس (Ricento, Thomas)، Models and Approaches in Language

Handbook of Language and مشمولہ،Policy and Planning
Marlis (مرتبہ مارلس ہیلنگر ودیگر Communication: Diversity and Change
Hellinger Et al)، برلن: والٹر ڈی گروٹر، ۲۰۰۷ء۔

۴۷۔ رِنج، ڈونلڈ ودیگر (Ringe, Donald, Et al)، From Proto-Indo-European to Proto-Germanic ۔اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء۔

۴۸۔ روبنز، آر۔ایچ (Robins,R.H.)، General Linguistics: An Intorductory Survey، لندن: روٹلیج، ۲۰۱۳ء (چوتھا ایڈیشن)۔

۴۹۔ ریڈفورڈ، اینڈریو ودیگر (Redford ,Andrew, Et al)، Linguistics: An Introduction، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۹ء [دوسرا ایڈیشن]۔

۵۰۔ سایاہی، لوفٹی (Sayahi, Lofti)، Diglossia and Language Contact: Language Variation and Change in North Africa، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء۔

۵۱۔ سوسئیر، فرڈی ننڈ ڈی (Saussure, Ferdinand de)، Course in General Linguistics، (لندن: بلومزبری، ۲۰۱۳ء) (اشاعتِ نو)

۵۲۔ شریبرگ، لارنس ڈی ودیگر (Shriberg, Lawrence D. Et al)، Clinical Phonetics بوسٹن: ایلین اینڈ بیکن، ۲۰۰۳ء۔

۵۳۔ شیوسٹر، اے ڈی (Sheveister, A.D.)، Contemporary Sociolinguistics Theory, Problems, Methods، ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ، ۱۹۸۶ء۔

۵۴۔ عبدالرحمٰن، طارق ((Abdur) Rahman, Tariq)، An Introductoin to Linguistics، لاہور: وین گارڈ، ۱۹۹۷ء۔

۵۵۔ عزیز، کے کے، (Aziz, K. K.) The Making of Paksitan: a Study in Nationalism (لاہور: اسلامک بک سروس، ۱۹۹۴ء) [چوتھا ایڈیشن]۔

۵۶۔ فرام کن، وکٹوریا و دیگر (Fromkin, Victoria, Et al) An Introduction to Language، میلبرن: تھامسن پبلشنگ، ۲۰۰۵ء [پانچواں ایڈیشن]۔

۵۷۔ فشر، اسٹیون روجر (Fischer, Steven Roger) A History of Language، لندن: ری ایکشن بکس، ۱۹۹۹ء۔

۵۸۔ فنچ، جیفری (Finch, Geoffrey)، Linguistic Terms and Concepts، لندن: میکملن، ۲۰۰۰ء، ص ۳۔

۵۹۔ فنیگن، ایڈورڈ، (Finegan, Edward) ، Language: Its Structure and Use ، فورٹ ورتھ: ہارکوٹ بریس، ۱۹۹۹ء[تیسرا ایڈیشن]۔

۶۰۔ فوکس، انتھونی (Fox, Anthony)، Linguistic Reconstruction: An Introduction to Theory and Method، اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء۔

۶۱۔ فیلڈ، جان(Field, John)، Psycholinguistics: A Resource Book for Students، نیویارک: روٹلج، ۲۰۰۳ء۔

۶۲۔ قادری زور، غلام محی الدین(Qadri, G.M.) Hindustani Phonetics، حیدرآباد دکن: مکتبۂ ابراہیمیہ، سن ندارد۔

۶۳۔ کٹمبا، فرانسس (Katamba, Francis)، Morphology: Palgrave Mode Linguistics، لندن: میکملن، ۲۰۱۹ء۔[دوسرا ایڈیشن]۔

۶۴۔ کرسٹل، ڈیوڈ، (Crystal, David)، Linguistics ہرمنڈس ورتھ: پینگوِن، ۱۹۸۲ء۔

۶۵۔ کرسٹل، ڈیوڈ، (Crystal, David)، The Cambridge Encyclopedia of Language ، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء۔

۶۶۔ کرسٹل، ڈیوڈ، (Crystal, David) The Penguin Dictionary of Language ، لندن: پینگوین بکس، ۱۹۹۹ء[دوسرا ایڈیشن]۔

۶۷۔ کیرول، ڈیوڈ ڈبلیو، (Carroll, David W.) ، Psychology of Language، بلیمونٹ: تھامسن، ۲۰۰۸ء [پانچواں ایڈیشن]۔

۶۸۔ کیئرنز، چارلس ای و دیگر (مدیران) (Cairns, Charles E. Et al) (Ed.) (، تعارف، Handbook of the Syllable، لیڈن، برل، ۲۰۱۱ء۔

۶۹۔ کلیٹر، پی ای (Cleator,P.E.)، Lost Languages، نیویارک: مینٹر بکس، ۱۹۶۲ء

۷۰۔ کولنس، جان (John Collins) ، Chomsky: A Guide for the Perplexed، (نیویارک: کنٹینیم، ۲۰۰۸ء)۔

۷۱۔ کیمبل، لائل (Campbell, Lyle)، Historical Lingusitics: An Introduction، کیمبرج (میساچوسٹس): ایم آئی ٹی پریس، ۲۰۰۴ء [دوسرا ایڈیشن]۔

۷۲۔ گٹ، الرائیک (Gut, Ulrike) ، Introduction to English Phonetics and Phonology، فرینکفرٹ: پیٹر لینگ، ۲۰۰۹ء۔

۷۳۔ لا، ویوین، (Law, Vivien)، From The History of Linguistics in Europe:

Plato to 1600، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء۔

۷۴۔ گرفتھ، پیٹرک، (Patrick Griffiths)، Introduction to English Semantics and Pragmatics، ایڈنبرا: ایڈنبرا یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء۔

۷۵۔ لینگکر، رانالڈ ڈبلیو (Langacker, Ronald W.)، Cognitive Grammar مشمولہ Linguistic Theory and Grammatical Description: Nine Current Approaches (مرتبہ فلپ جی ڈروسٹ و دیگر (Philip G. Droste Et al.))، ایمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ، ۱۹۹۱ء۔

۷۶۔ لیولٹ، ولم (Levelt, Willet)، A History of Pre-Chomskyan Era, Psycholinguistics، اوکسفرڈ: اوکسفرڈ یونی ورسٹی، پریس، ۲۰۱۳ء۔

۷۷۔ لیہمن، ونفرڈ پی (Lehman, Winfred P.)، Introduction: Diachronic Linguistics مشمولہ Perspectives on Historical Linguistics (مرتبہ ونفرڈ پی لیہمن)، یمسٹرڈیم: جان بنجمنز پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء۔

۷۸۔ مروگی، امل ای و دیگر (مرتبین) (Marogy, Amal E Et al)، تعارف، The Foundations of Arabic Linguistics II، لیڈن: برل، ۲۰۱۵ء، ص ا۔

۷۹۔ مورسلے، جارج ڈیوڈ (Morley, G. David)، GrammarSyntax in Functional (لندن: کنٹینیم، ۲۰۰۰ء)۔

۸۰۔ میتھیوز، پی۔ایچ (Matthews, P.H.)، Linguistics: A Very Short Introduction، کراچی: اوکسفرڈ، ۲۰۰۵ء [پاکستانی ایڈیشن]۔

۸۴۔ میتھیوز، پی ایچ، (Mattews, P.H.)، Oxford Concise Dictionary of Lingiuistics، نیویارک: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۷ء۔

۸۱۔ میتھیوز، پیٹر (Mathews, Peter)، Greek and Latin Linguistics مشمولہ History of Linguistics Volume II (مرتبہ گیلیوسی لپشی (Giulio C Lipschy)، نیویارک: روٹلج، ۱۹۹۴ء۔

۸۲۔ میک کے، ایان آر اے (Mackay, Ian R.A.)، Phonetics: The Science of Speech Production، آسٹن (ٹیکساس): پرو ایڈ، ۱۹۸۷ء۔

۸۳۔ نوتھ، ونفرڈ (Winfried Nöth)، Handbook of Semiotics، بلومنگٹن: انڈیانا یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء۔

۸۴۔ نارنگ، گوپی چند (Narang, Gopi Chand)، Karkhandari Dialect of Delhi

Urdu، دہلی: ناشر مصنف، ۱۹۶۱ء۔

۸۵۔ نولین، جوآنا (Nolan, Joanna)، The Elusive Case of Lingua Franca: Fact and Fiction، چیم (سوئزرلینڈ): پیل گریو میکملن، ۲۰۲۰ء۔

۸۶۔ واٹ، جوناتھن ایم (.Watt, Jonathan M)، Living Language Environment مشمولہ Biblical and Ancient Greek Linguistics, Volume4، مدیر اسٹینلے ای پورٹر ودیگر (Stanley E. Porter Et al)، (یوجین (اوریگن): وِف اینڈ اسٹاک پبلشرز، ۲۰۱۶ء

۸۷۔ ہاک، ہینس ہنرک (Hock, Hans Henrich) Principles of Historical Linguistics، برلن: موتون دی گروتر، ۱۹۹۱ء [دوسرا ایڈیشن]

۸۸۔ ہرک، جیرارڈ وان ہرک (Herk, Gerard Van)، What Is Sociolinguistics? ، چیسٹر (ویسٹ سسیکس): وِلی بلیک ویل، ۲۰۱۲ء۔

۸۹۔ ہسپلمتھ، مارٹن ہسپلمتھ ودیگر (Haspelmath, Martin, Et al)، Understanding Morphology، لندن: روٹلج، ۲۱۰۳ء۔

۹۰۔ ہوجن، ای (.Hoaigen, E) Dalect, Language, Nation، مشمولہ Sciolinguistics (مرتبہ جے بی پرائڈ J.B. Pride اور جینٹ ہومز Janet Holmes)، ہرمنڈز ورتھ: پینگوِن، ۱۹۸۴ء۔

۹۱۔ ہوم، جان (Holm, John)، An Introduction to Pidgins and Creoles، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء۔

۹۲۔ ہومز، جینٹ (Holmes, Janet)، An Introduction to Sociolinguistics، ہارلو: پیئرسن ایجوکیشن، ۲۰۰۱ء [دوسرا ایڈیشن]۔

۹۳۔ ہونگسوالڈ، ہنری ایم ہونگسوالڈ (.Hoenigswald, Henry M)، Language History and Creole Studies، مشمولہ Pidginization and Creolization of Languages (مرتبہ ڈیل ہائمز (Dell Hymes)، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۷۷ء۔

۹۴۔ یول، جارج (Yule, George)، The Study of Language، کیمبرج: کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۱ء، [دوسرا ایڈیشن]۔

(ج) حوالہ جاتی کتب:

ا۔ اردو

۱۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد اول، کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۷ء۔
۲۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد دوم، کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء۔
۳۔ دائرۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور، پنجاب یونی ورسٹی۔
۴۔ علمی اردو لغت (مرتبہ وارث سرہندی)، لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۵ء۔
۵۔ فرہنگ اصطلاحات لسانیات دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۷ء۔
۶۔ فرہنگِ تلفظ (مرتبہ شان الحق حقی)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء [اشاعتِ اول]۔

۲۔ انگریزی

۱۔ اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت، کراچی: اوکسفرڈ، ۲۰۱۳ء۔
۲۔ The Oxford English-Urdu Dictioanry، (مرتبہ شان الحق حقی)، کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء [اشاعتِ ثانی]۔
۳۔ کنسائز اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری Concise Oxford Englsh Dictioanry، اوکسفرڈ، ۲۰۰۶ء، [گیارھواں ایڈیشن]۔
۴۔ فرہنگِ اصطلاحات: لسانیات (انگریزی اردو)، دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۷ء۔
۵۔ کشاف اصطلاحات لسانیات، (مرتبہ الٰہی بخش اختر اعوان)، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء۔
۶۔ Webster's Unabrdiged Dictionary، نیویارک: کولنز ورلڈ، ۱۹۷۶ء [دوسرا ایڈیشن]۔

☆......☆......☆

(تخلیق، تحقیق، تنقید، تدوین، ترجمہ)

70 Years of Pakistani Urdu Literature

لغات اور فرہنگیں

لغات: تحقیق و تنقید (مرتب)

انتخابِ کلام: میرزا محمود سرحدی (ترتیب و تعارف)

انتخابِ کلام: عنایت علی خان (ترتیب و تعارف)

مطالعۂ غالب کی جہتیں (شریک مرتب)

تلمیحات (تدوین، حواشی، تعارف)

مطالعۂ اقبال کی جہتیں (شریک مرتب)

کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (تدوین و تحشیہ)

انتخابِ کلام: سید محمد جعفری (ترتیب و تعارف)

ہیرے والا شتر مرغ

انتخابِ کلام: راجا مہدی علی خان (ترتیب و تعارف)

انتخابِ کلام: صوفی تبسم (ترتیب و تعارف)

علم لغت، اصول لغت اور لغات

لسانیاتی مباحث

لغوی مباحث

اردو کی پانچویں کتاب (شریک مصنف)

لغت نویسی اور لغات: روایت اور تجزیہ (مرتب)

انتخابِ کلام: ظفر علی خاں (ترتیب و تعارف)

اردو لغات: اصول اور تنقید (مرتب)

انتخابِ کلام: مجید لاہوری (ترتیب و تعارف)

اردو میں لسانی تحقیق و تدوین: گزشتہ چند عشروں میں

Oxford Urdu-English Dictionary (مدیر اعلیٰ)

اردو میں تحقیق و تدوین (مرتب)

انتخابِ کلام: اسمٰعیل میرٹھی (ترتیب و تعارف)

سعادت حسن منٹو (شریک مولف)

Iqbal by Atiya (مقدمہ، ترتیب و حواشی)

انتخابِ کلام: حالی (ترتیب و تعارف)

امیر اللغات جلد سوم (تدوین و تحشیہ)

اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (مرتب)

معیاری اردو قاعدہ (شریک مولف)

چمنِ اردو (شریک مولف) (۸ نصابی کتب)

Oxford Mini English-Urdu Dictionary

انتخابِ کلام: اکبر الٰہ آبادی (ترتیب و تعارف)

اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۲۱ (مدیر اعلیٰ)

اولین اردو سلینگ لغت

اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۲۰ (مدیر اعلیٰ)

عصری ادب اور سماجی رجحانات

اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۹ (مدیر اعلیٰ)

سرخاب کے پر (تراجم)

اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر

نازک صاحب کا بکرا

ہوائیاں

پٹاخوں کا ہنگامہ

خفیہ پیغام